07 سرگزشت
عاشقِ رسول
ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر ایک نادرِ روزگار کا تعارف

08 گفت و شنید
شہرِ خیال
مدیر/قارئین
آپ کی باتیں، آپ کے خیال، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

12 شخصیت
نظریہ ساز
عالیہ لودھی
طب کی دنیا میں انقلاب لانے والے کی داستان

26 خودبیتی
دریچہ ماضی
پروفیسر فیاض احمد شیخ
مستقبل سنوارنے کا پیغام دیتی سوانح حیات

41 سفر کہانی
رحمٰن کا مہمان
محمود شام
ایسے سفرنامے کم ہی لکھے گئے ہیں

55 جرم و سزا
پُراسرار کھوپڑی
سید احتشام
کھنڈر سے برآمد کھوپڑی میں ایک راز پوشیدہ تھا

69 عزم و حوصلہ
سفرِ مرگ
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
بوٹ میں سوار افراد کے تعاقب میں موت تھی

79 ایمان افروز
ولی ہند
ڈاکٹر ساجد امجد
برصغیر کے ولی کامل کی داستانِ حیات

94 اردو ادب
تین شاعر
انوار احمد
اسے سرقہ یا خیال کا ٹکرا جانا کہیں گے؟

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوقِ طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

معاشرت 97
جان بچا
زین مہدی
اس کی زندگی خطرات میں گھر گئی تھی

پہلی سچ بیانی 112
تاریک گناہ
کوثر خان
گھر کو آگ لگا دینے والی کا قصہ

دوسری سچ بیانی 129
گھائل
عمران قریشی
دل دکھ سے بھر دینے والی سچ بیانی

تیسری سچ بیانی 139
بہکاوا
عاطر شاہین
چھوٹی سی غلطی عمر بھر کا پچھتاوا بن جاتی ہے

چوتھی سچ بیانی 147
سراب
رابعہ ٹوانہ
انگلینڈ سے لڑکی جب پاکستان پہنچی تو پچھتا اٹھی

پانچویں سچ بیانی 160
دلدل
سیدہ شاہدہ شاہ
کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں

چھٹی سچ بیانی 171
عاقبت نااندیش
نادیہ عنبر لودھی
ماں کی غلط تربیت کا پھل

ساتویں سچ بیانی 178
عدالت
سنبل
بھرپور سبق کی حامل سچ بیانی

آٹھویں سچ بیانی 184
ایک شام
ارشاد العصر جعفری
جین زی اور جین ایکس کے درمیان کی دوری

urdunovels.com

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جلد 35 ✧ شمارہ 12 ✧ مئی 2026ء

ماہنامہ
سرگزشت
کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیر : پرویز بلگرامی

نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

◆◆◆

مارکیٹنگ و سرکولیشن منیجر
مرزا اشعر عباس
0301-2454188

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 250 روپے ✧ زر سالانہ 3500 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS

CPNE

قارئین کرام!

السلام علیکم!

انڈونیشیا، ملائیشیا، سری لنکا، بنگلہ دیش جیسے اور بھی کئی ممالک میں خواتین غربت کے خاتمے پر اپنا بھرپور کردار ادا کر رہی ہیں۔ قومی آمدنی کے اضافہ کی خواہاں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتیں خواتین کی افرادی قوت سے چل رہی ہیں اور ہمارے ہاں یہ قوت 52 فیصد کے قریب ہے لیکن صم بکم۔ جبکہ انکم سپورٹ جیسے کئی پروگرام کے ذریعہ غربت کو کم کرنے کی سعی جاری ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسی امداد قومی آمدنی بڑھانے میں کوئی کردار ادا کر سکتی ہے؟ معاشیات کا کہنا ہے کہ کام کی اجرت قومی آمدنی میں شمار ہو سکتی ہے، امداد نہیں۔ ارباب اختیار سے بس اتنی سی گزارش ہے کہ ان 52 فیصد افرادی قوت کے لیے بھی مواقع پیدا کریں۔ گھریلو صنعت کی جانب بھی توجہ دیں کہ یہ قوت کام میں آ سکے۔

عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم

جتنے بھی مسلمان سلاطین برصغیر پر حملہ آور ہوئے ان کی فوج میں آفریدی قبائل شامل ہوتے۔ اس دور میں بہادری کا معیار آفریدی تھے۔ خطرناک جنگجو کہلاتے تھے۔ یہ قبیلہ شہنشاہ اورنگ زیب کی فوج کا بھی حصہ تھا۔ اس قبیلے کے خطرناک ترین جنگجو دستے میں سجاد حسین کے دادا بھی شامل تھے کچھ عرصہ وہ دہلی و آگرہ میں رہے لیکن ان کے صاحبزادے نے دہلی سے کوچ کیا اور ریاست رام پور چلے آئے۔ یہ ریاست خالص پٹھانوں کی تھی ہر عہدیدار اکھڑ مزاج جبکہ صاحبزادے نرم مزاج اس لیے انہیں سپاہیانہ زندگی پسند نہ تھی۔ انہوں نے منشی کو ترجیح دی تھی۔ یہ پیشہ عزت و تکریم کا حامل تھا لیکن رام پور میں انہیں وہ پذیرائی مل نہیں پا رہی تھی۔ کئی معنوں میں پسند نہیں آیا اور وہ سلطنت اودھ کی جانب کوچ کر گئے۔ لکھنؤ پہنچے تو یہاں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہ شہر علم و ادب کا گہوارہ تھا اس لیے سجاد حسین نے یہاں قیام کو ترجیح دی تھی۔ ابھی سجاد حسین کے گھر 1904ء میں (کچھ تذکرہ نگاروں نے 1905ء اور کچھ نے 1900 بھی لکھا ہے) ایک بچے نے جنم لیا۔ سجاد حسین نے بچے کا نام سردار حسین تجویز کیا (کچھ کتابوں میں سردار احمد مذکور ہے) سردار حسین نے ہوش سنبھالا تو اسے پڑھنے بٹھا دیا گیا۔ گھرانا علمی تھا پھر لکھنؤ کی سرزمین جو علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ سردار حسین بھی علم حاصل کرنے میں بہت زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ مدرسے کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اسے ہائی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اسکول کا ماحول بھی پوری طرح ادبی تھا، شعر و شاعری ہر ایک کے شوق میں داخل۔ اس نے بھی اس کم عمری میں شعر کہنا شروع کر دیا۔ پہلی مکمل غزل سات سال کی عمر میں کہی۔ اس وقت سردار حسین تیسری جماعت میں تھے۔ کچھ اور وقت گزرا تو اشعار میں مزید پختگی آ گئی۔ ایک انٹرویو میں وہ بتاتے ہیں۔ "اس وقت لکھنؤ کا ماحول کچھ ایسا تھا کہ شہر کے اسی فیصد مکین شعر کہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ نام کی بجائے تخلص سے پہچانے جاتے۔ میرا ابھی ایک تخلص ہوا اس گھر میں تھا۔ ان دنوں طلسم ہوش ربا زیر مطالعہ تھا۔ اس کہانی میں ایک جادوگر کا نام بہزاد تھا میرے دل میں خیال آیا کہ میں بھی تو الفاظ کی جادوگری کرتا ہوں۔ اسی تخلص کے ساتھ غزل مکمل کی اور محلے کے ہی ایک مشاعرے میں جا پہنچا۔ شعرا کے درمیان جا بیٹھا۔ ایک چھوٹے بچے کو بیٹھا دیکھ اردگرد بیٹھے لوگوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ ایک کے بعد ایک شاعر کلام سنانے لگے۔ شمع جب میرے سامنے آئی تو میں نے غزل کا مطلع سنایا۔ آواز کانپ رہی تھی مگر خوش گلو تھا۔ اس لیے بھی لوگ دلچسپی لے رہے تھے اور ہر شعر کو کئی کئی بار سنانے کی فرمائش کر رہے تھے۔ کل ملا کر اس غزل نے اچھا تاثر چھوڑا۔ لوگوں نے استاد کا نام پوچھا تو میں نے صاف کہہ دیا کہ "ابھی کسی استاد شاعر کو اشعار دکھانا شروع نہیں کیا ہے۔" اتفاق کی بات ہے اس دور کے ایک بہت بڑے شاعر ذاکر لکھنوی کے ایک شاگرد مشاعرے میں موجود تھے۔ وہ انہیں استاد کے پاس لے گئے۔ انہوں نے دو چار شعر سنتے ہی شاگردی میں لے لیا۔ وقت گزرتا رہا۔ میٹرک کیا تو کلکتہ جانے کی سوجھی کیونکہ وہ ایک بہت بڑا شہر تھا۔ کلکتہ سے انٹر کرنے کے بعد انہوں نے ریلوے میں ملازمت کر لی۔ ٹی ٹی ای کی نوکری ملی تھی۔ نوکری چل رہی تھی کہ ایک بار دوران سفر اختلاج قلب کا دورہ پڑ گیا۔ انہیں ایک بڑے اسپتال پہنچایا گیا۔ ہارٹ اسٹروک کے بعد انہوں نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور لکھنؤ لوٹ آئے۔ کچھ دن آرام کیا پھر 1932ء میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کر لی۔ ریڈیو کے لیے نعت، غزلیں اور ڈرامے لکھتے۔ یہ نوکری دس سال چلی پھر انہوں نے خود ہی ریڈیو کی نوکری سے معذرت کی اور لاہور چلے آئے۔ لاہور منتقل ہونے کی وجہ یہاں کی فلم نگری تھی۔ انہوں نے پنچولی اسٹوڈیو سے خود کو منسلک کر لیا تھا۔ لیکن زیادہ عرصہ وہ اس ماحول سے جڑے نہ رہ سکے اور واپس لکھنؤ چلے گئے۔ برصغیر کا شہر انہیں کئی انگ دکھلا چکا تھا۔ قیام پاکستان کے اعلان کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ دنیا کے نقشے پر پاکستان کا نام ابھرنے والا تھا۔ کچھ دنوں تک بمبئی میں وقت گزارا اور پھر کراچی آ گئے۔ یہاں آتے ہی ان پر ریڈیو پاکستان کے دروازے وا ہو گئے۔ ریڈیو پر نعت نشر ہوتی تو ایک خلقت جمع ہو جاتی۔ نعت گوئی میں انہیں ایک مقام مل گیا تھا۔ روحانی تعلق خانقاہ نیازیہ (بریلی) سے تھا۔ مجموعہ کلام میں مشہور مجموعے "آہ نا تمام، ثنائے حبیب، کفر و ایمان، نغمہ طور، کیف دوام، موج طور، چراغ طور، درمان غم، ذکر حضور، نغمہ روح، کرم بالائے کرم، بستان بہزاد، نغمات بہزاد۔ اس کے علاوہ ناول بھی لکھے۔ "بہرام کی واپسی، حسین قاتل، پیدائشی جاسوس، بیٹے کا قاتل خاصہ مشہور ہوا۔ فلمی گیت بھی لکھے۔ جن میں یہ فلمیں زیادہ مشہور ہوئیں۔ "پیار کی باتیں، ادا، میلہ، پاگل، وفا، لاڈلی، نسبت، آگ، انوکھا پیار، اندھوں کی دنیا، جدائی، برتن، دھواں، پونجی، زمیندار، روٹی، تاج محل۔ اتنے ڈھیر سارے مجموعوں کے خالق 1974ء میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ انہیں سخی حسن قبرستان کے باہر ان کی خانقاہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ اس عاشق رسول کریم کو ہم بہزاد لکھنوی کے نام سے پہچانتے ہیں۔

☆☆☆

گفت و شنید

شہرِ خیال

محفلِ قارئین

☆ اعجاز حسین سٹھار، نور پور تھل سے لکھتے ہیں ”انتظار، محبوب کی راہ دیکھنے سے بھی زیادہ اذیت ناک ہے لیکن جب آپ کاغذ کی عدم دستیابی کی مجبوری بتاتے ہیں تو چپ ہو جانا پڑتا ہے۔ خالد کبیر نے مختصراً سالانہ ریکارڈ بھیجا ہے، جس کے لیے شکریہ قبول کیجیے۔ سرگزشت کے ساتھ خطوط کے صفحات کم ہونے پر تشویش ہے، قیمت بڑھا کر کمی پوری کرلیں۔ ساتھ دعا بھی کر رہا ہوں کہ حالات جلد بہتر ہو جائیں۔ ”باضمیر“ میں جونی ڈیل با اصول سپاہی تھا جس نے بے اصولی، بددیانتی اور غلط کام کرنے پر اپنی محبوبہ کو قتل کر دیا گویا اس نے اپنے فرائض، وطن کی حرمت اور وفاداری کے حلف پر محبت کو قربان کر دیا۔ ”دریچہ ماضی“ میں مستقل مزاجی، محنت کی عادت اور حالات سے مصالحت نے ہر مقام پر کامیابی دی، ہر منزل کا سفر آسان بنا دیا، مقابلہ بازی کا جذبہ پیدا کیا جس سے خوابوں کا حصول ممکن بن گیا۔ چنیوٹ، سرگودھا زرعی اضلاع ہیں، ہر طرف سبزہ، باغات، مختلف اجناس کی فصلوں کی خوشبو روح کو معطر کر دیتی ہے، زمیندار ذہن ہونے کی وجہ سے لوگ خوش اخلاق، مہمان نواز، ملنسار اور کھلے ذہن کے مالک ہیں۔ ملنے، گپ شپ لگانے اور محفل لگانے کا لطف آتا ہے پھر جب خونی رشتہ ہو تو مہمان کے آگے آنکھیں بچھانے میں کیا تکلف ہوگا۔ پروفیسر صاحب کو دلی ہمدردی رکھنے والے دشت والے ہیں تو مبارکباد قبول کریں۔ آگے بڑھتے ہوئے دیگر حاصل کی گئی کامیابیوں کا ذکر پڑھنے کو دل مچل رہا ہے، امید ہے ساتھ چلیں گے تو جس آئے گی۔ ”بیکی“ حیران کر دینے والا کردار ہے۔ وہ جیتے، جاگتے، ہوش مند انسانوں نے اس وجود کو چھوا، محسوس کیا لیکن حقیقت میں غائب پایا۔ ”فتنہ“ میں مسز ڈکسن کمال کی چالباز، عیار اور اداکار بد صفات تھی کہ طویل عرصہ اپنی سرگرمیوں کو چھپانے میں کامیاب رہی۔ ایلیٹ برٹ بھی کائیاں شخص تھا، بھی دوری سے صحیح نشانہ لگایا، ایسے اندازے قائم کیے جو در اصل حقیقت تھے بلکہ مسز ڈکسن کی بدقسمتی کا بھی بڑا دخل رہا جب برا وقت آیا تو ہر دروازہ بند ملا۔ کہانی دلچسپ، پرتجسس ہے اور روانی عروج پر ہے۔ ”باکمال اداکارہ“ میں جتنی صلاحیتیں گنوائی گئی ہیں وہ نتیجتاً ضائع ہو گئیں۔ کئی دولت، شہرت کمائی، پلاٹ، کوٹھیاں بنائیں، بے شمار ملکوں، شہروں کی سیاحت کی، قیمتی لباس، جوتے اور پرس، شاپنگ کی اور فرنیچر خریدا، استعمال کیا بھلا جب ذہنی سکون نہیں، گھر کا آرام، شوہر، آنگن میں اچھلتے، پھدکتے، شرارتیں کرتے بچوں کی چہل پہل نہیں تو جگمگی میں زندگی گزارنے والے غریب خردو کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ”فوٹوگرافر“ میں معصوم لڑکیوں کی کمزوریوں سے کھیلتا جاتا تھا ان کے مزاج، نفسیاتی اور طبیعت کے رجحان کو دیکھ کر قابل کر لیتا تھا۔ لڑکیوں کو ماڈلنگ کا دانہ ڈالنا بھی غلطی تھی، گرفت میں آنے کا بہانہ بنتا تھا، یوں پھنسی، ڈھونڈنے کا خون رنگ لے آیا اور ایسا پھنسا کہ واویلا نہ کر سکا لیکن لڑکیاں اپنی فطری کمزوری، شہرت، دولت کے حصول کے لیے کسی نئے جال، شکنجے میں زندگی گنوانے کو تیار نظر آتی ہیں یہ واقعات سبق آموز ہیں۔ ”شعبدہ“ میں سارے واقعات عجیب، انوکھے اور چکرا دینے والے ہیں۔ شعبدہ بازی بالکل حقیقت بن گئی تھی کہ بکس میں عارضی غائب ہونے والا ایسے غائب ہوا کہ کوئی کھرا کھوج ہاتھ نہ آیا اور جب دریافت کرلیا تو عجیب طریقے سے موت سے ہمکنار ہو گیا۔ یہ سب ایسا منظر نامہ ہے جسے دیکھنے، پرکھنے اور حقیقت تک پہنچنے کے لیے طویل وقت چاہیے۔ ”کوڈ 21“ میں مرے فیملی کے افراد پیشہ ور لڑاکے، روایتی بدمعاش اور شرباز قسم کے لوگ تھے اور انکی ساری شہ بازی اتنی مہنگی پڑی کہ سب کی آزادی داؤ پر لگ گئی۔ جس کے وہ حق دار بھی تھے۔ وہ سی آئی ڈی کے اہلکاروں سے یوں گتھم گتھا ہوئے، آمنے سامنے لڑنے کا سین بنایا جیسا لاہور کے اسٹوڈیو میں مار دھاڑ والی پنجابی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہو۔ ہمد اپنے فرض پر قربان ہو گیا۔ لیکن جج نے جیسی سخت سزائیں سنائی ہیں، انصاف کے تقاضے پورے ہو گئے۔ اب گواہیوں کا جائزہ لے کر لوگوں کے دکھوں، آہوں، محرومیوں اور وجود پر کئی زیادتیوں کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ”ذوالنون“ کی نادیہ زندگی میں ہی اپنی بوئی کھیتی کی فصل سمیٹنے کی حق دار ٹھہری اس کے اعمال کی رسی دراز ہونے کی بجائے کھینچ لی گئی۔ ساس نے اپنی عام شکل کو فیاض بنا کر دوسروں پر ہٹ دھرمی کی، الزامات لگائے، جھوٹی قسم اٹھائی، شوہر کے کان بھر کر بدظن کیا۔ اور ماں جیسی ساس کو موت سے ہمکنار کرنے میں معاون بنی، یہ سب ظلم، زیادتیاں اور حق تلفی اسے جیتے جی عذاب میں ڈال گئے۔ نمونۂ عبرت بن گئی۔ ”تمام شہر نے“ میں قریبی لوگوں کی حقیقت جاننے، دیکھنے کے باوجود بے حسی نئی بات نہیں ہے، خود غرضی کی آندھی چل رہی ہے، انصاف کرنے والے، اصول پسند، دیانت دار اور ایمانداری سے فرض نبھانے والے گرد آلود ہواؤں کی زد پر ہیں۔ دیکھنے والوں کی بری عادت ہے کہ وہ مٹی میں اٹی شکل لمبی مدت تک یاد رکھتے ہیں۔ اجلا پن جلد ذہن

سے باز آجاتا ہے۔ پروفیسر یونس اس لحاظ سے بدقسمت رہے کہ ان کے اچھے کردار، کھرے پن اور اصول پسندی کو کسی نے نہ سراہا۔ بُرے وقت میں کوئی مدد کو نہ آیا حتیٰ کہ زندگی بھر ساتھ نبھانے کے وعدے کرنے والی بیوی بھی بدظن ہوگئی۔ شکر ہے انہوں نے اپنے اجلے پن کو خود پہچان لیا۔ "گھمنڈ" کی صاحبہ کو خود حق کی خاطر سزا ملی کہ زندگی بھر اذیت دیتی رہے گی ویسے عثمان کی یہ حرکت اتنا ظلم ہے جس کا ازالہ کسی صورت ممکن نہیں یہ بات بھی سچ ہے کہ صاحبہ کا گھمنڈ اور غرور کسی ساتھ کو ختم رہنے اس کا رویہ باغیانہ تھا۔ عثمان کو پسند کرتی تھی اور اس بار کی خوبصورتی، وجاہت اور شخصیت سے متاثر تھی ایسے میں غیر کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ صاحبہ کو سبق مل گیا ہے لیکن عثمان کے اقدام کو سراہنا ناانصافی، ظلم، جبر، بدمزاجی اور ناحق کا ساتھ دینے کے مترادف ہے۔ "خصلت" میں فاروق کو بدنیتی کی حد سے زیادہ سزا ملی، کئی کاروباری رقیب ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے معاملے میں اخلاقی تقاضوں کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ ادھر فاروق سوچوں کی حد تک عدنان سے جلتا رہا، مہوش نے بھی اس کی محبت کا دم نہ بھرا تھا۔ پھر اس کے متعلق بدگمان ہونا بنتا ہی نہیں ہے۔ شاید اس کی قسمت ہی خراب تھی کہ والد کا کاروبار نقصان میں چلا گیا وہ خود بھی سنبھلنے کی بجائے خالی ہاتھ ہوگیا۔ عدنان نیک نیت اپنے کام سے کام رکھنے والا اور قسمت پر یقین رکھنے والا سادہ مزاج تھا۔ بس قدرت کو اس کی یہ ادا، ارادوں کی پختگی اور کردار میں پاکیزگی کا وصف پسند آگیا، یوں مہوش کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر غربت کی لکیروں کو امارت میں بدل دیا گیا۔ گویا مثبت سوچ، نیک عمل اور پاکیزہ سوچوں کا صلہ مل گیا۔ "خدا کی لاٹھی" میں زیادہ قصور وار ولاور ہے وہ ڈٹ جاتا تو گھر والے کیا کر سکتے تھے لیکن وہ کمزور اعصاب کا مالک اور قوت فیصلہ سے محروم تھا۔ زرینہ بی بی جس محرومی کا شکار ہے ایسے واقعات دیہی علاقوں میں بڑے گھروں کی کئی عورتوں کے ساتھ ہوتے ہیں جس کے میرے کان اور آنکھ گواہ ہیں۔ ولاور میاں غیرت مند ہے لیکن بہن کی شادی نہ کر سکے۔ اس نے جوانی آہیں بھرتے چار دیواری کے اندر ختم کر دی، جیسی اذیت دل نے برداشت کی ہے اس کا زندہ رہنا معجزہ ہے۔ "پس پردہ" میں سارا روش اللہ ڈوایا کو نہ ورلی یہاں کچھ کوتاہی ہماری بھی ہوتی ہے۔ یہ فراڈ، نوسربازی، دھوکا دہی اور گھر میں چوری کے واقعات نئے نہیں ہیں، کئی دہائیوں سے گھر کے بھیدی لنکا ڈھا رہے ہیں۔ جب اللہ ڈوایا دو سال کی مدت تک رہا تو اس وقفہ میں اس کا بائیوڈیٹا معلوم کرالیا جاتا پھر شاہد صاحب عملی زندگی میں آرمی کے بڑے عہدہ پر رہے۔ کتنے لوگوں سے ملے، کئی تجربات ہوئے، وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہو، جہاندیدہ انسان ہیں۔ اللہ ڈوایا غریب گھر کا تر سا، سہا جوان تھا۔ اتنی رقم سامنے دیکھ کر پارسا کا دل بھی ڈانواں ڈول ہو جاتا ہے۔ اسے اتنی کھلی چھٹی نہیں دینی چاہیے تھی۔ وہ پیشہ ور ادا تھا یا مناسب موقع دیکھ کر مال لے کر چپت ہو گیا یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ بس خود کو سنبھال کر چلیے، گندگی سے بچنے میں ہی فائدہ ہے۔ دوسروں کو امتحان میں ڈالنے کی بجائے احتیاط ضروری ہے۔ بہرحال، بہن شاہدہ شاہ قابل اعتبار کردار کا خطرناک پہلو سامنے لائی ہیں جس کے لیے ان کے شکرگزار ہیں۔"

☆ رفعت مقصود، سیالکوٹ کینٹ سے لکھتی ہیں۔ "سرگزشت اپریل کے سرورق پر لڑکی سونے کی جھمکی، بالیاں اور کشمیری چوڑیاں پہن کر چہرہ ڈھانپتے ہوئے عید مبارک کہہ رہی تھی۔ شاید اس نے یہ پڑھا ہوگا کہ انس کر کے عید مبارک۔ مہنگائی بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ ڈائجسٹ کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔ ڈائجسٹ گھر بھی لے سکتے ہیں، مسئلہ زیادہ ڈاک خرچ اور اگر خود لیں تو پیٹرول بہت لگتا۔ سبزی، پھلوں اور چیزوں کے اسٹور زیادہ دور نہیں لیکن کتابوں کی دکانیں بہت دور ہیں۔ بہت سے لوگ اخبار والوں سے ڈائجسٹ بھی لے لیتے ہیں۔ مسئلہ یہ بھی ہے کہ سرگزشت ڈائجسٹ ہر بک شاپ سے نہیں ملتا، کسی کسی سے ملتا ہے۔ اس بار سرگزشت میں شکاریات کی کہانی نہیں ہے۔ سرگزشت کے صفحات کم ہوئے، قیمت بھی بڑھا دی۔ مہنگائی کی وجہ سے مجبوری ہوگی۔ اب کیا شکاریات کی کہانی ہر ماہ نہیں آئے گی؟ (صفحات کی کمی کے سبب تمام سلسلے لگتے رہیں گے لیکن کبھی کبھی کوئی سلسلہ روکا بھی جائے گا) سرگزشت بہت دیر سے ملتا ہے، سلسلے کم وقت میں سارا ڈائجسٹ نہیں پڑھا جاتا اس لیے تبصرہ مختصر کرتی ہوں۔ اداریہ اچھا تھا۔ اب عبادتیں نمائش بن گئی ہیں۔ ایکسرے میں کک سرگزشت اچھی ہے۔ شہر خیال میں اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ خالد کبیر کا جائزہ اچھا لگا۔ اعجاز حسین سٹھار پابندی سے کہ دوسرے اعجاز حسین، کبھی کبھی تبصرہ لکھتے ہیں۔ سٹھار صاحب ماشاء اللہ بھرپور تبصرہ لکھتے ہیں اس لیے سب ان کی ہی تعریف کرتے ہیں۔ اس بار سب کے تبصرے اچھے تھے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی دل ہند کی قسط کا اختتام تو دلچسپ اور حیران کن جملے پر ہوا ہے۔ اب اگلی قسط کا انتظار ہے۔ سید احتشام کی کہانی ہاکسیر میں جوتی نے اپنی محبوبہ کو بے اتفاقی اور غلط کام کی وجہ سے قتل کر دیا۔ جاوید بسام کی کہانی بسی پُراسرار تھی، ایسی کہانیاں مجھے پسند ہیں۔ نجمہ صوفی کی کہانی فتنہ میں مسز ڈکسن کتنے سکون سے جاسوسی کر کے فتنہ پھیلا رہی تھی۔ علی سفیان آفاقی کی باکمال اداکاروں کی آخری قسط نے رنجیدہ کر دیا۔ فلم انڈسٹری بہت اچھے اداکاروں کو نظر انداز کرنے لگ جاتی ہے۔ سید احتشام کی کہانی کراچی 21 میں مفرور سے قاتل کو مروا دینا اچھا فیصلہ تھا۔ زین مہدی کی جان بچا کی یہ قسط بھی اچھی تھی۔ فرح انیس کی کہانی ڈائن میں نادیہ واقعی ڈائن تھی اس نے حسد اور مقابلے بازی میں سسرال والوں کو برباد کر کے خود بھی برباد ہو گئی۔ شکر ہے کہ تمہیں اور شوہر کی بچی اس سے بچ گئی۔ شاہین کمال کی کہانی تمام شہر نے آج کل کے استادوں کے مسلوں پر تھی۔ ہر استاد برا نہیں ہوتا، کچھ طالبات اپنے نمبر بڑھانے کے لیے استاد کو بلیک میل کر کے بدنام کر دیتی ہیں۔ سیکس اب اپنی عزت بحال کرنے کے لیے اچھی کوششیں کرے گا۔ کنیز زہرا کی کہانی گھمنڈ میں عثمان نے اپنی گھمنڈی بیوی کو تیزاب پھینک کر اچھا نہیں کیا اسے کسی دوسرے طریقے سے سمجھاتا۔ فاروق احمد کی کہانی خصلت نے رنجیدہ کر دیا۔ وہ لڑکا مغرور تھا دوست کی تحقیر کرتا تھا لیکن اسے سزا زیادہ ہی مل گئی۔ خدا کی لاٹھی میں زرینہ کو تو بدلہ ملا وہ کسی بھی اپنے بیٹے کو دیکھ سکتی تھی لیکن اس کی بھابی بیچاری تو اپنے بچوں سے مل بھی نہیں سکتی تھی۔ پس پردہ میں ان دونوں میاں بیوی نے اللہ ڈوایا پر اعتماد کرنا شروع کر دیا کہ اسے اپنے گھر رکھا اس سے اپنے بینک اکاؤنٹ سے پیسے بھی نکلواتے تھے۔ اس نے تو دھوکا دینا ہی تھا۔ ارشاد کی کہانی آخری غصہ نے سب کچھ ختم کر کے اسے اکیلا کر دیا۔ اتنا غصہ کیا اس نے کہ اپنے چھوٹے بھائی کو مار دیا۔"

☆رانا محمد شاہد، گلستان کالونی بورے والا سے لکھتے ہیں۔ ”سرگزشت 6 اپریل کو خریدا۔ نیوز ایجنسی والے کو پیسے دینے لگا تو اس نے کہا کر پچاس روپے اور دیجیے۔ قیمت ڈھائی سو روپے ہو چکی ہے۔ ایک خیال ذہن سے گزرا کہ صفحات 220 تک ہونے چاہئیں۔ صفحات کیوں کم کردیے گئے۔ قارئین کو زیادہ سے زیادہ مواد ملنا چاہیے۔ ٹائٹل اچھا تھا مگر عید مبارک کی سمجھ نہیں آئی۔ عید گزرے تو 15 دن گزر چکے ہیں۔ (عید کے درمیان ہی آیا ہے) البتہ مختصر اداریہ پڑھتے ہوئے عید کے روز امام صاحب کے خطبے کے الفاظ یاد آگئے۔ انہوں نے کہا کہ رمضان المبارک گزر چکا ہے۔ اب ہمیں اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ اس ماہ مبارک نے ہماری زندگیوں پر کیا مثبت اثرات مرتب کیے۔ اگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ اس مہینے میں بھی ہم نے ٹکریں ہی ماری ہیں۔ امام صاحب کی بات ایک آئینہ ہے، جس میں ہم اپنا جائزہ لے سکتے ہیں اور اپنا محاسبہ کرسکتے ہیں۔ یک تی سرگزشت میں معروف مزاحیہ شاعر دلاور فگار کی زندگی کا خوب احاطہ کیا گیا۔ شہر خیال میں خالد کبیر طویل عرصے بعد نظر آئے۔ باقی لکھنے والوں نے بھی خوب لکھا۔ شہر خیال کے 6 صفحات ہونے چاہئیں۔ یوں زیادہ تاثرات پڑھنے کو ملیں گے۔ ویسے بھی رائٹرز کا حاصل تو یہی ہے کہ ان کی تحریروں کو پڑھا جائے اور ان پر لکھا جائے۔ (جیسے ہی نیوز پرنٹ کی قیمت نیچے آئی صفحات بڑھا دیے جائیں گے) ”دل ہند“ ڈاکٹر ساجد امجد نے اللہ کے ایک دوست کا خوبصورت انداز میں ذکر کیا۔ ”باضمیر“ سید احتشام کا دلچسپ قصہ تھا۔ تاہم ابتدا میں لکھا گیا کہ اس واقعہ کو بیس برس گزر چکے ہیں۔ اگر یہ واقعہ ترجمہ ہے تو حوالہ دیا جانا چاہیے تھا۔ ورنہ دوسری جنگ عظیم کے کسی واقعہ کا ذکر ہو اور یہ لکھا جائے کہ اس واقعہ کو بیس برس گزر چکے ہیں۔ (ابتدائی صفحات پر زیادہ تر ترجمہ واقعات ہوتے ہیں) ”دریچہ ماضی“ فیاض احمد شیخ کی آپ بیتی کی پہلی قسط دلچسپ رہی۔ خصوصاً ابتدا میں انہوں نے اپنے بچپن، ریلوے، ٹرین اور پلیٹ فارم کو جس خوبصورت انداز میں سمویا۔ ٹرین کے ساتھ گزرتے خوبصورت مناظر کا پڑھتے ہوئے اپنا بچپن یاد آتا رہا۔ اس لیے کہ ابو ریلوے میں ملازم تھے اور ہمارا بچپن بھی ریلوے کوارٹرز کے آس پاس ٹرین کو آتے جاتے دیکھتے اور ٹرین کا سفر کرتے ہوئے گزرا۔ جاوید بسام کی ”سیمی“ اور نجمہ سودی کی ”فتنہ“ بھی دلچسپ کہانیاں تھیں۔ ایک بات بتایے سرگزشت میں چھپنے والی مغرب کی یہ کہانیاں طبع زاد ہیں یا ترجمہ شدہ؟ (ابتدائی صفحات سچے قصے ہی دیے جاتے ہیں۔ خواہ ترجمہ ہو یا طبع زاد) بابرہ شریف کی زندگی کی کہانی کو تین حصوں میں علی سفیان آفاقی نے خوبصورتی سے قلم بند کیا۔ عاطر شاہین کی ”فوٹو گرافر“ ایک دلچسپ موضوع پر تھی۔ تاہم خیال عمومی تھا کہ اس موضوع پر پہلے بھی کہانیاں پڑھ چکے ہیں۔ آخر میں کچھ سسپنس دکھایا جاتا تو کہانی زیادہ بہتر انداز میں پیش کی جاسکتی تھی۔ ”شعبدہ“ فقصہ ہاشمی کی عمدہ تحریر تھی۔ سچ بیانیوں میں ”تمام شہر نے......“ شاہین کمال نے نئی نسل کے بگاڑ کو عمدہ انداز میں تحریر کیا۔ کیا شاہین کمال کوئی خاتون رائٹر ہیں۔ (جی ہاں، خاتون ہیں۔ اب تک ان کے چار مجموعے آچکے ہیں) فیس بک پر ایک خاتون افسانہ نگار شاہین کمال کا ذکر دیکھتے ہیں۔ میں نے سوچا شاید وہ نہ ہوں۔ (وہی ہیں) آخری صفحات پر ارشاد العصر جعفری کی تحریر بھی عمدہ خیال پر لکھی گئی منفرد کہانی تھی۔“

☆اقبال اکرم، منوں سے مخاطب ہیں۔ ”بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے، کئی بار بک اسٹال کا چکر لگایا تب جاکر رسالہ ہاتھ آیا۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے ایک صفحہ کی حالات زندگی پڑھی جو خاصہ ہے سرگزشت کا۔ یہ بہت بڑا کمال ہے کہ ایک صفحہ میں مکمل حالات زندگی پیش کی جاتی ہے۔ دلاور فگار جیسے بڑے شاعر کی الجھی ہوئی زندگی کو دلچسپ انداز میں پیش کیا۔ خالد کبیر نے عرصہ بعد شرکت کی اور ثابت کردکھایا کہ پرانا چاول خوب پھیلتا ہے۔ سال بھر کا گوشوارہ پیش کرکے دل جیت لیا۔ مسز پرویز خان نے مختصر انداز میں بھرپور تبصرہ کیا ہے۔ رانا محمد شاہد نے بھی خوب لکھا ہے۔ رفعت مقصود بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ بابائے شہر خیال جناب اعجاز حسین سٹھار کے تبصرے کا انتظار رہتا ہے۔ بہت دلچسپ اور بھرپور تبصرہ کرتے ہیں۔ اس بار بھی کمال دکھا گئے۔ انجم فاروق ساحلی کا تبصرہ بھی گوارہ تھا۔ دل ہند نہایت دلچسپ اور ایمان افروز تھا۔ مزہ آگیا۔ اب دوسرے حصے کا انتظار ہے۔ باضمیر بھی اچھی ترجمہ شدہ روداد تھی۔ دریچہ ماضی پڑھ کر اپنا ماضی یاد آگیا۔ اسکول لائف کی ایسی منظر کشی کی ہے کہ میں نے خود کو اپنے اسکول میں محسوس کیا۔ بچپن کے دن یاد آنے لگے (ڈاکٹر فیاض احمد شیخ یوکے کے بڑے ڈاکٹروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اپنی مصروف زندگی سے وقت نکال کر اپنی خود نوشت لکھ رہے ہیں، یہ بھی تعریف کے قابل ہے) سیمی کوئی خاص اثر نہ چھوڑ سکی۔ فتنہ اور شعبدہ بھی اچھی تھی۔ فوٹو گرافر بھی دلچسپ تھی۔ جان بچانا ہے تو ہم سب کی جان ہے۔ خوب سے خوب تر ہے۔ ڈائن نے آنکھیں نم کردیں۔ بہت عمدہ سچ بیانی تھی۔ ”تمام شہر نے“ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہمارے بگڑتے معاشرے کی بھرپور عکاسی ہے۔ لہو انتقام بھی پسند آئی۔ خصلت بھی اچھی تھی۔ آخری قصہ کمال کی سچ بیانی، بہت لاجواب دل کو چھوگئی۔ یہ پردہ بھی دلچسپ تھی۔ اندھا آنکھ بند کرکے کسی پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔“

☆عارف قریشی، بھکر سے رقمطراز ہیں۔ ”موبائل کی بجائے قلم اور قرطاس کے ذریعے مخاطب ہوں۔ اپنی فون کال میں 14 مارچ کو آپ نے میرے مقالے ”کچھ لولی ووڈ کے بارے میں“ کے حوالے سے میری کچھ غلطیوں کی نشاندہی کی۔ اس سلسلے میں میری گزارش یہ ہے کہ میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ اس مضمون میں میں نے سوائے اپنے مشاہدات کے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا۔ ”چال“ تحریک کے دوران ہماری فلم انڈسٹری کے کئی بڑوں کی گرفتاری اور ان کے جیل جانے کا ذکر محترم آفاقی صاحب نے بھی کیا ہے جبکہ اس کے بعد بھی اس سلسلے میں کئی احتجاج، لانگ مارچ، جلسے جلوس ہوئے، بڑا ہلیں کی گئیں مگر ان کے خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آئے۔ پاکستان میں بھارتی فلموں کی درآمد مکمل طور پر 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے موقع پر بند ہوئی جو آج تک بند ہے۔ میں یہ بات اس لیے بھی یقین کامل کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے 1965ء تک اپنے شہر کے سینماؤں میں کئی بھارتی فلمیں دیکھیں تھیں۔ ان میں جو میری یادداشت میں رہ گئیں ان کے نام یہ ہیں۔ برسات، آوارہ، شیریں فرہاد، بارہ دری، ہلاکو وغیرہ۔ میں نے اپنے مضمون میں مختلف اخبارات و رسائل کے حوالے بھی دیے ہیں۔ اس سے آپ کو بخوبی اندازہ ہوگا کہ میں نے اسے مستند بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس کے

باوجود اس کی کوئی بات آپ کو خلاف واقعہ نظر آئے تو بے شک اسے قلم زد کردیں۔"

☆ عبدالقادر، لاہور سے لکھتے ہیں۔ "ایک طویل عرصے کے بعد خط لکھ رہا ہوں لیکن سرگزشت سے رابطہ کبھی ایک ماہ کے لیے بھی ختم نہ ہوا۔ دہائیوں پر پھیلا ہوا یہ سلسلہ ختم نہ ہوا۔ سرگزشت میں کئی روایات تھیں جو وقت کے ساتھ دم توڑ گئیں جن میں سالانہ رپورٹ یا جائزہ پیش ہوتا۔ پرانے لکھنے والے آج نظر نہیں آتے کئی اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ بعض کی گھریلو مصروفیات انہیں شہر خیال میں آنے سے روکتی ہیں۔ اداریہ ہماری قومی زوال کی نشاندہی کر رہا ہے۔ سوشل میڈیا میں جاری غیر سماجی، غیر اخلاقی عادات دن بدن ترقی کر رہی ہیں۔ دوسروں پر کیچڑ اچھالنا ہماری فطرت ثانیہ بنتا جارہا ہے۔ وجہ آپ نے خود ہی بتادی ہے۔ معیاری کتب پڑھنے کا رجحان نہیں رہا۔ یہ شمارہ بھی خوب نکلا بظاہر کم والا لیکن متنوع مضامین سے زرنگار نکلا جرم و سزا، شکاریات، ایمان افروز مضامین سے مزین تھا۔ آپ اور آپ کی ٹیم کو بہت مبارک اس شاندار رسالے کو معیاری بنانے میں دن رات مصروف ہیں۔"

☆ انجم فاروق ساحلی کا توشہ، لاہور سے۔ "میری طرف سے آپ اور ادارہ کے اراکین کو عیدالفطر مبارک۔ مارچ کا سسپنس اور پھر سرگزشت چند دن دیر سے مارکیٹ میں آئے جس سے تشویش ہوئی۔ افغانستان کے ساتھ جھڑپیں اور امریکا ایران جنگ کے سلسلے میں دعا گو ہوں کہ جارحیت کے سلسلے جلد رک جائیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں تحمل اور تدبر عطا فرمائے۔ دو ماہ سے کوئی تحریر شائع نہ ہوئی۔ آپ کی خدمت میں "آدم خور شیرنی"، "خونی مگرمچھ" اور "تجربے کی ذہانت" بھیج دی ہیں۔ اُمید ہے توجہ فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں گے۔ آپ کی صحت و تندرستی کے لیے دعا گو ہوں۔ (وقتاً فوقتاً مسلسل توجہ دلا رہا ہوں کہ اپنی تحریر پر توجہ دیں، مربوط لکھیں) "سیاہ چہرے" آپ بیتی شروع کر دی تھی مگر بھائی کی وفات کی بنا پر ابھی مکمل نہیں کر پایا۔ ہمارے دوست اور پڑوسی پرویز انجم کی نئی کتاب منٹو اور کیمرا چھپ گئی ہے۔ اس کی کتابیات میں کئی سرگزشت کا حوالہ موجود ہے۔ سرگزشت خوبصورت اور جاذب نظر ٹائٹل کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ خطوط کی تعداد کم لیکن سرگزشت سے وابستگی بھرپور تھی۔ "مرکز خلائق" ایک بڑی ہستی کا قابل قدر اور ایمان افروز زندگی نامہ ہے۔ "فریب ناتمام" عرصہ بعد کروٹیں بدلتی ہوئی دلچسپ کرائم کہانی ہے۔ جو ٹیکنیکل معلومات کے برعکس پلاٹ کی عمدت کو اجاگر کر رہی تھی۔ یاد ماضی اچھی سرگزشت ہے۔ باکمال اداکاروں کی قسط اس مرتبہ علی کمال کی عمدہ تحریر تھی۔ بابرہ کے علاوہ اداکار رشید کی شخصیت، نفسیات اور منور ظریف کو لگنے والے زخم احوال آفاقی صاحب نے الفاظ کے عمدہ چناؤ کے ساتھ پیش کیا۔ اس مرتبہ یہ بہتری آئی ہے کہ بے جا اقتباسات کے ذریعے خوش نما تھے۔ سرگزشت سے دلچسپی اور وابستگی برقرار ہے۔ معرکہ جنگل، خوفناک بھینسا اور خونی شیر خاں آپ نے خوب بروقت شائع کی تھیں۔ آغا اشرف کا شخصی خاکہ بھی خوب تھا۔ وہ ایک عرصہ تک ہمارے پڑوسی رہے۔ میری ابتدائی دو کہانیاں انہوں نے دیکھی تھیں۔ ان کی الماری سے ایک ناول "ماناہری" بھی نکال کر پڑھا تھا۔ جب آغا اشرف اپنا مکان بیچ کر اعوان ٹاؤن چلے گئے تو اسی لائن میں ڈاکٹر انور سدید کی سرگودھا سے آمد ہوئی تھی۔ اداکار حبیب نے آغا اشرف کی مکان کی تعمیر میں بے حد معاونت کی تھی۔ شکاری کا شکار خوب ہے۔ مجبور شہنشاہ بھی اچھی کاوش، ہرجائی اپنے مخصوص انداز میں سنسنی خیز کی دنیا اپنے اندر لیے ہوئے تھی۔ مجبوری، خاموش جدوجہد، حور یہ اور قربانی بھی اچھی کاوشیں ہیں۔ باقی کچھ تحریریں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ آپ کی تندرستی کے لیے دعا گو ہوں۔ ہر لکھنے والے کا اپنا نکتہ نظر اور زاویہ نگاہ ہوتا ہے۔ آغا اشرف نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ ابن صفی کی کم تحریریں بامقصد ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے میرا دیا ہوا ناول لاشوں کا آبشار کے چند صفحات پڑھنے کے بعد واپس کر دیا تھا کہ میں ابن صفی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ یہ بہت ساری فالتو باتیں کرتے ہیں۔ اُمید ہے خط کو مکمل شائع کیا جائے گا۔ میں دعا گو ہوں کہ سرگزشت کی فروختگی کی تعداد برقرار قائم رہے۔ کیونکہ مجھے دو تین مقامات پر کہا گیا ہے کہ سسپنس، جاسوسی کے مقابل سرگزشت کی فروخت کم ہو رہی ہے۔ مجھے اس سے تشویش ہوئی کہ معلوم نہیں ایسا کیوں ہو گیا۔ حالانکہ سرگزشت کا دامن بڑا وسیع و عریض ہے۔ جہاں ہر رنگ کے پھول کھلتے اور جھومتے ہیں۔ (اس بات سے متفق ہوں کہ ہر قلمکار کا اپنا نکتہ نظر ہوتا ہے۔ لیکن تحریر مربوط ہونا زیادہ ضروری ہے۔ اضافی جملے، بے سروپا واقعات تحریر کو مسخ کرتی ہے۔)"

☆ نصر اللہ خان کی داؤد خیل میانوالی سے آمد۔ "خیریت باخیریت۔ ماہنامہ سرگزشت آٹھ تاریخ کو ملا جو کافی لیٹ تھا۔ لیکن بڑا دکھ ہوا کہ اس ماہ مزید 32 صفحات کم کردیے۔ آدھا سرگزشت رہ گیا۔ حالانکہ 258 صفحات کر کے ماہنامہ حکایت کی طرح 300 روپے قیمت کی جا سکتی تھی۔ جناب مرحوم معراج رسول صاحب بڑے یاد آرہے ہیں کیونکہ وہ قارئین کی بھی مان لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں بخشے۔ اتنے کم صفحات میں تو صرف اعجاز سخار کا خط بھی نہیں آپائے گا۔ جان بچانے کے ختم ہونے پر تو رسالہ لینا بھی چھوڑ دیں گے۔ اسی طرح سسپنس اور جاسوسی کی حالت ہے وہ بھی ناہید سلطانہ اختر کی وجہ سے لینے پڑتے ہیں۔ اس دفعہ سچ بیانی قربانی شمارے کی جان تھی۔ جسے پڑھ کر میرے آنسو نکل پڑے بڑا ترس آیا شمینہ پر۔ ثمینہ وفا کی دیوی تو ہرجائی میں محبت بے وفائی کی پیکر۔ سچ میں شمینہ پر مجھے بڑا پیار آیا۔ یاد ماضی میں جناب انوار احمد کی آپ بیتی بڑی منفرد اور انوکھی تھی۔ بڑا مزہ آیا۔ آکاش مغل صاحب اچھی کاوش لے چھے بنا رہے ہیں خاص طور پر پیار و محبت کی کہانیوں پر۔ مجبور شہنشاہ میں محبوب قلمکار زویا صفوان نے حیران کن ورق سے آگے چھے جو داد کی مستحق ہیں۔ انہیں مبارک باد اور عید مبارک پیش کرتا ہوں۔ جناب ساجد امجد صاحب کی مرکز خلائق خاصے کی چیز تھی۔ جس سے دل باغ باغ ہو گیا۔ مجرما ملف اور شکاری کا شکار بھی سبق آموز تحریریں تھیں۔ پہلے بھی پوچھا ہے کہ اے آر راجپوت کی جنس کے بارے میں بتا دیں کہ مرد ہیں یا عورت (مرد ہیں) ایک بار پھر گزارش ہے کہ صفحات 258 اور قیمت 300 کر دیں آپ کی ہم پر بڑی عنایت ہوگی۔ اس میں آپ کا ہم پر بڑا احسان رہے گا۔"

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط: جلال الدین ٹوبہ ٹیک سنگھ، سعدیہ منیر، اوکاڑہ۔ ناہید اسلم، لاہور۔ مریم احمد، فیصل آباد۔

نظریہ ساز

عالیہ لودھی

علمِ طب کی ارتقا میں مسلمان حکما کا کردار اہم ہے لیکن اس علم میں اضافہ اس طبیب نے کیا۔ بلکہ اس نے دنیائے طب میں انقلاب برپا کردیا۔ اس نے علم الابدان میں قدرت کی کارگری کی اصل حقیقت کو تجربے سے ثابت کردکھایا اور طب کی دنیا میں انقلاب لادیا۔ اس کے نظریہ نے پڑھائے جارہے اسباق کو غلط ثابت کردیا۔ آج اسے ذہین ترین سائنسدان مانا جارہا ہے۔

بے وقوفوں کے دن پیدا ہونے والے ماہرِ طب کی داستان

کہنے کو تو یکم اپریل بے وقوفوں کا دن سمجھا جاتا ہے۔ دنیا بھر کے لوگ اس دن طرح طرح کے مذاق کرتے ہیں، ایک دوسرے کو بے وقوف بناتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ صدیوں سے یہ روایت یونہی چلی آرہی ہے۔

لیکن لگ بھگ چار سو سال پہلے اسی دن یکم اپریل 1578ء کو برطانیہ کے ایک چھوٹے سے قصبے فوک اسٹون میں ولیم ہاروے نامی ایک ایسا بچہ پیدا ہوا جس نے یکم اپریل کے بارے میں پھیلے ہوئے اس سارے تاثر کو گویا ملیا میٹ کردیا۔

اس نے طب کی دنیا میں انقلاب برپا کردیا۔

اس نے ایسے نظریات پیش کیے جن کی بدولت انسانی جسم کے اندر پوشیدہ قدرت کی کاریگری کے بارے میں اصل حقیقت سامنے آئی۔

اس نے علم الابدان کے بارے میں ایسے انکشافات کیے کہ ایک عالم اس کی ذہانت کا گرویدہ ہوگیا۔ اس حد تک گرویدہ ہوگیا کہ اس کے مداح اس کی تاریخِ پیدائش کو تبدیل کرانے پر اصرار کرنے لگے۔ یہ کہنے لگے کہ وہ یکم اپریل کو نہیں، دو اپریل کو پیدا ہوا تھا۔

ولیم ہاروے اپنے والدین کا پہلا بیٹا تھا لیکن اس کے بعد چھ بھائی اور دو بہنیں پیدا ہوئیں۔ یوں گویا وہ نو بچوں اور والدین پر مشتمل ایک بڑے کنبے میں پلا بڑھا۔ والدین اپنے بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ ان کی بہتر تعلیم و تربیت کی خواہش رکھتے تھے اور اس مقصد کے حصول کے لیے دونوں محنت و مشقت کرتے تھے۔ ولیم ہاروے پیدائشی طور پر ذہین بچہ تھا۔ گھر میں محبت بھرا ماحول ملا تو اس کی ذہانت اور صلاحیتیں ابھر کر سامنے آنے لگیں۔

ولیم کا خاندان، جس قصبے فوک اسٹون میں آباد تھا، وہ ساحلِ سمندر پر واقع تھا۔ ولیم کا بچپن اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ہمراہ ساحل پر کھیلتے گزرا۔ وہ اکثر سمندر کے کنارے کھڑا آنے جانے والے بحری جہازوں کو کشتیوں کو دیکھا کرتا رہتا۔ غور کرنا اس کا مشغلہ تھا۔ وہ ہر چیز، ہر بات پر غور کرتا رہتا تھا۔ اپنی عمر کے اعتبار سے ہر پیچیدہ بات کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

اس ہنستے کھیلتے بچپن میں ایک چھوٹا سا حادثہ پیش آگیا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ بھاگ دوڑ کرتے ہوئے ولیم ہاروے ایک نوکیلے پتھر پر گر پڑا۔ اس کے گھٹنے پر گہرا کٹ لگ گیا اور زخم سے خون بہنا شروع ہوگیا۔ گرتے ہی تکلیف کی وجہ سے ولیم نے رونا شروع کردیا۔ اس کے دیگر ساتھی کھیل چھوڑ کر اس کے گرد جمع ہوگئے۔ کچھ بڑے بچوں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور اس کے گھر کی طرف لے چلے۔ ولیم کو چلنے میں بھی تکلیف ہورہی تھی۔ گھر پہنچا تو ماں نے اس کے زخم کو دھو کر صاف کردیا لیکن اس میں خون ابھی تک بہہ رہا تھا۔ گرنے کا صدمہ اور چوٹ کی تکلیف کچھ کم ہوئی تو اس نے اپنے گھٹنے کی طرف غور سے دیکھا۔ اس وقت تک ولیم کی ماں مرہم پٹی کا سامان لے آئی تھی۔ خون ابھی تک زخم سے بہہ رہا تھا۔ ولیم نے تکلیف کے باوجود حیرانی سے خون کے بہنے پر غور کرنا شروع کردیا کہ یہ گاڑھا

لال رنگ کا مادہ جسم کے اندر کہاں سے باہر آ رہا ہے۔ بظاہر جسم کے اوپر زخم کے سوا کچھ نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنی تکلیف کو بھول کر خون کو دیکھنے لگا۔ ماں بھی کہ وہ خون دیکھ کر ڈر رہا ہے۔ ماں نے اسے پیار کیا، زخم کو دھو کر صاف کیا اور جلدی جلدی مرہم لگا کر زخم پر پٹی باندھ دی تا کہ خون بہنا بھی رک جائے اور اس کی تکلیف بھی کم ہو جائے۔ مرہم پٹی کروا کر وہ سو گیا۔ دوسرے دن اس کا زخم خاصہ بہتر تھا۔ خون بہنا رک چکا تھا۔ اس چھوٹے سے واقعے نے ولیم کو بہت متاثر کیا۔ اب اس نے غور کرنا شروع کیا کہ جب بھی کسی انسان یا جانور کے چوٹ لگتی ہے یا کٹ لگ جاتا ہے تو لال رنگ کا مادہ جسے خون کہا جاتا ہے زخم سے بہنا شروع ہو جاتا ہے پھر علاج معالجے کے ذریعے اس کو بہنے سے روکا بھی جاتا ہے۔ ولیم کے لیے انسان اور جانور کے جسم سے خون کا اس طرح بہنا خاص دلچسپی کا باعث تھا۔ وہ اس پر غور کرتا رہا۔ وہ اپنے بڑوں سے اس سلسلے میں مختلف سوال جواب بھی کرتا تھا مگر کم عمر ہونے کی وجہ سے اس کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔

ولیم کے والدین نے بھی چیزوں کے بارے میں اس قدر غور و خوض کرنے کی ان عادتوں کو نوٹ کیا۔ ایک دن اس کے باپ نے ولیم کی ماں سے کہا۔ ”ولیم اب بڑا ہو گیا ہے، اس قابل ہے کہ اسے کسی اچھے اسکول میں داخلہ دلا دیا جائے۔ اس کی عمر اب دس سال ہو چکی ہے لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ اس میں چیزوں کو سیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہے۔ اگر ہم اسے بہتر تعلیمی ماحول فراہم کر سکیں تو یقیناً ولیم ایک کامیاب انسان بن سکے گا۔“

باہم صلاح و مشورے کے بعد ولیم کے والدین نے اس کا داخلہ کنٹربری کے کنگز اسکول میں کرا دیا۔ ولیم چونکہ خود بھی پڑھنے لکھنے میں دلچسپی رکھتا تھا اس لیے بہت جلد یہ نظر آنے لگا کہ وہ اپنے والدین کی امیدوں پر پورا اترے گا۔ ولیم کا شمار اسکول کے ذہین اور قابل طالب علموں میں ہونے لگا۔ وہ نہ صرف اپنی پڑھائی پر بھرپور توجہ دیتا بلکہ اس نے مختلف کھیلوں میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس نے اسکول میں کرائی جانے والی جسمانی ورزشوں اور کھیلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے میں بھرپور دلچسپی ظاہر کی۔ ابھی اس کی عمر صرف دس سال تھی لیکن کھیل کود اور جسمانی ورزشوں کی وجہ سے وہ ایک صحت مند اور طاقتور بچہ شمار کیا جانے لگا۔ اپنی ذہانت کے باعث اس نے ہر جماعت میں امتیازی نمبر حاصل کیے۔ اس طرح اس کا شمار اسکول کے قابل فخر……

طلبہ میں ہونے لگا۔

اسی دوران میں اس کے ملک برطانیہ کے حالات میں ہیجان خیزی پیدا ہو گئی۔ اسپین کے بادشاہ فلپ نے برطانیہ پر حملہ کرنے کے لیے ایک بہت بڑا بحری بیڑا ترتیب دے کر انگلینڈ کی طرف روانہ کیا۔ ان حالات میں کوئی بھی ملک خاموش نہیں بیٹھ سکتا تھا لہٰذا برطانیہ میں بھی جنگی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ برطانوی افواج کو بھی اسپین سے مقابلہ کرنے کے لیے تیاری کرنے اور روانگی کا حکم دے دیا گیا۔

انہی دنوں ولیم بھی چھٹیوں کی وجہ سے اسکول سے فارغ ہو کر اپنے آبائی قصبے آیا ہوا تھا۔ اس زمانے میں آمد و رفت کا سب سے اہم ذریعہ بحری جہاز تھا۔ خاص طور پر جنگ کے دوران بحری فوج پر انحصار بہت زیادہ تھا۔ ولیم اپنی عادت کے مطابق ساحل سمندر پر کھڑا جہازوں کا نظارہ کرتا رہتا۔ اس وقت ملک میں جنگی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ ساحل سمندر پر فوجیوں اور جنگی جہازوں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ ولیم ان فوجیوں اور ان کے ہتھیاروں سے بہت متاثر تھا مگر بچہ ہونے کی وجہ سے وہ ان سے خوف زدہ بھی رہتا تھا۔ تاہم اس کے دل میں اپنے ملک کے لیے جنگ لڑنے کا جذبہ موجود تھا۔ وہ اکثر سوچتا کہ کاش میں بھی ان فوجیوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہو سکتا لیکن کم عمر ہونے کی وجہ سے اس کو اپنی خواہش پوری کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ جنگ شروع ہوئی تو جلد ہی برطانیہ نے اسپین کی فوجوں کو شکست دے دی اور اس طرح ولیم اور اس کے وطن کے لوگوں کے لیے خوشی و مسرت کا ایک موقع مل گیا۔ اس فتح کا ولیم پر بھی اثر ہوا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بھی بڑا ہو کر اپنے ملک و قوم کے لیے ایسی ہی خدمات انجام دے گا جیسی ان فوجیوں نے انجام دیں جن کو وہ ساحل سمندر پر کھڑا ہو کر جنگی جہازوں سے آتا جاتا دیکھا کرتا تھا۔ برطانیہ کے لیے یہ فتح قوم کے حوصلوں میں اضافے کا سبب بنی اس وجہ سے ملک میں مایوسی، بے چینی اور اسی قسم کے دوسرے منفی رویے لوگوں میں پیدا نہیں ہوئے۔

جنگ ختم ہو گئی اور حالات پُرسکون ہو گئے۔ ولیم نے پڑھائی کی طرف توجہ مرکوز کر دی۔ کیمبرج یونیورسٹی کا شمار اس زمانے میں بھی دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں ہوتا تھا۔ دنیا بھر کے طالب علموں کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی اور اس سے ملحقہ کالجوں میں داخلہ لے سکیں۔ ولیم کے لیے اس خواب کی تکمیل آسان تھی۔ ایک تو

urdunovels.com

وہ خود بھی ذہین طالب علم تھا دوسرے اس کے والدین اس کو بھرپور مدد فراہم کرنے کے لیے اس کے ساتھ تھے لہٰذا اسکول میں پانچ سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد ولیم نے کیمبرج کے گونویل کالج میں داخلہ لے لیا۔

کیمبرج ایک بہت قدیم اور پُرکشش قصبہ تھا۔ دریائے کیم کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ دریا کے کنارے آباد ہونے کی وجہ سے کیمبرج سرسبز اور خوب صورت علاقہ تھا۔ یہاں دنیا کی مشہور یونیورسٹی تھی لہٰذا دنیا بھر کے طلبہ ہر وقت موجود رہتے تھے جن کی بدولت یہاں رونق سی رہتی تھی۔ ولیم کا بچپن یوں بھی ساحل سمندر پر گزرا تھا، اس وجہ سے کیمبرج میں دریا کا کنارہ ولیم کو بے حد پسند تھا۔ اسے یہاں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

اس زمانے میں کیمبرج کے قریب ہی ایک چھوٹا سا قصبہ گھوڑوں کی افزائش کے لیے مشہور تھا۔ جہاں گھوڑوں کی تربیت بھی کی جاتی تھی، انہیں گھڑ دوڑ میں حصہ لینے کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ گھڑ دوڑ ایک ایسا قدیم کھیل ہے جو صدیوں سے لوگوں کا پسندیدہ ہے۔ اگرچہ اب کاروں، گاڑیوں اور ہوائی جہازوں کا زمانہ ہے مگر گھڑ دوڑ اور گھڑ سواری آج بھی مقبول ہے۔ خاص طور پر کھیل کی حیثیت سے دنیا بھر میں یہ مشہور ترین کھیل ہے۔ اس زمانے میں بھی کیمبرج کے قریب واقع یہ چھوٹا سا قصبہ گھڑ دوڑ اور گھڑ سواری کا مرکز تھا۔ یہاں پر گھوڑوں کو ریس میں حصہ لینے کے لیے تربیت دی جاتی تھی۔ ہر ریس پر بھاری شرطیں لگا کر ہزاروں جیت لیتے یا قلاش ہو جاتے تھے۔ ولیم کیونکہ شروع سے ہی پڑھائی کے علاوہ دیگر کھیلوں میں حصہ لینے کا شوقین تھا لہٰذا اس نے یہاں پر رہتے ہوئے گھڑ سواری میں مہارت حاصل کر لی۔

ولیم شروع سے ہی اچھی عادت واطوار کا مالک تھا۔ اس کے والدین نے بھی اس کی تربیت کا بھرپور خیال رکھا تھا۔ شاید اسی لیے وہ گھڑ سواری میں تو ماہر ہو گیا لیکن اس نے گھوڑوں پر پیسا لگانے اور جوا کھیلنے سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ بہت سے طلبہ جو کیمبرج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے گھڑ سواری میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ ان میں سے بعض گھوڑوں پر شرطیں بھی لگاتے تھے۔ رقم جیت جاتے تو ان کو اس کھیل کی ایسی لت پڑ جاتی کہ وہ مستقل اسی کے ہو رہتے۔ وہ شرطیں لگاتے رہتے، جیتتے ہارتے رہتے مگر یہ بھول جاتے کہ انہوں نے اپنا تعلیمی مستقبل داؤ پر لگا دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ بہت سے طلبہ تعلیمی کیریئر تباہ کر بیٹھتے۔ ولیم نے خود کو اس بری لت سے

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

موسم گرما کے سنگین اتار چڑھاؤ

مئی کے شمارے کے عالی شان رکھ رکھاؤ

آرکائیو

زندگی انسانوں سے ہمدردانہ رویے کا نام ہے صداقت بھری سوچوں کا امتحان ہے...... سچے جذبوں اور احساسات سے جڑی داستان

احمد نعمان شیخ کے قلم سے

ماضی وحال کا ملاپ

سربکف

ماضی کی دھندلی پرچھائیوں کے تعاقب میں دوڑتے بھاگتے کردار کی پُراسرار داستان......

طاہر جاوید مغل کے قلم سے

دہر

قدم قدم پر بڑھتی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے والے ایک دلیر نوجوان کی کوچہ گردی

حسام بٹ کے قلم سے سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

سرزمینِ فلسطین اور اس کے مکینوں کے لہو سے گندھی سنسنی خیز تحریر

دوسرا رنگ

حقیقی زندگی اور سچی جرأت سے بھرپور کہانی کے نشیب وفراز

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کہانیں

بچائے رکھا۔ وہ اگرچہ ایک ماہر گھڑ سوار بن گیا تھا جو اکثر شام کے وقت دریا کے کنارے سواری کرتا نظر آتا تھا مگر اس نے خود کو گھوڑوں پر شرطیں لگانے کی عادت سے محفوظ رکھا۔

ولیم ہاروے چونکہ شروع سے ہی انسان اور جانوروں کے جسم میں موجود خون کے بارے میں دلچسپی لیتا تھا لہٰذا اس نے اپنے لیے طب کی جس شاخ کا انتخاب کیا تھا اس کا تعلق جانوروں کے جسم کی چیر پھاڑ اور جراحی کے ذریعے اس کی جسمانی ساخت اور مختلف اعضا کی کارکردگی کا جائزہ لینے سے تھا۔ علم الابدان یعنی انسانی بدن کا علم ایک ایسی سائنس ہے جس کی بنیاد جانوروں کے جسمانی ڈھانچے اور ان کے مختلف اعضا کو الگ الگ کر کے اس کا مطالعہ کرنے پر ہے۔

ولیم نے جب اپنے لیے طب کے اس مخصوص شعبے کا انتخاب کیا تو پہلی مرتبہ اس نے گونویل کالج میں لیبارٹری دیکھی۔

ولیم کے لیے یہ لیبارٹری ایک انتہائی دلچسپ جگہ تھی۔ ایک ایسی جگہ جہاں وہ کئی گھنٹے خاموشی سے گزار سکتا تھا جہاں کوئی اسے تنگ کرنے والا نہیں تھا۔ وہ وہاں موجود چیزوں پر غور کرنے اور سوچنے سمجھنے کے لیے آزاد تھا۔ وہاں پھیلی ہوئی خاص بو ولیم کے لیے ایک مسحور کن خوشبو کا سا کام دیتی تھی۔ وہ خاموشی سے تجربہ گاہ میں چلا جاتا۔ وہاں قطار در قطار طرح طرح کے مرتبان اور بوتلیں رکھی ہوتی تھیں جن میں قسم قسم کے جانور محفوظ تھے۔ کچھ بوتلیں الماریوں میں اتنی بلندی پر رکھی تھیں کہ ولیم کو اچک اچک کر انہیں دیکھنا پڑتا۔ میزوں پر طرح طرح کے آلات موجود ہوتے جو ان جانوروں کی چیر پھاڑ کے کام آتے تھے۔ ولیم ان کی ساخت پر بھی غور کرتا۔ اپنی تعلیم کے دوران میں یہ تجربہ گاہ ولیم کی پسندیدہ ترین جگہ تھی۔ وہاں موجود بوتلوں اور مرتبانوں میں مختلف اقسام کی مچھلیاں، مینڈک اور اسی قسم کے دیگر چھوٹے چھوٹے جانور بند تھے۔ ولیم کے لیے یہ سب کچھ بہت دلچسپ تھا۔ وہ اکثر اکیلا ہی تجربہ گاہ میں جا کر ان جانوروں کی چیر پھاڑ کرنے لگتا۔ ان کے جسمانی نظام اور اعضا کی ساخت پر غور کرتا اور گھنٹوں اس کام میں مصروف رہنے کے باوجود اسے تھکن کا احساس تک نہ ہوتا۔

ولیم نے اس کالج میں چار سال تک تعلیم حاصل کی۔ دوران تعلیم وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مستقبل کے منصوبے بھی بناتا۔ ولیم چونکہ ایک ذہین طالب علم تھا جو ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی میں بھی بہت زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کے تمام اساتذہ اسے بہت پسند کرتے تھے۔ ان کے پاس جس قدر بھی علم تھا، وہ اسے اپنے اس ذہین شاگرد تک پہنچانے کو ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ولیم اپنے ساتھیوں سے مستقبل کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے کہتا۔ "میں مستقبل میں علم الابدان کا بڑا ماہر بننا چاہتا ہوں۔ اپنے اساتذہ کی طرح مہارت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اساتذہ ہی میرا آئیڈیل ہیں۔ میں بھی ان کی طرح اس میدان میں آگے...... بہت آگے جانا چاہتا ہوں۔"

کیمبرج یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ولیم کو مزید تعلیم حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ اس وقت طب کی مخصوص شاخ اناٹومی کی تعلیم کے لیے اٹلی کی یونیورسٹی پاڈوا کا نام خاص طور پر مشہور تھا۔ ولیم نے بھی اٹلی جانے کا فیصلہ کیا تاکہ پاڈوا یونیورسٹی میں داخلہ لے سکے۔ اس کی خواہش تھی کہ سائنس کے میدان میں دنیا کا نامور ترین سائنس دان بن کر ابھرے۔ ایک ایسا انسان، جس کا نام اس کے کام کی وجہ سے پوری دنیا جانتی تھی۔

اٹلی یوں بھی برطانیہ سے زیادہ دور نہیں ہے اس وجہ سے بھی ولیم کے لیے وہاں پر جانا زیادہ مشکل نہ تھا۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس وقت سفر کرنا اتنا آسان نہیں تھا جس قدر آج کل ہے۔ چار سو سال پہلے ہوائی جہاز ایجاد نہیں ہوا تھا۔ اٹلی اگرچہ دور نہیں تھا لیکن وہاں جانے کے لیے سمندر کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ سمندری سفر اس وقت خاصہ تکلیف دہ اور طویل ہوا کرتا تھا۔ ولیم کا سارا بچپن سمندر کے ساحل پر کھیلتے کودتے اور جہازوں کو آتے جاتے دیکھتے ہوئے گزرا تھا۔ اس کے لیے تو یہ سفر خوش گوار تجربہ ثابت ہوا۔ یوں بھی وہ اپنی زندگی کے سب سے اہم مقصد کی خاطر یہ سفر کر رہا تھا اس طرح اس کی دلچسپی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ سمندر، نم ہوا اور خراب موسم دوسرے لوگوں کو تو بیزار کر دیتے تھے خاص طور پر ایسے مسافر جو پہلی دفعہ سمندر کا سفر کر رہے تھے، وہ اس سفر سے سخت پریشان نظر آتے تھے لیکن ولیم کے جوش و خروش کا وہی عالم تھا۔ یہ سفر اس کے بچپن کے خوابوں کی تعبیر فراہم کرنے میں مددگار ثابت ہونے والا تھا۔

اٹلی پہنچ کر جب ولیم نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو وہ حیران رہ گیا۔ اگرچہ وہ دنیا کی مشہور یونیورسٹی کیمبرج کے ملحقہ کالجوں سے فارغ التحصیل ہو کر یہاں آیا تھا مگر یہاں کا ماحول تو وہاں کی نسبت بالکل الگ تھا۔ اس وقت چونکہ یہ یونیورسٹی دنیا کی مشہور ترین درس گاہوں میں شمار ہوتی تھی

اس وجہ سے یہاں دنیا بھر کے طلبہ موجود تھے۔ ولیم کی ملاقات یہاں جن لوگوں سے ہوئی ان میں چین کے باشندے بھی تھے اور جاپان کے رہنے والے بھی۔ یہاں بڑی تعداد میں اسپین کے طلبہ بھی موجود تھے۔ کچھ کا تعلق جرمنی سے بھی تھا اور بعض فرانس سے بھی یہاں آئے تھے۔ بڑی تعداد میں ایسے طلبہ بھی موجود تھے جو اس کے اپنے وطن سے تعلق رکھتے تھے اور چونکہ یہ یونیورسٹی اٹلی میں واقع تھی تو اٹلی کے طالب علم تو یہاں پر موجود تھے ہی۔ غرض یہ ایک چھوٹی سی دنیا بن گئی تھی جہاں مختلف ملکوں سے آنے والے علم کے رسیا جمع تھے۔ یہ تمام لوگ مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں سے فارغ ہو کر یہاں پہنچے تھے۔ بعض کا تعلق مشہور و معروف کالجوں سے تھا اور بعض کم نام درس گاہوں سے فارغ ہو کر یہاں پہنچے تھے۔ اپنے اپنے ملکی تشخص کے علاوہ سابقہ تعلیمی اداروں کے حوالے بھی ان کی پہچان کا ایک ذریعہ بن گئے تھے۔ اپنے اپنے سابقہ تعلیمی اداروں کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ لوگ آپس میں لڑ بھی پڑتے تھے۔ بعض اوقات یہ مقابلہ مثبت بھی ثابت ہوتا تھا۔

طلبہ خود کو ایک دوسرے سے زیادہ برتر ثابت کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرتے۔ ریسرچ کرتے اور خوب محنت کرتے لیکن بعض دفعہ یہ بحث منفی رنگ بھی اختیار کرتی۔ خراب تعلیمی کارکردگی والے دوسروں سے جھگڑا کرنے اور ہنگامہ کرنے سے بھی نہ چوکتے تھے۔ غرض اسی طرح کے ہنگامہ خیز ماحول میں ولیم نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ لوگوں کے آپس کے مقابلے اور جھگڑوں کے درمیان ولیم نے اپنا کسی قسم کا تعلیمی نقصان نہ ہونے دیا۔ اس کی تمام تر توجہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے پر تھی۔ اس کا فارغ وقت طب کے میدانوں میں ریسرچ کرتے اور مختلف طبی مسائل پر غور کرتے ہوئے گزرتا۔ وہ یونیورسٹی میں ہونے والے جھگڑوں سے دور ہی رہتا تھا۔

یونیورسٹی میں کالج کی نسبت زیادہ آزاد ماحول تھا۔ یوں بھی دنیا بھر کے طلبہ یہاں موجود تھے جو لوگ تعلیم میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے ان کے لیے یہ بڑی پُرکشش صورتِ حال تھی۔ ولیم کے کئی ساتھی ایسے تھے جو کلاس میں حاضر نہ ہوتے۔ ان کا زیادہ تر وقت یونیورسٹی میں لڑکیوں سے دوستیاں کرنے، انہیں گھمانے پھرانے، پکنک اور پارٹیوں کے پروگرام طے کرنے میں گزرتا تھا۔ ولیم نے ایک آدھ مرتبہ اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ پکنک وغیرہ کے

پروگراموں میں شرکت کی مگر وہ جلد ہی ان سے بیزار ہو گیا۔ اس کے خیال میں یہ سب کچھ وقت کا ضیاع تھا۔ ولیم نے رفتہ رفتہ ان سرگرمیوں میں حصہ لینا چھوڑ دیا۔ اس وجہ سے اس کے دوست بہت کم تعداد میں باقی رہ گئے۔ ولیم کے خیال میں یونیورسٹی سیر و تفریح کی جگہ نہیں تھی بلکہ حصولِ علم کا مرکز بھی۔ نہ صرف یونیورسٹی کے وقت کے دوران بلکہ فارغ وقت میں بھی ولیم دوستوں کے ساتھ جانے سے گریز کرنے لگا۔ اسی وجہ سے اس کے دوستوں کی تعداد کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ لوگ عام طور پر ایسے شخص کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتے جس کو تعلیم کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہ ہو۔ جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہوتا اور وہ لوگ چہلیں کرنے اور خوش گپیوں میں مصروف ہوتے۔ ولیم اپنی ہی سوچوں میں گم رہتا۔ دریا کے کنارے سیر کے وقت لوگ ہنسی مذاق میں مصروف ہوتے اور ولیم مینڈک، مچھلی اور چھپکلیوں کی حرکات و سکنات پر غور کر رہا ہوتا۔ ظاہر ہے ایسے بور شخص کے ساتھ کوئی کس طرح دوستی نباہ سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ ایک پڑھاکو اور بور شخص کے طور پر مشہور ہو گیا اور اس کے دوست صرف ایک دو ہی رہ گئے۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ ولیم کو دنیا کے کاموں سے دلچسپی نہیں تھی یا دنیا کی خوب صورتی اسے متاثر نہیں کرتی تھی۔ اس کو قدرت کی خوب صورتی اور قدرتی نظاروں سے بہت دلچسپی تھی۔ جب وہ اپنی پڑھائی سے تھک جاتا تھا تو سکون حاصل کرنے اور تھکن اتارنے کے لیے یونیورسٹی کے قریب ایسے علاقے میں چلا جاتا تھا جہاں ہر طرف سرسبز گھاس اور بڑے بڑے سرسبز درختوں کی قطاریں تھیں۔ وہاں طرح طرح کے پھولوں کے پودے، کئی طرح کے پرندے اور چھوٹے چھوٹے جانور ہوتے۔ یہ جگہ ولیم کو بہت متاثر کرتی۔ وہ یہاں اس وقت تک ٹہلتا رہتا جب تک اس کا دماغ بالکل پُرسکون نہ ہو جاتا۔ وہ اپنے ساتھ ہلکا پھلکا ناشتے کا سامان لے جاتا خود ہی اپنی پارٹی کرتا اور مظاہرِ قدرت پر غور کرتا۔ یہاں کا پُرسکون اور فرحت بخش ماحول ولیم کو پُرسکون اور تروتازہ کر دیتا۔ وہ زندگی کے ایک ایک لمحے کو سود مند طریقے سے گزارنے کا عادی تھا۔ اسی وجہ سے جب وہ تفریح کی غرض سے ایک پُرسکون مقام پر جاتا تب بھی اس کے ساتھ اس کی نوٹ بک اور پنسل ہوتی۔ وہ اس ماحول میں مختلف چیزوں پر غور کرتا۔ اس کو جو نئی نئی باتیں نظر آتیں یا جو نئے تصورات ذہن میں مرتب ہوتے انہیں اپنی

نوٹ بک میں تحریر کرتا جاتا تاکہ بعد میں ان کو سامنے رکھتے ہوئے مزید کام کرسکے۔

اس سرسبز خطے میں چہل قدمی کرنے کے علاوہ ولیم کا دوسرا پسندیدہ مشغلہ تیراکی تھا۔ وہ شروع سے ساحل سمندر پر رہا تھا اس لیے پانی میں تیرنا اس کے لیے ایک دلچسپ اور خوشگوار تفریح تھی۔ وہ دریا کے صاف شفاف اور ٹھنڈے پانی میں نہا کر اپنی ساری تھکن دور کر لیتا تھا۔

یونیورسٹی میں ولیم نے اپنی دلچسپی اور شوق کو سامنے رکھتے ہوئے میڈیسن اور اناٹومی کے مضامین کا انتخاب کیا۔ اس کو جانوروں کی جسمانی ساخت، ان کے اندرونی اعضا اور ان اعضا کی کارکردگی میں ابتدا سے ہی بہت دلچسپی تھی۔ یہ دونوں شعبے اس کی دلچسپی کے عین مطابق تھے۔ چھوٹی چھوٹی زندہ مخلوق جن میں مچھلیاں، مینڈک اور چھپکلیاں شامل تھیں، طلبہ ان کا مطالعہ کرتے۔ ان کے اساتذہ اس موقع پر انہیں ان جانوروں کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتے۔ ولیم کی دلچسپی اس وقت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کی آنکھیں اس جانور پر لگی ہوتیں وہ ایسی بہت سی باتوں پر غور کر رہا ہوتا تھا جو دوسرے طالب علموں کو نظر نہیں آتی تھیں۔ دیگر طالب علم تو صرف لیکچر پر توجہ مرکوز رکھتے تھے مگر ولیم اپنی عادت سے مجبور ہو کر نئے سوال ڈھونڈتا اور پھر ان کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کے ذہن میں ان جانوروں کے جسمانی نظام کے بارے میں کبھی کبھی تو ایسے سوال بھی پیدا ہوتے تھے جن کے جواب اس کے اساتذہ کے پاس بھی نہیں ہوتے تھے۔

اطالوی قصبہ پاڈوا ایک پُرہجوم اور سرگرمیوں سے بھرپور جگہ تھی۔ وہاں چھوٹے چھوٹے بازار لوگوں سے بھرے رہتے جہاں دن بھر روزمرہ اشیا کی خرید وفروخت پورے زور وشور سے جاری رہتی۔ ولیم بھی فارغ اوقات میں بازاروں کے چکر لگاتا لیکن یہاں پر بھی اس نے اپنی جانوروں میں فطری دلچسپی کا عنصر تلاش کر لیا تھا۔ چونکہ یہ قصبہ دریا کے کنارے آباد تھا اس وجہ سے بازاروں میں بھی دریا سے پکڑی گئی تازہ مچھلی کی خرید وفروخت بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔ ولیم کی اصل دلچسپی ان مچھلیوں میں ہی ہوتی تھی۔ اکثر اوقات وہ مچھلی والوں سے تازہ زندہ مچھلی خرید لیتا اور اسے لے کر اپنے کمرے میں یا تجربہ گاہ میں پہنچ جاتا۔ ان زندہ مچھلیوں کا بدن وہ پُراسرار دنیا تھی جس میں ولیم ہاروے کے ذہن میں اٹھنے والے ہزاروں سوالوں کے جواب پوشیدہ تھے۔ زندہ مچھلیوں اور دیگر سمندری جانوروں پر ریسرچ کرتے ہوئے ایک روز اچانک جیسے ایک جھماکا ہوا اور نوجوان ولیم ہاروے نے وہ راز جان لیا جو اس وقت تک دنیا میں کوئی بھی نہ جان پایا تھا۔ زندہ جانوروں کے بدن پر تحقیق کرتے ہوئے اسے معلوم ہوا کہ جانوروں کے جسم میں خون مسلسل گردش میں رہتا ہے اور یہ خون جہاں سے روانہ ہوتا ہے پورے بدن کا چکر لگا کر دوبارہ اسی جگہ پہنچ جاتا ہے۔ ایک بہت اہم نکتہ دریافت کر لینے کی خوشی نے اسے سخت ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا لیکن چونکہ وہ ایک عملی اور اصول پرست انسان تھا اس لیے اس نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔ اس نے خود سے وعدہ کیا کہ جب تک اپنی اس نئی دریافت کے بارے میں وہ خود سو فیصد اطمینان نہیں کر لیتا اس وقت تک کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔ اب ولیم کو اپنی تحقیق کے لیے مضبوط بنیاد مل گئی تھی اس نے خون کی گردش سے متعلق اپنی اس دریافت پر تمام تر توجہ مرکوز کر دی اور اس سلسلے میں اٹھنے والے تمام سوالوں کے جوابات تلاش کرنے کے لیے نئے سرے سے تجربات اور تحقیق میں جت گیا۔

اسی دوران میں یونیورسٹی میں ولیم کا تعلیمی کیریئر مکمل ہو گیا اور وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس برطانیہ روانہ ہو گیا۔ ولیم کو اب طب میں ایک مستند ڈگری مل چکی تھی۔ برطانیہ آکر اس نے طب کی پریکٹس کے لیے حکومت سے اجازت نامہ حاصل کیا اور بھرپور عملی کام کا آغاز کر دیا۔ اس نے ایک رحم دل، قابل اور کامیاب ڈاکٹر کے طور پر اپنا نام بنانا شروع کر دیا۔ اس کا رویہ اپنے مریضوں سے بہت دوستانہ اور مشفقانہ ہوتا تھا۔ مریض کی آدھی تکلیف تو اس کے ہلکے پھلکے اور پُراُمید انداز گفتگو سے ہی دور ہو جاتی تھی۔ جلد ہی اس کا شمار شہر کے مشہور اور قابل ڈاکٹروں میں ہونے لگا۔ اب اس کے پاس کالج آف فزیشن کی رکنیت بھی تھی۔ کچھ عرصے بعد اس کو معیاری اور مشہور بارتھولومیو اسپتال میں تقرری مل گئی۔

اسپتال کی ملازمت کے دوران میں بھی ولیم کے کردار کی خوبیاں نمایاں رہیں۔ ہر صبح سویرے سب سے پہلے ولیم اسپتال کے وارڈز کا دورہ کرتا۔ مریضوں سے دوستانہ انداز میں گفتگو کرتا۔ ان کی تکالیف کے بارے میں سوال جواب کرتا۔ اس کی باتیں بہت اُمید افزا ہوتیں جس سے مریضوں کے دل میں بھی بیماری کے خلاف جدوجہد

کرنے اور صحت مند ہونے کی خواہش مضبوط ہو جاتی۔ اس کے مریض اسے بہت پسند کرتے تھے، اس پر مکمل بھروسا کرتے تھے۔ پھر وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ یہاں اس کے ماتحت ڈاکٹرز اور طب کے طالب علم اس کے منتظر تھے۔ ان کے ساتھ مل کر مریضوں کی کیفیات، ان کی بیماریوں اور علاج کے طریقوں پر غور کیا جاتا۔ وہ اپنے ساتھیوں اور طالب علموں کے سوالات کے جواب دیتا۔ علاج کے بارے میں مفید مشورے دیتا۔

اب ولیم ایک بھرپور جوان مرد تھا۔ اس کے پاس طب کی ڈگری تھی۔ وہ ملک کے معروف اسپتال میں کام کر رہا تھا۔ اس کا شمار قابل اور مستند ڈاکٹروں میں ہونے لگا تھا۔ ولیم کی توجہ اب زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی طرف بھی گئی۔ اس نے اب تک بڑی صاف ستھری اور پروقار زندگی گزاری تھی۔ اب اس نے زندگی کا ایک اور اہم فیصلہ کیا۔ شادی کرنے کے لیے اس کی نظر اپنے ہی ایک ساتھی ڈاکٹر کی بیٹی پر پڑی۔ لینسلوٹ براؤن خود بھی ایک مشہور ڈاکٹر تھا اور اس وقت انگلینڈ کے بادشاہ جیمس اول کا معالج بھی تھا۔ اس کی نوجوان بیٹی الزبتھ براؤن تھی۔ ولیم مختلف تقریبات میں ڈاکٹر براؤن سے ملتا رہتا تھا اور عام طور پر اس موقع پر اس کی بیٹی الزبتھ بھی اس کے ساتھ ہوتی۔ وہ ایک پڑھی لکھی اور خوبصورت لڑکی تھی۔ ولیم کی اس سے اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔ جلد ہی ولیم کو احساس ہوا کہ وہ الزبتھ کو کچھ زیادہ ہی پسند کرنے لگا ہے۔ ایک تقریب کے دوران اس نے الزبتھ سے ملاقات کے لیے وقت مانگا۔ اس ملاقات میں ہی ولیم نے الزبتھ کے سامنے شادی کی تجویز رکھ دی۔ وہ خود بھی ولیم کو پسند کرنے لگی تھی لہٰذا اس نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی اور ہاں کر دی۔ یوں دونوں جلد ہی شادی کے خوش گوار بندھن میں بندھ گئے۔

شادی کے بعد ولیم نے اپنے کالج آف فزیشن کے قریب ہی گھر لے لیا اور ایک بھرپور زندگی کا آغاز کیا۔ زندگی کے دیگر میدانوں کی طرح تقدیر نے یہاں بھی ولیم کا ساتھ دیا اور اس کی بیوی الزبتھ نے اپنے کردار و عمل سے خود کو ایک کامیاب بیوی اور ولیم کے انتخاب کو درست ثابت کر دیا۔ الزبتھ ایک سمجھدار لڑکی تھی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی اس نے اس حقیقت کو قبول کر لیا کہ ولیم ایک مصروف آدمی ہے اور اپنی طبی ذمے داریوں کے بعد وہ جو کچھ بھی تحقیقی کام کرتا ہے اس میں پوری انسانیت کا فائدہ ہے۔ اسی وجہ سے الزبتھ نے اپنے شوہر کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کا ہمیشہ خیال رکھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی باتوں کو لڑنے جھگڑنے یا مسئلہ بنانے کے بجائے اس کو قبول کرنا شروع کر دیا۔ ایک اچھی اور کامیاب بیوی کا کردار ادا کرتے ہوئے گھر کے تمام مسائل سے ولیم کو آزاد کر دیا۔ ولیم کا کام اپنی طبی ذمے داریاں اور تحقیقی کام کرنا رہ گیا۔ اکثر وہ رات رات بھر اپنی تجربہ گاہ میں گزار دیتا اور اسے احساس تک نہ ہوتا۔ اس موقع پر الزبتھ اس کے کھانے پینے کا مکمل خیال رکھتی، چڑنے یا جھگڑا کرنے کے بجائے وہ اس کی تھکن دور کرنے کے طریقے تلاش کرتی تاکہ ولیم تازہ دم ہو کر دوبارہ بہتر انداز میں اپنا کام کر سکے۔

ولیم اپنی تحقیق کے نتیجے میں جو کچھ جان پاتا اور جو کچھ کتابوں میں پڑھتا ان سب کے ذریعے لیکچر تیار کرتا۔ وہ اپنے تحقیقی کام کے بارے میں بھی اکثر اپنے طلبہ اور ساتھیوں سے بات چیت کرتا نظر آتا۔ وہ ایک اچھا اور کامیاب استاد بھی تھا۔ اس کے تیار کردہ لیکچر موضوع کے اعتبار سے مکمل اور بھرپور ہوتے۔ ان لیکچرز کی تیاری میں وہ پوری دیانت داری اور محنت سے کام کرتا۔ وہ جو لیکچر تیار کرتا وہ صرف زبانی سنا دینے یا بتا دینے تک محدود نہیں ہوتے تھے بلکہ اکثر وہ بات کی وضاحت کے لیے عملی مظاہرے بھی کرتا۔ وہ طلبہ کو جس چیز کے بارے میں بتاتا اس کو عملی طور پر ثابت کر کے دکھاتا تھا۔ وہ بار بار اپنی بات کو دہراتا، ہاتھ کے اشاروں سے بات کو سمجھانے کی کوشش کرتا۔ اس کی دلچسپی اور انہماک کو دیکھ کر ہی سننے والے بھی اس کے ساتھ علم و تحقیق کی وادیوں میں گم ہو جاتے اور یوں ایک ایسا عملی ماحول بن جاتا جہاں ہر شخص کچھ نہ کچھ کام کی باتیں جان کر وہاں سے ہٹتا تھا۔

ان تمام برسوں کے دوران میں ولیم اپنی طبی ذمے داریوں کو بھی پورا کرتا رہا اور اپنی دلچسپی کے اصل میدان اور اہم دریافت "خون کی گردش" کے بارے میں بھی مسلسل تحقیقی کام کرنے میں مصروف رہا۔ اس نے مختلف جانوروں پر اپنے تجربات جاری رکھے۔ یہ تجربات ہر روز نئے انکشافات کرتے تھے جن سے اسے "خون کی گردش" کے پرانے نظریات غلط ثابت ہوتے نظر آ رہے تھے۔ اگرچہ وہ اس میدان میں کافی تحقیقی کام کر چکا تھا مگر ابھی تک اس نے اپنے کام کو باقاعدہ طور پر دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنی اس تھیوری کے حوالے سے کوئی دعویٰ بھی نہیں

کیا اور نہ ہی کہیں کوئی چیز چھپائی۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ تمام وقت وہ اپنے ساتھی ڈاکٹروں، اپنے ماتحتوں اور طلبا سے اپنی تحقیق کے بارے میں مسلسل گفتگو کرتا رہتا تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر انسان کو اس کی مرضی اور پسند کے مطابق کام کرنے کو مل جائے تو اس کی کارکردگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کچھ اسی قسم کی صورت حال ولیم ہاروے کے ساتھ بھی تھی۔ اس کی دلچسپی کا شعبہ طب اور جانوروں کے بارے میں ریسرچ تھی۔ اس نے انہی دونوں راستوں کا انتخاب کیا تھا لہٰذا گھنٹوں کے حساب سے کام کرنے کے باوجود اسے تھکن کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک محنتی انسان تھا۔ ہفتوں کی تحقیق اور محنت کے بعد جب وہ کوئی نیا نکتہ دریافت کر لیتا تو اس کی ساری تھکن دور ہو جاتی۔

کالج یونیورسٹی کی حد تک تو اس نے اپنے تعلیمی اداروں کی تجربہ گاہوں سے استفادہ کیا تھا۔ اب جب اس نے اپنا گھر آباد کر لیا تو اپنے گھر میں ہی ایک بڑا کمرا تجربہ گاہ کے طور پر مخصوص کر لیا۔ اس کی بیوی، دوست اور جان پہچان والے اس کمرے کو "ہاروے کا میوزیم" کہنے لگے۔ اس کا بڑا سا کمرا طرح طرح کی بوتلوں، شیشے کے مرتبانوں اور ٹوکریوں سے بھرا پڑا تھا۔ دیوار پر بڑے بڑے شیلف تھے جو درجنوں مزید بوتلوں اور مرتبانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ یہاں زیادہ تعداد زندہ جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کی تھی۔ کمرے میں چھپکلیاں، مینڈک طرح طرح کی چھوٹی بڑی مچھلیاں، کیکڑے، قسم قسم کے چھوٹے سمندری جانور، خاص قسم کے پانی کے سانپ وغیرہ بڑی تعداد میں موجود تھے۔ وہ روزانہ چند گھنٹے اس کمرے میں ضرور گزارتا۔ ان جانوروں کے کھانے پینے اور خوراک وغیرہ کا خیال رکھتا اور ان پر تجربات بھی کرتا رہتا تھا۔

ڈاکٹر ولیم ہاروے بنیادی طور پر ایک رحم دل انسان تھا جو کسی بھی زندہ مخلوق کو بلاوجہ تکلیف دینا گوارا نہیں کرتا تھا لیکن وہ ساتھ ہی ایک ڈاکٹر بھی تھا جو لوگ طب کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، انہیں انسانی جسم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لیے لاشوں کی چیر پھاڑ کرنا پڑتی ہے۔ ایسا کرنا ان کی مجبوری ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو انسانی جسم کی ساخت کے بارے میں درست معلومات حاصل نہیں کر سکیں گے۔ یہ سب ان کی تعلیم کا حصہ ہے۔ آج کل تو طب کے طالب علموں کو بڑی تعداد میں لاوارث لاشیں مل جاتی ہیں جن کا وہ پوسٹ مارٹم کرتے ہیں لیکن ان دنوں جب ولیم ہاروے طب کی تعلیم اور ریسرچ کے کام میں مشغول تھا، یہ آسان کام نہ تھا۔ مختلف جیل خانوں سے سزائے موت پانے والے خطرناک مجرموں کی لاشیں ہی طب کے طالب علموں کو پوسٹ مارٹم کے لیے مل پاتی تھیں۔ یہ لوگ زیادہ تر صحت مند اور تندرست ہوتے تھے۔ اپنے جرائم کے باعث پھانسی پانے والے یہ مجرم بالکل فٹ ہوتے تھے۔ انہیں کوئی بیماری لاحق نہیں ہوتی تھی جبکہ ولیم کو اپنے تجربات کے لیے ایسی لاشوں کی ضرورت تھی جن کی موت کسی بیماری کی وجہ سے ہوئی ہو۔ ولیم نے سوچنا شروع کیا کوئی ایسی ترکیب ہو جائے کہ بیماری سے ہلاک ہونے والوں کی لاشیں مل جائیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کسی بیماری سے ہلاک ہونے والے کو اس کے خاندان والے خاموشی سے دفنا دیا کرتے تھے۔ یہ بات ان کے لیے ناقابلِ قبول ہوتی کہ ان کے عزیز کی لاش کسی تحقیق وغیرہ کے سلسلے میں ایسے ڈاکٹروں کے حوالے کر دی جائے جو ان کے عزیز کی لاش کو عجیب و غریب تجربات کے ذریعے بگاڑیں۔ ولیم نے اپنی تمام توجہ ایسی لاشوں کے حصول پر مرکوز کر دی۔ آخر کار اس کے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔ اس نے سب سے پہلے اپنی تجویز دو قریب ترین اور قابل بھروسا ساتھیوں کے سامنے رکھی۔ یہ ایک خطرناک اور غیر قانونی کام تھا۔ اس کے دونوں ساتھی ابتدا میں تو خوف زدہ ہو گئے اور انہوں نے ولیم کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا لیکن ولیم نے اپنی باتوں اور دلائل سے انہیں قائل کر لیا اور یوں تینوں نے مل کر اپنی ضرورت کے لحاظ سے لاشوں کا حصول ممکن بنا لیا۔

ولیم ہاروے کی تجویز عجیب و غریب تھی۔ وہ ایک ڈاکٹر تھا اور اسپتال میں کام بھی کرتا تھا۔ اس نے ایسے مردوں یا عورتوں پر نظر رکھنی شروع کر دی جو اس کے قصبے سے تعلق رکھتے تھے اور شدید بیماری کی وجہ سے یا تو اسپتال میں داخل تھے یا علاج کی غرض سے اسپتال آتے جاتے رہتے تھے۔ جب بھی ایسے کسی مرد یا عورت کا انتقال ہو جاتا اور اس کے گھر والے اس کی تدفین سے فارغ ہو جاتے تو اسی رات ولیم اپنے دونوں قابلِ اعتماد ساتھیوں کو لے کر خاموشی سے قبرستان پہنچ جاتا۔ وہ اپنے ساتھ ضروری اوزار لے جاتے، مرنے والے کی قبر کھود کر اس کی لاش نکال لیتے اور ولیم اس کو اپنی خفیہ لیبارٹری میں لے جاتا جہاں کسی اور کے جانے کا امکان نہیں تھا۔ قبر کی کھدائی ایک مشکل کام تھا۔ ایک تو رات کا گھپ اندھیرا، پھر سناٹا جس میں زیادہ شور کسی کو

urdunovels.com

بھی مجبور کرسکتا تھا، پکڑے جانے کی صورت میں ولیم جیسے باعزت اور اعلیٰ عہدے دار کی بے پناہ رسوائی ہوتی لیکن ولیم اپنی تحقیقات کے سلسلے میں اس قدر سنجیدہ تھا کہ وہ ہر قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس جیسے سائنس دان کو ایسا کام کرنے کا حق حاصل ہے۔ وہ کہتا تھا، اس غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام میں ساری انسانیت کا فائدہ پوشیدہ ہے۔ ان لاشوں پر تحقیق انسانی زندگی کو بچانے میں اہم کردار ادا کرسکتی تھی لہٰذا آنے والی انسانی زندگیوں کو بچانے کے لیے ایسے چند جسموں کی چیر پھاڑ بالکل جائز ہے جن کے بدن سے روح کا رشتہ ٹوٹ چکا ہو۔

1628 وہ سال تھا جب ولیم ہاروے کی عمر 50 سال ہو چکی تھی اور اسی سال اس نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "موشن آف دی ہارٹ اینڈ بلڈ" شائع کی۔ اس کتاب نے پورے یورپ میں تہلکہ مچا دیا۔ کتاب کے ساتھ ساتھ ولیم ہاروے کو بھی پورے یورپ میں شہرت ملی۔

ولیم کی اس کتاب نے انسانی دل اور خون کے بارے میں اس وقت کے تمام نظریات کو غلط ثابت کردیا۔ اب تک انسانی دل اور خون کے بارے میں رائج گیلن کی تھیوری کو درست سمجھا جاتا تھا جس میں کہا جاتا تھا کہ انسانی جسم میں موجود خون جگر سے نکل کر تمام رگوں میں جاتا ہے لیکن ولیم نے اپنی کتاب میں اس اصول کو غلط قرار دیا۔ اس نے اپنی کتاب میں ثابت کیا کہ خون کی گردش شروع ہونے کا اصل مقام دل ہے، جگر نہیں۔ دل سے خون نکل کر تمام بدن میں داخل ہوتا ہے۔ انسان کے جسم میں موجود شریانیں اور وریدیں سارے جسم سے خون کو دل تک لاتی اور اسے لے جاتی ہیں۔ ان میں مرکزی مقام دل کو حاصل ہوتا ہے اور یہ سارا نظام جگر سے نہیں چلتا۔ دل ہی وہ مرکز ہے جہاں سے شریانوں کے اندر موجود ٹیوب خون کو لے کر روانہ ہوتی ہیں اور جسم کے ہر حصے تک پہنچاتی ہیں اور وریدیں وہ راستے ہیں جہاں سے خون واپس دل کی طرف آتا ہے۔ ولیم سے پہلے کسی کو بھی اس تھیوری کے بارے میں علم نہیں تھا۔ ولیم پہلا شخص ہے جس نے اپنی کتاب میں دلائل سے یہ بات بیان کی کہ خون کا دل سے جسم کے تمام حصوں تک جانا اور پھر اس کا واپس اسی مقام یعنی دل تک آنا ایک ایسا چکر ہے جو مسلسل انسانی جسم میں چلتا رہتا ہے اور اس کا تمام تر انحصار دل کے اوپر ہے۔ اپنی کتاب میں ولیم نے تفصیل سے ان تجربات کا ذکر کیا جو اس نے مختلف جانوروں کے اوپر کیے۔ ان میں

ایک سادہ طبع نوجوان کی کہانی...... جو نا مساعد حالات کی طنابیں گرفت میں رکھنا جانتا تھا۔

وادی مہران کے ایک دور دراز خطے سے جس کا تعلق تھا......

ایک پُراسرار واقعے نے اس کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا

جانگلی

جس میں محبت کی دیوانگی بھی ہے اور نفرتوں و عداوتوں کے دہکتے انگارے بھی۔

بہت جلد... سسپنس کے صفحات کی زینت

تھے، سور، مینڈک، مچھلیاں، مختلف کیڑے اور سانپ شامل تھے۔ اس نے ان تمام جانوروں پر کیے جانے والے تجربات کی تفصیل بیان کی اور اپنی تھیوری کے درست ہونے کے بارے میں مضبوط دلائل اور ثبوت پیش کیے۔

ہر کامیابی کے اپنے مسائل بھی ہوتے ہیں۔ ولیم کی تھیوری اس وقت کے لحاظ سے ایک حیرت انگیز دریافت تھی۔ اس کی دریافت نے اس وقت موجود خون کی گردش سے متعلق تمام نظریات کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے ولیم کو زبردست شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ اس کی شہرت سے جہاں خوش ہونے والے بڑی تعداد میں تھے، وہاں حسد کرنے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ انہوں نے خون کی گردش کی تھیوری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ولیم کے اوپر دباؤ ڈالا گیا، اس کو جھوٹا اور فریبی کہا گیا۔ اس کے بعض ساتھی ہی اس کے خلاف ہو گئے اور انہوں نے ولیم کو تنگ کرنا شروع کر دیا کہ وہ اپنی تھیوری کو خود ہی غلط تسلیم کر لے، لیکن ولیم کی یہ تھیوری اس کی برسوں کی محنت کا نچوڑ تھی وہ بھلا کیسے پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ ہر قسم کی مخالفت کے باوجود وہ اپنی تھیوری پر ڈٹا رہا اور آخر کار اپنی بات منوانے میں کامیاب بھی ہو گیا۔

سچ ہے صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ ولیم نے شروع میں ہی اپنی اس تھیوری کو جان لیا تھا لیکن وہ صبر سے اس کو درست ثابت کرنے کے لیے ایک طویل عرصے تک مختلف تجربات میں مصروف رہا۔ اس کی ان تحقیقات کا زمانہ چند ماہ یا سال تک محدود نہیں تھا۔ اس نے کئی دہائیاں اپنے نظریات کو درست ثابت کرنے کے لیے صرف کر دیں اور جب اس کو سو فیصد یقین ہو گیا کہ جو کچھ اس نے جانا ہے، وہی حقیقت ہے تو اس نے اپنی اس دریافت کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اس کی کتاب کے منظر عام پر آتے ہی تعریف و تنقید کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کو شہرت کے ساتھ ساتھ مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا مگر یہاں بھی اس نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور مسلسل اپنی گردش خون کی تھیوری کے درست ہونے پر اصرار کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس کے دلائل اور ثبوت اس کو سچا ثابت کرنے میں کامیاب رہے اور اس کو لہو کی گردش کے میدان کا کولمبس مان لیا گیا۔ اس کی تھیوری کی اس قدر اہمیت کا سبب یہ ہے کہ بیماریوں کے علاج کا دارومدار انسانی جسم کی ساخت اور اس کے اندر موجود دوران خون کے درست جاننے اور طریقے کے تعین پر ہی ہے۔ ڈاکٹر کو جب تک انسانی جسم کے کام کرنے کے بنیادی طریقے کا ہی علم نہ ہو تو وہ جسم میں پیدا ہونے والی خرابی کس طرح دور کر سکتا ہے۔

زندگی ہی اتار چڑھاؤ اور نشیب و فراز کا نام ہے۔ کامیابی اور ناکامی زندگی میں ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے۔ ولیم کا شمار اگرچہ دنیا کے کامیاب ترین لوگوں میں ہوتا تھا مگر ایک تکلیف دہ ناکامی اس کی زندگی کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہی۔ اس نے محبت کی شادی کی تھی جو کامیاب بھی رہی مگر دونوں میاں بیوی اولاد سے محروم رہے۔ اولاد نہ ہونے کا افسوس ولیم اور اس کی بیوی دونوں کو تھا۔ ولیم کی مصروفیات اتنی تھیں کہ وہ خود کو ہر وقت مصروف رکھ کر بچوں کی کمی کے احساس کو دبانے میں کامیاب ہو جاتا تھا لیکن اس کی بیوی کو بچوں کے نہ ہونے کی وجہ سے گھر کی تنہائی بہت ناگوار گزرتی تھی۔ بالآخر اس نے اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے ایک خوب صورت طوطا پال لیا۔ ان کا طوطا چھوٹا سا اور چمک دار رنگوں والا تھا۔ ولیم بیوی کے شوق کو دیکھتے ہوئے خود بھی طوطے میں دلچسپی کا اظہار کرتا۔ دونوں نے مل کر طوطے کو بولنا سکھایا۔ رفتہ رفتہ وہ چھوٹے چھوٹے کئی جملے بولنے لگا۔ اس طرح اس گھر میں جو بچوں کی آوازوں سے محروم تھا ایک طوطے کے بولنے کی آواز گونجنے لگی۔

کچھ عرصے کے بعد ولیم انگلینڈ کے بادشاہ چارلس اول کا ذاتی معالج بن گیا۔ جلد ہی دونوں میں معالج اور مریض کے رشتے سے زیادہ دوستی ہو گئی۔ وہ دونوں گہرے دوستوں کی طرح رہنے لگے۔ ان تعلقات کا فائدہ یہ ہوا کہ ولیم نے دنیا بھر کی سیر کر ڈالی۔ بادشاہ جہاں بھی جاتا، ولیم کو اپنے ساتھ لے جاتا۔ بادشاہ سے دوستی کے بعد ولیم نے بڑی بھرپور زندگی گزاری۔ وہ شکار پر بھی بادشاہ کے ساتھ جاتا۔ محل میں ہونے والی پارٹیوں میں ولیم کی شرکت یقینی تھی۔ رقص کے پروگرام میں بادشاہ اسے ضرور مدعو کرتا۔ وہ عمدہ کھانا کھانے کا دل دادہ تھا، بادشاہ کی پارٹیوں میں اسے عمدہ کھانے اور اعلیٰ شراب وافر مقدار میں ملتی۔ یوں شاہی معالج ہونے اور بادشاہ سے دوستی ہونے کی وجہ سے ولیم کی زندگی میں گہما گہمی آ گئی۔ وہ بہت زیادہ سفر کرتا، مختلف ملکوں اور شہروں کی سیر کرتا تھا۔

ایک مرتبہ اسے سفیر کی حیثیت سے آسٹریا کے دارالحکومت ویانا بھی بھیجا گیا جہاں اس نے اپنی ذمے داریاں پوری دیانت داری سے ادا کیں۔ دیس دیس کی اس سیاحت کے دوران میں بھی ولیم کو کوئی نہ کوئی چیز مل جاتی۔

اگر راستے میں اس کو مختلف قسم کے پھول پودے اور درخت نظر آتے جو اس نے پہلے نہ دیکھے ہوں تو وہ وہیں رک جاتا۔ اپنے ساتھیوں سے کہہ دیتا کہ وہ آگے روانہ ہو جائیں۔ وہ راستے میں آنے والی نئی نئی چیزوں پر غور کرتا، خاص خاص باتیں اپنی نوٹ بک میں لکھتا جاتا۔ کچھ نمونے اپنے سامان کے بیگ میں ڈال لیتا اور اس قدر انہماک سے اپنے کام میں لگ جاتا کہ اسے وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہ رہتا۔ عام طور پر آگے چلے جانے والے اس کے دیگر ساتھی اپنے ملازمین کو واپس بھیج کر ولیم ہاروے کو بلواتے۔ ایک بار وہ بادشاہ کے ساتھ اسکاٹ لینڈ بھی گیا۔ اسکاٹ لینڈ کے مشرقی ساحل پر ایک چھوٹا سا جزیرہ "باس راک" کے نام سے مشہور ہے۔ ولیم کچھ عرصے یہاں مقیم رہا۔ ولیم کے خون میں جستجو اور تحقیق رچی بسی تھی، وہ ہر جگہ مظاہر قدرت پر غور کرتا اور تحقیق میں جت جاتا۔ خون کی گردش کی تھیوری کے بعد اس نے پھولوں، پودوں اور درختوں کی مختلف اقسام پر تحقیق شروع کر دی۔ اس جزیرے پر ہزاروں اقسام کے پرندے تھے۔ یہاں پر ولیم نے پرندوں کو ہی اپنی ریسرچ کا موضوع بنالیا۔ اس نے پرندوں میں انڈے دیکھے، انڈے کے اندر بچے بننے اور اس کے باہر نکلنے کو بنیاد بنا کر تحقیق شروع کر دی۔

لندن واپس آنے کے بعد بھی ولیم نے اپنی تحقیق کو جاری رکھا۔ اب اس کی تمام تر توجہ اس بات پر مرکوز ہو گئی کہ انڈوں کے اندر بچے کس طرح بن جاتے ہیں۔ جب مادہ پرندہ انڈے کے اوپر ایک خاص مدت تک بیٹھتا ہے تو کسی عمل کے تحت اس میں سے بچہ نکل آتا ہے۔ اب اس نے انڈے میں بچہ بننے کے تمام مراحل کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیا۔ پرندوں اور انڈے میں اس کی دلچسپی کو ولیم کے دوست اور انگلینڈ کے بادشاہ چارلس اوّل نے بھی محسوس کر لیا لہٰذا اس نے اپنے دوست کو زیادہ سے زیادہ سہولت فراہم کرنے کے لیے ہرنوں کے شاہی باغ کا کنٹرول ولیم کے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ ایک وسیع باغ تھا۔ یہاں پر بادشاہ اور شاہی محل کے دیگر افراد کی تفریح اور سکون کے لیے جانوروں اور بالخصوص ہرنوں کی بہت سی اقسام موجود تھیں۔ اب ولیم کا زیادہ تر وقت اسی باغ میں گزرنے لگا۔ اس نے ہرنوں کے اوپر بہت سے تجربات کیے۔ ان سے حاصل ہونے والے نتائج کو وہ اپنے پاس نوٹ کرتا جاتا۔ اس کے تجربات اور ان کے نتائج انسانی جسم کو سمجھنے اور اس کے بارے میں زیادہ بہتر طور پر جاننے میں بڑی مدد فراہم کر سکتے تھے۔

1639ء سے 1646ء تک کے سال ولیم اور اس کے ملک دونوں کے لیے تکلیف دہ اور پریشان کن ثابت ہوئے۔ اس تمام عرصے میں ولیم کے کئی عزیزوں کی موت کا صدمہ بھی ولیم کو برداشت کرنا پڑا۔ ملکی سطح پر خراب حالات کا اندازہ انگلینڈ میں ہونے والی خانہ جنگی کی کیفیت سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس وقت انگلینڈ پر بادشاہ چارلس تخت نشین تھا مگر ساتھ ساتھ پارلیمانی نظام حکومت بھی چل رہا تھا۔ بدقسمتی سے بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان اختلافات شدید ہونے لگے اور اس حد تک بڑھ گئے کہ ملک واضح طور پر دو حصوں میں بٹ گیا۔ آدھے لوگ بادشاہ کے حق میں تھے اور آدھے عوام پارلیمنٹ کے ساتھ تھے۔ رفتہ رفتہ ان دونوں میں جنگی کیفیت پیدا ہو گئی اور یوں انگلینڈ خانہ جنگی کا شکار ہو گیا۔ جنگ تو یوں بھی ایک ایسی حالت کا نام ہے جو اپنے ساتھ تباہی اور بربادی لاتی ہے۔ یہ جنگ دو مختلف قوموں اور ملکوں کے درمیان لڑی جائے تب بھی جنگ کا مطلب لازمی تباہی ہوتا ہے۔ ہزاروں انسان جنگ کی تباہ کاریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سالوں تک جنگ سے متاثرہ ملک جنگ کے نتیجے میں ہونے والے نقصانات سے سنبھل نہیں پاتے لیکن یہ جنگ اس صورت میں اور بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوتی ہے جب کسی ایک ہی ملک میں رہنے والے باشندے ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہو جائیں۔ برطانیہ کو اس وقت اس جنگ کی تباہ کن صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ جنگ کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہوا کرتی۔ مسائل آخرکار آپس میں بات چیت اور مذاکرات کے ذریعے ہی حل کیے جاتے ہیں۔ یہ اصول ساری دنیا کو معلوم ہے لیکن اس کے باوجود انسان خود کو جنگ کے دوزخ میں جھونک دیتے ہیں۔

ولیم بھی جنگ سے نفرت کرنے والوں میں شامل تھا۔ وہ جنگ کی تباہ کاریوں سے پریشان تھا۔ اسی وجہ سے اس جنگ میں جو اس کے ملک میں چل رہی تھی، وہ کسی قسم کا کردار ادا نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن بعض اوقات انسان کو اپنی مرضی کے خلاف بھی کام کرنا پڑتا ہے، ایسا ہی ولیم کے ساتھ ہوا۔ اگرچہ وہ خود کو غیر جانب دار سمجھتا تھا لیکن وہ بادشاہ کا بہترین دوست اور معالج رہا تھا۔ ایسے برے حالات میں وہ اپنے دوست سے کنارہ کش بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ لوگ جو پارلیمنٹ کے حامی اور بادشاہ کے دشمن ہو گئے تھے وہ بادشاہ کے ہر دوست اور ساتھی کو اپنا دشمن خیال کرتے تھے۔ یوں نہ چاہتے ہوئے بھی ولیم اس جنگ میں

شامل ہو گیا تھا۔
خانہ جنگی کے دوران میں بڑی تعداد میں لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے۔ ان میں بادشاہ کے حامی بھی تھے اور مخالفین بھی۔ جنگ کے دوران میں ہی شاہی محل کی طرف سے ولیم کو دو چھوٹے شہزادوں کا سرپرست مقرر کیا گیا۔ ان کی حفاظت اور دیکھ بھال کی ذمے داری ولیم کے سر آ گئی۔ ولیم ان کو محل سے لے کر اپنے گھر آ گیا۔ جنگ کے دوران میں زخمی ہونے والوں کو مرہم پٹی کی ضرورت بھی ہوتی تھی۔ ملک کے حالات انتہائی خراب ہو گئے تھے۔ ولیم کو بڑی تعداد میں زخمی افراد کی دیکھ بھال کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس نے ان دونوں شہزادوں کے ساتھ مل کر جنہیں اس کی سرپرستی میں دیا گیا تھا، زخمیوں کی مرہم پٹی کا کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ خود ایک بہترین ڈاکٹر تھا۔ اس نے ان چھوٹے لڑکوں کو لازمی طبی خدمات سکھائیں اور یوں جنگ میں زخمی ہونے والوں کو مناسب طبی امداد پہنچانے کا بندوبست ہو گیا لیکن اس عرصے کے دوران میں ولیم اپنے دوست یعنی بادشاہ چارلس کی طرف سے مسلسل پریشانی کا شکار رہا۔ بادشاہ جنگ کے مرکزی مقام پر موجود تھا اور اس کی خیریت کی کوئی اطلاع بھی ولیم کو نہیں مل رہی تھی۔ اپنے دوست کی مدد کرنے کا بھی کوئی طریقہ ولیم کے پاس نہیں تھا سوائے اس کے کہ جنگ میں زخمی ہونے والے بادشاہ کے سپاہیوں کو بہتر علاج معالجے کی سہولیات فراہم کرے تاکہ بادشاہ کی افواج کو افرادی قوت کی کمی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

بادشاہ چارلس نے یہ جنگ جیت لی۔ اس نے آکسفورڈ شہر میں داخل ہو کر اس پر قبضہ حاصل کر لیا اور یہاں پر اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کر لیا۔ ملک کے حالات کچھ پُر سکون ہو گئے اور آکسفورڈ میں تو زندگی رفتہ رفتہ معمول پر آ گئی۔ ولیم نے دوبارہ تعلیم و تحقیق کا سفر شروع کیا۔ اس کے بہت سے تحقیقی منصوبے جو جنگ کی وجہ سے ادھورے رہ گئے تھے دوبارہ شروع ہو گئے۔ علمی سرگرمیوں کا آغاز ہو گیا۔ آکسفورڈ میں اس کا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑا جو اس کے ساتھ کاموں سے واقف تھے۔ وہ ولیم ہاروے کی عزت کرتے تھے اس کے کام کو پسند کرتے تھے۔ جب انسان اپنے پسندیدہ لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے تو اس کی کارکردگی بھی بہتر ہو جاتی ہے اور راستے کی مشکلات پر قابو پانا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ آکسفورڈ میں کام کا آغاز کرتے وقت ولیم کو ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

جنگ کی تباہیوں کے بعد وہ نئے سرے سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر تحقیقی کاموں میں جت گیا۔ اس کو آکسفورڈ میں مرٹن کالج کا وارڈن مقرر کر دیا گیا۔ اب حالات پُر سکون ہو چکے تھے۔ زندگی دوبارہ اپنے معمولات کی طرف لوٹ رہی تھی۔

آنے والا وقت کیسا ہوگا یہ انسان کبھی نہیں جان سکتا۔ انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ بادشاہ چارلس ولیم اور ان کے حامی آکسفورڈ میں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کر کے پُر سکون ہوئے ہی تھے کہ پریشانی دوبارہ ان کے دروازے پر آن کھڑی ہوئی۔ بادشاہ کے مخالفین یعنی پارلیمنٹ کے حامی جلد ہی آکسفورڈ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بادشاہ ناکام ہو کر ایک عام ملازم کے بھیس میں اپنی جان بچا کر آکسفورڈ سے فرار ہو گیا۔ مگر اس کی قسمت نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ ہر طرف اس کی تلاش شروع کر دی گئی۔ دشمن اس کو معاف کرنے پر تیار نہ تھا۔ جلد ہی بادشاہ کے دشمنوں نے اس کو ڈھونڈ نکالا۔ اس کو گرفتار کر کے لایا گیا اور کچھ عرصے بعد ہی بادشاہ کو پھانسی دے دی گئی۔ ولیم ہاروے کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ وہ بادشاہ کا ایک عرصے تک معالج رہا تھا۔ بادشاہ کی حیثیت ولیم کے لیے ایک بہت اچھے ذاتی دوست کی بھی تھی۔ ولیم کو بادشاہ کی موت کا شدید دکھ پہنچا۔ اس نے مرٹن کالج سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ تمام سال جو خانہ جنگی، بادشاہ کے زوال اور اس کی پھانسی پر محیط تھے ولیم کے لیے انتہائی دکھ اور تکلیف کے سال تھے۔

1578ء میں پیدا ہونے والا وہ بچہ جو ایک مشہور، کامیاب اور ذہین سائنس دان کے طور پر دنیا کے سامنے آیا تھا۔ 1646ء میں ایک عمر رسیدہ، اداس، تنہا اور بیمار شخص بن چکا تھا۔ اس کے بہترین دوست بادشاہ چارلس کو پھانسی دی جا چکی تھی۔ اس کی محبوب بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے بھائیوں میں سے تین بھائی بھی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اس کے پاس بڑھاپے کا کوئی سہارا نہ تھا۔ اس کو جوڑوں کے درد کی بیماری بھی لاحق ہو چکی تھی۔ ولیم نے بڑی بھرپور زندگی گزاری تھی، بہت محنت کی تھی، بڑا تحقیقی و تعلیمی سفر طے کیا تھا۔ عمر کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت اور سفر میں گزارا تھا مگر اب بڑھتی ہوئی عمر اور بیماری نے اس کی سرگرمیوں کو محدود کر دیا تھا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ولیم کو ایک بیماری نے آ لیا تھا جس نے اس کے چلنے

پھرنے کو بھی محدود کر دیا تھا۔ اس بیماری کی وجہ سے اس کے ٹخنے، پاؤں کے انگوٹھے پنڈلیاں گھٹنے اور انگلیاں سوجی رہتی تھیں اور ان میں شدید درد بھی ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے چلنے پھرنے میں اس کو بہت تکلیف ہوتی تھی لیکن ولیم نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے خود کو اپنی تجربہ گاہ تک محدود کر لیا۔ یوں بھی تجربہ گاہ ولیم کے لیے ہمیشہ سے ایک دلچسپ جگہ رہی تھی۔

اب وہ اپنے بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ بیماری کی وجہ سے اس کا چلنا پھرنا محدود ہو گیا تھا لیکن دماغی طور پر وہ اب بھی بہت مستعد تھا۔ اس نے خانہ جنگی سے پہلے اور پھر اس کے بعد جانوروں میں نظام تولید اور پرندوں کے انڈوں میں بچہ بننے کے کام پر خاصہ تحقیقی مواد اکٹھا کر لیا تھا۔ اب اس نے نئے سرے سے اس تحقیقی کام کو شروع کیا۔ جانوروں کے بارے میں اس نے جس قدر بھی معلومات اکٹھی کی تھیں، انہیں ایک کتاب کی شکل دینے کے لیے ولیم نے کام کا آغاز کر دیا۔ بوڑھا اور بیمار ہو جانے کے باوجود ولیم نے خود کو ناکارہ نہیں سمجھا اور کسی نہ کسی طرح اپنے کام کو جاری رکھا۔ کالج آف فزیشن میں اب بھی اس کی بہت عزت کی جاتی تھی۔ وہ خود بھی کالج کے طالب علموں اور اساتذہ کے ساتھ رابطے استوار رکھتا تھا تاکہ دنیا میں ہونے والے حالات و واقعات سے خود کو باخبر رکھے۔ کالج اب بھی ولیم کو اعزازات اور مراعات دینے کے حق میں تھا مگر اب ولیم نے اپنی ناسازی طبیعت کے پیش نظر کوئی عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ولیم نے جانوروں پر کی جانے والی اپنی تحقیق کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کا کام تو شروع کر دیا تھا مگر وہ اس کو باقاعدہ کتابی شکل میں شائع کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس موقع پر اس کے ایک شاگرد اور دوست جارج جنٹ نے آگے بڑھ کر یہ کام سنبھال لیا۔ اس نے ولیم کو مجبور کیا کہ وہ اپنی کتاب ڈویلپمنٹ آف اینیمل ضرور شائع کرے۔ عمر رسیدگی اور بیماری کے سبب ولیم کے لیے کتاب کی اشاعت ایک مشکل کام تھا مگر یہاں پر بھی اس کے شاگرد نے ولیم کی مدد کی۔ اس نے کتاب کی اشاعت کی مکمل ذمے داری خود اٹھائی اور یوں ایک ایسی کتاب دنیا کے سامنے لانے میں کامیاب رہا جس نے طب کے میدان میں بعد میں آنے والوں کے لیے تحقیق کے نئے راستوں کا تعین کیا۔

ولیم نے اپنی اس کتاب میں جانوروں اور انسانوں کے نظام تولید پر بحث کی ہے۔ اس نے اس کتاب میں پرندوں میں انڈا اور انڈے سے بچہ بننے کے طریقہ کار پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ولیم نے اس تمام تفصیل کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے کہ کس طرح انڈے کے اندر چوزہ بنتا ہے اور کس طرح رفتہ رفتہ اس کے جسم کے مختلف حصے تشکیل پاتے ہیں۔

اپنی اس کتاب میں وہ دعویٰ کرتا ہے کہ پرندوں میں تو بچے انڈے سے ہی پیدا ہوتے ہیں لیکن انسان اور ایسے تمام جانور جو انڈوں کے بجائے افزائش نسل کے لیے زندہ بچہ پیدا کرتے ہیں وہ ابتدا میں انڈے سے ہی جنم لیتے ہیں گویا تمام جاندار پہلے انڈے سے بنتے ہیں۔ صرف ان کی تشکیل پانے اور ظہور میں آنے کا طریقہ جدا جدا ہے ورنہ سب کی ابتدا انڈے سے ہی ہوتی ہے۔

ولیم نے اپنی کتاب میں جانوروں اور پرندوں میں پیدائش سے پہلے جسم کے مختلف حصوں کے بننے کے عمل کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے اس کتاب میں ہرن میں نظام تولید اور پیدائش کے عمل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اپنی کتاب میں وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے چوزے کے بننے کے جس عمل کا مشاہدہ پرندوں پر ہی موقوف کیا ہے، بالکل اسی اصول کے تحت انسان کی پیدائش اور پیدائش سے پہلے کا عمل ہوتا ہے۔ گویا جانوروں اور انسانوں میں افزائش نسل تقریباً ایک ہی طرح ہوتی ہے۔ اسی طرح جسم کے مختلف اعضا کے بننے اور دنیا میں آنے تک کا عمل چوزوں اور انسانوں کے اندر ایک ہی طرح تشکیل پاتا ہے۔

ولیم کی یہ کتاب اس وقت تیار ہوئی جب وہ بیمار تھا اور بوڑھا ہونے کی وجہ سے اپنا بیشتر وقت گھر ہی میں گزارتا تھا لیکن اس کی کتاب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس ضعیفی میں بھی اس کا دماغ پوری طرح کام کر رہا تھا۔ یہ ایک کمزور اور بوڑھے شخص کا جسم تھا جس میں ایک جوان اور صلاحیتوں سے بھرپور دماغ کام کر رہا تھا۔ عمر اور بیماری اس کا راستہ روکنے میں ناکام رہی تھی۔ اپنی موت تک ولیم اس دنیا میں ایک ایسے شخص کے طور پر زندہ رہا جس نے باوقار اور کامیاب زندگی گزاری۔ اس نے آخر وقت تک خود کو نہ صرف مصروف رکھا بلکہ اپنے کام سے خود کو ساری دنیا کے لیے مفید اور قابل قدر انسان ثابت کیا۔

++

دریچۂ ماضی

پروفیسر فیاض احمد شیخ

دنیا میں وہی لوگ قابلِ احترام ٹھہرتے ہیں۔ وہی آگے بڑھتے ہیں جن میں لگن ہو، کچھ کر دکھانے کا جذبہ ہو۔ ایسی ہی شخصیت کا تذکرہ جس نے کھارادر کی گلیوں سے سفر شروع کیا اور آج وہ برطانیہ کے مشہور نیورولوجسٹ میں شمار ہوتے ہیں۔

نئی نسل کو مستقبل سوارنے کا پیغام دیتی سوانح حیات کا دوسرا حصہ

گزشتہ ماہ آپ نے پڑھا کہ سر شمیم کا لیکچر میں نے شارٹ ہینڈ میں کیسے لکھا اور پھر کیا ہوا۔ شمیم صاحب کے بتائے نکتوں نے میری زندگی پر کیا اثر ڈالا آپ ملاحظہ کریں

ڈی جے کالج کے دو سال کی کئی یادیں تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ بھی تھیں۔ خاص طور پر طلبہ کی سیاست کھلی دفعہ دیکھنے کو ملی تھی۔ کالج میں دو جماعتیں تھیں۔ جمعیت اور ڈی جے ایس ایف۔ ہم پہلے سال ہی میں تھے تو انتخابات دیکھنے اور اس میں شور و غل کرنے کا موقع ملا۔ اور تو ہماری کوئی غیر تعلیمی سرگرمیاں تھیں نہیں تو اس کو موقع جان کر لطف اندوز ہوئے۔

میرے دادا شیخ محمد امین کا ضلع جھنگ کی جماعت اسلامی میں کردار رہا۔ مولانا مودودی اور میاں طفیل محمد کے بڑے گرویدہ تھے۔ دادا جان کا نظریہ والد صاحب اور پھر ہم پر بھی اثر انداز ہوا۔ بچپن سے جمعیت کی مختلف تقاریب میں ہمیں تقریر رٹا کر بھیجا جاتا۔ کبھی کوئی انعام وغیرہ تو نہیں ملا بس جمعیت اور جماعت اسلامی ہمارے ذہن پر چھا گئی۔

ڈی جے طلبہ تنظیم کے انتخابات میں ہم نے بھی جمعیت کے حق میں نعرے مارنا شروع کر دیے۔ ساتھ میں شاہین ملک بھی ہمارے ساتھ جمعیت میں شامل ہو گئے۔ خان مشکور آفریدی اور منصور صدر اور جنرل سیکریٹری کے اُمیدوار تھے۔ مشکور بھائی ناظم آباد D-3 میں رہتے تھے اور ہمارا بہت اچھا تعلق بن گیا تھا۔ وہ کامیاب بھی ہوئے اور انھوں نے واقعی ڈی جے کے لیے کام بھی کیا۔

انتخابات کے بعد سنجیدگی سے پڑھائی کا آغاز ہوا۔

ہمارا پہلا ٹیسٹ زولوجی کا تھا۔ شمیم صاحب نے زور دے کر کہا تھا کہ اس پر سب محنت سے تیاری کریں۔ کسی نے بتایا تھا کہ شمیم صاحب پرچہ سیٹ کرنے والوں میں ہیں لہٰذا جو سوال وہ دیں گے کافی اہم ہوں گے اور ہوسکتا ہے امتحان میں بھی آئیں۔ آج کل اس قسم کے ٹیسٹ کو موک (MOCK) کا نام دیا جاتا ہے۔ ہم نے بھی خوب تیاری کی۔ ٹیسٹ کا نتیجہ آیا تو میرے، جبار اور ایک لڑکا اظہار کے سب سے زیادہ نمبر تھے۔ واضح رہے کہ ہماری کلاس میں میٹرک کے پوزیشن ہولڈر بھی تھے۔

جبار تو بہت خاموش طبیعت کے مالک تھے اور کسی سے زیادہ ملتے جلتے نہیں تھے، لیکن اظہار میرے پاس آیا۔ کہنے لگا تمہارا نام فیاض ہے؟ میں نے کہا، کیوں؟ کہنے لگا، میرے اور تمہارے سب سے زیادہ نمبر ہیں کلاس میں۔ دیکھو ہم دونوں نے میٹرک کے پوزیشن ہولڈرز کو شکست دی ہے۔ اس کا مطلب ہے ہم بھی پوزیشن لا سکتے ہیں۔ میں نے کہا، نہیں بھائی تکا لگ گیا ہے۔ کہاں ہم کہاں پوزیشن ہولڈر۔ اظہار کہنے لگا، جب ٹیسٹ میں ہرا سکتے ہیں تو سالانہ میں بھی ہرا سکتے ہیں۔ چلو مل کر پڑھتے ہیں اور پوزیشن لا کر دکھاتے ہیں۔ اظہار کی اس خود اعتمادی نے مجھے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا۔ پس اس دن سے میں اور اظہار پکے دوست بن گئے۔ ایک دوسرے سے نوٹس شیئر کرتے، اکثر فون پر ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کرتے

سلسلہ سرگزشت

اور کالج میں بھی اکثر ساتھ گھومتے۔

کچھ دنوں میں فزکس کا ٹیسٹ ہوا تو اس میں بھی میرے، جبار اور اظہار کے بہت اچھے نمبر آئے۔ قیم اور قدیر صاحب نے ہمیں اور کچھ دیگر طلبا کو جن کے نمبر اچھے آئے تھے بلایا اور کہا، دیکھو آدم جی اور ڈی جے میں بہت مقابلہ ہوتا ہے۔ دونوں کالج کی کوشش ہوتی ہے کہ انٹر میں پوزیشن ان کے کالج سے آئے۔ ان ٹیسٹ میں کتنوں کے اچھے نمبر آئے ہیں سب کو ہم نے بلایا ہے کہ اگر آپ کو کوئی بھی پڑھائی میں مدد درکار ہو تو بلا جھجک آ کر لیا کریں۔

اپنے آپ کو ممکنہ پوزیشن ہولڈرز کی صف میں شامل دیکھ کر میں تو ہواؤں میں اڑنے لگا۔ پھر خود کو سمجھایا، بھائی تم کیا چیز ہو کیوں خوامخواہ خواب دیکھتے ہو۔ اپنی اوقات میں رہو۔ بس ڈاؤ میں داخلہ ملنے کا ہی سوچو۔ وہ بھی کوئی آسان کام نہیں۔ تمہارے بھائی تم سے بھی زیادہ قابل تھے پھر بھی میڈیکل میں نہ جا سکے۔

☆☆☆

گیارہویں کے امتحان کا نتیجہ آیا تو میرے 82.4 فیصد تھے۔ پتا چلا اظہار کے مجھ سے چھ نمبر زیادہ تھے اور جبار کے دس۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ موجودہ نمبروں کے لحاظ سے پورے کراچی میں جبار اول، اظہار دوم اور میری پانچویں پوزیشن تھی۔ کیونکہ سرکاری طور پر نویں اور گیارہویں کے امتحان میٹرک اور انٹر کی پہلی اسٹیج ہوتے ہیں اس لیے ان میں پوزیشن یا ڈویژن کا اعلان نہیں ہوتا۔ اب جبار اور اظہار کو تو اپنی پوزیشن برقرار رکھنا تھی لیکن مجھے پہلے تین میں آنے کے لیے دوسرے سال اور بہتر نمبر لانے پڑیں گے۔ تیسری اور چوتھی پوزیشن پر شاید آدم جی کے دولڑکے تھے، لیکن ہم میں کسی کو ان کا نام نہیں پتا تھا۔

اظہار نے آ کر مجھے کہا، دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ ہم کر سکتے ہیں اور ہم نے پہلے سال میٹرک کے تمام پوزیشن ہولڈرز کو پیچھے چھوڑ دیا۔ دوسرے سال ہمیں تمام اساتذہ نے بہت محنت کروائی، عملی امتحانوں کی تو خاص طور پر۔ زندگی میں پہلی دفعہ لگتا تھا کہ پوزیشن لانا ممکن ہے۔ جب پہلے سال نمبر آئے تو انشاء اللہ دوسرے سال بھی لا سکتے ہیں۔ دوسرے سال میں کافی نئے دوست بھی بنے جن میں عنایت، عبدالعزیز، خالد محمود، سلیم پٹیل، فرخ قریشی قابل ذکر ہیں۔ فرخ سے بھی کافی مدد ملی اور اظہار سے تو میرا

تقریباً چوبیس گھنٹے ہی رابطہ رہتا۔ اب میڈیکل کالج ایک حقیقت لگنے لگا تھا۔ بس دیکھنا یہ تھا کہ پہلے تین پوزیشن پر میں آسکوں گا یا نہیں کیونکہ اخبارات میں نام، تصویر اور انٹرویو صرف تین کے ہی آتے تھے۔ چوتھی پانچویں کا تو کسی کو نام بھی معلوم نہیں ہوتا تھا۔

مجھے ہمیشہ سے ٹہل ٹہل کر پڑھنے کی عادت تھی۔ کمہاروڑہ میں بھی تھا تو کتاب لے کر آئی آئی چندریگر روڈ پر نکل جاتا۔ عموماً حبیب بینک پلازا تک جاتا۔ اور کبھی کبھی پاکستان چوک پر کلاس فیلو امان اللہ کے گھر تک پہنچ جاتا۔ اکثر لوگ حیران ہوتے کہ یہ بندہ چلتے چلتے کیسے پڑھتا ہے۔ خیر، مجھے بھی آج تک سمجھ نہیں آئی، مگر ابھی بھی کوئی پیپر لکھنا ہو یا کسی تحقیق کا سوچنا ہو تو ڈرائیو پر نکل جاتا ہوں اور پھر تحقیق کا نقشہ واضح ہو جاتا ہے۔

ناظم آباد میں ہمارا نیا محلہ کمہاروڑہ سے بہت مختلف تھا۔ کمہاروڑہ میں عمارتیں اور فلیٹ تھے، مگر یہاں ایک یا زیادہ سے زیادہ دو منزلہ مکان تھے۔ خیر، آج کل تو ناظم آباد بھی کمہاروڑہ کی طرح ہی ہو گیا ہے جہاں ان مکانوں کو توڑ کر کئی کئی منزلہ عمارتیں کھڑی ہو گئی ہیں۔ تاہم اس زمانے میں نہایت صفائی تھی۔ علاقہ کھلا تھا اور زیادہ تر آبادی تعلیم یافتہ اور اونچے متوسط گھرانوں کی تھی۔ ہم نے یہ مکان کرائے پر شہاب صاحب سے لیا ہوا تھا جو پہلی منزل پر رہتے تھے۔ ان کی ایک صاحبزادی ناہید کا اسی سال سندھ میڈیکل کالج میں داخلہ ہوا تھا۔

ہمارے گھر کے بالکل سامنے چشتی صاحب کا گھر تھا جن کا ایک بیٹا عمران چشتی اسی سال ڈاؤ یونیورسٹی میں گیا تھا۔ دو چھوٹے بیٹے نعمان اور سلمان تھے۔ ان کی بہن ناہید چشتی اب بھی فیس بک پر میرے رابطے میں ہیں۔ ناہید شہاب امریکا میں ہیں اور عمران چشتی برطانیہ میں۔

میں سارا دن گلی محلے میں گھوم گھوم کر پڑھتا اور محلے کے لوگ میری اس عادت پر لطف اندوز ہوتے۔ شاید انھوں نے بھی پہلے کبھی ایسا نمونہ نہیں دیکھا تھا۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ اس کے پہلے سال بہت اچھے نمبر آئے ہیں اور اس کا ڈاؤ میں داخلہ ہو جائے گا۔ میں رات کو ٹہلتے ہوئے حسرت کی نگاہ سے سامنے دیکھتا جہاں عمران کمرے میں پڑھ رہا ہوتا۔ اس کے کمرے کی کھڑکی گلی کی طرف تھی اور کھلی رہتی تھی۔ اکثر شام کو ایس ایم سی کی بس سے ناہید سفید کوٹ پہنے گھر آتی تو اسے دیکھ کر مزید محنت کا جذبہ بیدار ہوتا۔

جولائی اگست 1977ء میں ہمارے انٹر کے امتحانات ہوئے۔ ایس ایم کالج میں مرکز پڑا۔ تھیوری اور پریکٹیکل دونوں ٹھیک ٹھاک ہو گئے۔ قدیر صاحب کے ہوٹل کا بار بی کیو ریسٹورنٹ ہماری گلی کے نکڑ پر تھا، وہ اکثر وہاں آکے بیٹھے ہوتے۔ میں اس سے پوچھتا سر رزلٹ کب آرہا ہے؟ بتاتے، چار پانچ ماہ لگتے ہیں۔ سنا تھا اس وقت ہمارے پیپر جناح کالج میں چیک ہو رہے ہیں۔ میں روز وہاں کا چکر لگاتا بالکل ایسے ہی جیسے کوئی عاشق اپنے معشوق کی گلی کے پھیرے لیتا ہے۔ پر وہاں ملتا بھی کیا تھا۔

☆☆☆

1976ء-1977ء میں پاکستان میں جوڈو کراٹے کا جنون چل رہا تھا۔ سینماؤں میں بروس لی اور جیکی چن کی فلمیں دھڑا دھڑ آرہی تھیں اور انھیں دیکھ کر بچہ بچہ گلی میں کلک اور پنچنگ کرتا نظر آتا۔ کئی لوگ نن چکو لے کر گھوم رہے ہوتے۔ جسے تھوڑا بہت بھی آتا وہ خود کو بروس لی سمجھتا۔ ہماری عمر اور اس سے کم کا تقریباً ہر فرد اس بیماری کا شکار ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں پاکستان میں اسلحہ اتنا عام نہیں تھا اور نہ گولی کے سامنے یہ مارشل آرٹس دو سیکنڈ بھی نہ چل سکتے۔

ہم بھی اس بیماری سے محفوظ نہ رہ سکے اور ہم نے بھی طارق کراٹے سینٹر میں داخلہ لے لیا۔ حنیف شیوانی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ کمہاروڑہ کے ایک اور ساتھی سہیل اور شاہد عدیم بھی اس میں پیش پیش تھے۔ میں نے تو خیر اورنج بیلٹ کے بعد چھوڑ دیا تھا اور شاید حنیف نے بھی، مگر عدیم شاہد تو بلیک بیلٹ تھرڈ ڈان تک پہنچے تھے۔ ناظم آباد میں ہمارے سامنے عمران کا چھوٹا بھائی نعمان بلو بیلٹ لے چکا تھا اور دن رات اپنے باپ کی جیپ کے برابر اونچی اونچی ککیں لگا رہا ہوتا۔ اکثر ہمارا پرانا گھر اس مشق کے لیے استعمال ہوتا۔ شاید حنیف اور سہیل کو یاد ہو ایک دن مشق میں میرا چشمہ شہید ہو گیا تھا!

گیارہویں کلاس میں اچھے نمبر آنے کی وجہ سے ٹیوشن کے لیے ہماری مارکیٹ ویلیو میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ انٹر کے امتحان اور نتائج کے درمیان کا حصہ ہم نے میٹرک اور اس سے نچلی جماعت والوں کو خوب پڑھایا اور اچھا خاصا پیسا بھی جمع کیا۔ اس زمانے میں ڈی جے سے ہی گلزار ہمارا بہترین دوست ہوتا تھا۔ اس کے پاس بائیک تھی۔ ہم اکثر اس کی بائیک پر گھومتے اور چھٹیوں کا لطف

اٹھانے سے آج کل پتا نہیں کہاں ہے؟

دسمبر 77ء سے ہی ہمیں نتیجے کا انتظار شروع ہو گیا تھا۔ اظہار سے بھی اکثر فون پر بات ہوتی۔ وہ بھی بے چین تھا۔ جبار سے میرا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ کبھی کبھی قدیر صاحب سے ملاقات ہوتی، لیکن انہوں نے بھی نتیجے کی ممکنہ تاریخ کا نہیں بتایا۔ 13 جنوری 78ء کو پتا چلا کہ 17 جنوری بروز منگل کو نتیجہ متوقع ہے۔ 16 جنوری کو میں اور گلزار بورڈ آفس پہنچ گئے کہ شاید پتا چل جائے۔ وہاں نیچے کھڑے تھے کہ گاڑی سے شمیم صاحب اترے۔ ہم نے پوچھا سر نتیجہ آج آرہا ہے یا کل؟ کہنے لگے، کل آئے گا۔ وہ اوپر جارہے تھے۔ شاید نتائج کے اعلان سے قبل ان کی کوئی میٹنگ تھی۔ میں نے پوچھا سر پوزیشن کس کالج سے ہیں؟ انہوں نے کہا پتا نہیں۔ میں نے استفسار کیا، سر پلیز بتا دیں پوزیشن کس کی ہیں...... جبار، اظہار یا فیاض؟ انہوں نے میری شکل کو غور سے دیکھا اور کہنے لگے تمہیں کس نے بتایا؟ میں نے کہا، سر پوچھ رہا ہوں۔ کہنے لگے، پتا نہیں اور اندر چلے گئے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح پتا چلا کہ نتیجہ آ گیا ہے۔ میں نے گلزار کو بتایا اور جھٹ پٹ ایک بائیک پر ہم بورڈ آفس پہنچے تو وہاں فہرست آویزاں تھی، اس کے اطراف بہت رش تھا۔ مجھے دیکھنا تھا تین پوزیشن ہولڈر کہاں سے تھے اور کون تھے؟ گلزار نے کہا، رک میں دیکھ کر آتا ہوں۔ دس منٹ بعد اس نے دور سے نعرہ لگایا، ابے فیاض تیری تیسری پوزیشن ہے۔ اظہار نمبر 2 اور جبار کا پہلا نمبر ہے۔ یعنی ترتیب وہی تھی جو میں نے کل شمیم صاحب سے پوچھی تھی۔ تبھی وہ کہہ رہے تھے، تمہیں کس نے بتایا؟ میں نے تو فوراً رونا شروع کر دیا۔ گلزار نے بائیک پر بٹھایا اور ہم جلدی سے گھر روانہ ہوئے کہ سب کو بتائیں گے۔

☆☆☆

ایک خواب جو شمیم صاحب اور اظہار نے دکھایا تھا واقعی حقیقت ہو گیا۔ کئی بار خود کو چٹکیاں لیں۔ بورڈ والوں کے پاس میرا کھارادر کا پتا تھا، کیونکہ پچھلے ہی سال ہم ناظم آباد منتقل ہوئے تھے۔ پریس والوں نے کھارادر کے پتے پر جانا تھا اس لیے فوراً کھارادر کا رخ کیا۔ پریس والوں نے عمارت اور اس کی ٹوٹی چھت دیکھی تو سمجھ گئے یہ کسی غریب گھرانے سے ہے تو محنت سے ہی پوزیشن لایا ہوگا۔ وہیں تصویر لی اور انٹرویو کیا۔ میں نے کوئی تیاری نہیں کی بس جو دل میں آیا بول دیا۔ زندگی میں پریس سے بات کرنے کا پہلا تجربہ تھا۔ کچھ سوال یاد ہیں۔ آپ کو کیسا محسوس ہو رہا ہے؟ کیا یقین نہیں آرہا۔ پسندیدہ شخصیت؟ پروفیسر محبوب۔ مستقبل میں کیا کرنا چاہتے ہیں؟ ڈاکٹر بن کر قوم کی خدمت؟

اس عمر میں زندگی کے حقائق کا پتا نہیں ہوتا۔ فقط ڈاکٹر بننا ہی مقصد کا حصول نہیں ہوتا۔ آگے بڑھنے کی لگن ڈاکٹر بننے کے بعد ہی شروع ہوتی ہے اور کیا مواقع ملیں گے اور کہاں ملیں گے اس کا ادراک اس وقت نہیں ہوتا۔ اٹھارہ سال میں سوچ بھی ناتجربہ کار ہوتی ہے۔ آج سوچتا ہوں کاش پاکستان کا نظام صحت بہتر ہوتا تو پاکستان کو برین ڈرین کا سامنا نہ ہوتا۔ جبار نے کافی عرصہ آغا خان میں کام کیا پھر وہیں منتقل ہوئے۔ اظہار بھی میری طرح برطانیہ منتقل ہوئے اور آج ایبرڈین اسکاٹ لینڈ میں گردوں کے ماہر معالج ہیں۔

دوسرے دن اخبارات میں تصویر اور انٹرویو دیکھ کر پھر خواب سا لگا۔ کافی عرصہ اخبار سنبھال کر رکھا پھر نہ جانے کہاں کھو گئی وہ یادیں۔ کچھ دن تو ہم سیلی بریٹی بنے رہے۔ محلے میں نکلتے تو لوگ دیکھ رہے ہوتے۔ میرے طالب علم مبارک باد دیتے اور سب کو فخر سے بتاتے کہ جن سے ہم پڑھتے ہیں انہوں نے انٹر ٹاپ کیا ہے۔ کالج گئے تو سب نے فرداً فرداً آکے مبارکباد دی۔ شمیم صاحب کے پاس گئے تو کہنے لگے۔ "ماسٹر میں نہ کہتا تھا تم ٹاپ کر سکتے ہو۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں وہ چمک دیکھی تھی جو پچھلے کئی برسوں میں ٹاپ کرنے والوں کی آنکھوں میں دیکھتا رہا ہوں۔ پہچان ہو گئی ہے مجھے۔ تم حیران ہو میں نہیں۔" قدیر صاحب کے بھی یہی جملے تھے۔

گھر میں امی، ابو اور بہن بھائی کے علاوہ سب سے زیادہ خوشی میرے ماموں منیر عالم صدیقی کو تھی۔ انٹر کے پورے دو سال وہ مجھے ڈاکٹر کہہ کر بلاتے تھے۔ میرے بھائی بہنوں نے بڑے فخر سے اپنے دوستوں سے ملوایا۔ ہمارے خاندان بلکہ چنیوٹ برادری میں بھی کسی نے پوزیشن نہیں لی تھی۔ اس دن میرے ماں باپ کو یہ خوشی تھی کہ ان کی محنت رنگ لائی اور اولاد کو تعلیم کا جو زیور انہوں نے دینے کا عہد کیا تھا اس کا پھل ملنا شروع ہوا تھا۔ گو کہ گھر میں سب بہن بھائیوں نے ماسٹرز تک پڑھا تھا، پر میڈیکل کے شعبے میں خاندان میں میری پہلی انٹری تھی۔ پرانے محلے میں بھی خبر پھیل گئی تھی کہ رحمان بلڈنگ کا بچہ پوزیشن لایا ہے۔

urdunovels.com

دو دن بعد اسکول گیا۔ مس شاہجہاں اپنے کمرے کے باہر کھڑی تھیں۔ میں نے کہا، کچھ بتانے آیا ہوں تو کہنے لگیں، میرے گھر بھی اخبار آتا ہے۔ دوسرے اساتذہ کو پتا چلا تو سب پیچھے آئے اور مجھے گھیرے میں لیا۔ کہنے لگے، کل اسمبلی میں آؤ تا کہ اسکول کے بچوں کی ہمت افزائی ہو۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ہماری کلاس کے چھ طالب علم میڈیکل میں جا رہے تھے۔ شاہین ملک، ادریس دوسانی، حنیف کھتری، امتیاز احمد اور عظمت فرید بیگ نے بھی اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کی تھی۔

اس جشن سے نکلنے میں بہت وقت لگا۔ ڈومیسائل اور دوسرے کاغذات بنانے میں بھی بہت لطف آ رہا تھا۔ ڈاؤ اب میری اگلی منزل تھا۔ میں نے زندگی میں اس کے بعد کئی امتحان پاس کیے اور کئی مرتبہ پوزیشن آئی، لیکن آج بھی اگر کوئی پوچھتا ہے کہ کس امتحان کی کامیابی آپ کی نظر میں سب سے بڑی اور اہم تھی تو میں انٹر کی پوزیشن کا ہی ذکر کرتا ہوں۔ 28 ہزار طلبہ نے وہ امتحان دیا تھا پری میڈیکل سے جس میں میرا تیسرا نمبر تھا۔

☆☆☆

نتیجے کے کچھ ہی دن بعد انتخاب توفیق میرے گھر آئے۔ اپنا تعارف کرایا اور مسرت کا اظہار کیا کہ میں نے انٹرویو میں پروفیسر غفور کو پسندیدہ شخصیت کہا۔ انہیں میری ڈی جے میں جمعیت اور منظور آفریدی سے قربت کا تعلق کا بھی پتا تھا۔ پتا چلا ان کا تعلق جمعیت سے ہے اور وہ بھی ہمارے ساتھ ڈاؤ میں داخل ہو رہے ہیں۔

ڈاؤ کے چکر تو داخلے سے کئی مہینے پہلے ہی لگنے شروع ہو گئے تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ کسی نے فرسٹ ایئر فول نہیں منایا۔ سب سے پہلی ملاقات حسن اخلاص سے ہوئی وہ عاصم مرحوم، زاہد سہیل مرحوم اور طارق کمال ایوبی مرحوم تھے۔ عاصم اور ان کی بڑی بہن علیم ہم سے ایک سال سینئر تھے۔ زاہد بھائی ہم سے تین سال سینئر تھے۔ انہوں نے ہی ہمیں شاہ محمد وکاس سے ملوایا جو ان کے کلاس فیلو تھے۔ طارق بھائی ہم سے پانچ سال سینئر تھے۔ اس وقت جمعیت برسر اقتدار تھی اور عزیز الرحمٰن صدر تھے۔ شاہ صاحب جمعیت کے ایک بک اسٹور میں رضاکارانہ کام کر رہے تھے۔ ہمیں بھی انہوں نے وہاں لگا دیا۔ کچھ عرصے بعد ہماری کلاس کے دو لوگ بھی شامل ہو گئے۔

این ایس ایف والوں کو شاید میرا ابھی سے پتا تھا۔ میرے نام کے ساتھ جماعتی پہلے ہی دن لگ چکا تھا اور جماعت نے بھی مجھ سے کسی رابطے کی زحمت نہ کی۔ اسی این ایس ایف میں بہت متحرک ہو گئے اور اس طرح ہم دونوں کی راہیں جدا ہونے لگیں۔ کالج میں عنقریب انتخابات ہونے والے تھے گو کہ تاریخ کا اعلان نہیں ہوا تھا۔

مارچ میں میرے بڑے بھائی مسعود احمد کی شادی فیصل آباد میں ہوئی اور اس کے کچھ عرصے بعد ہی بڑی باجی کی منگنی حفیظ بھائی سے ہوئی جو بہت ملنسار تھے اور ہمارے گھر میں جلد ہی گھل مل گئے۔

اپریل 78ء میں میرے ابو کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ ابھی ان کی عمر اٹھاون برس کی تھی۔ بھوک نہیں لگتی تھی اور دبلے تو پہلے ہی سے تھے وزن بھی مزید کم ہو گیا۔ ہمارے خاندانی ڈاکٹر صادق علوی جن کا لائٹ ہاؤس میں مطب خانہ تھا، دکھایا تو انہوں نے کچھ خون کے ٹیسٹ لکھ کر دیے۔ ان نتائج کو دیکھ کر اس نے بتایا کہ یرقان ہے۔ وجہ معلوم کرنی پڑے گی۔ ڈاکٹری پیشے کے کچھ الفاظ استعمال کیے جس کا لب لباب یہ سمجھ آیا کہ کوئی خطرناک بات ہو سکتی ہے۔ اس وقت میڈیکل کالج میں ابھی داخلہ ہی ہوا تھا، ہمیں آتا جاتا کچھ نہیں تھا۔ لہٰذا کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھے۔

اسپیشلسٹ کو دکھایا تو اس نے بتایا کہ یرقان ہے، وجہ پتا نہیں۔ پیٹ کھول کر دیکھنا پڑے گا۔ اس نے سرجن حاذق یقین کے پاس بھیجا جس نے آپریشن کی تاریخ دی۔ آپریشن میں کیا ملا مجھے نہیں بتایا، پر ابو کو ناظم آباد کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں ضرور منتقل کر دیا گیا، اور پھر ایک دن وہاں کے ڈاکٹر نے ہم سب کو بلا کر یہ بری خبر دی۔ ”آج سے سو برس قبل جو اس دنیا میں تھا وہ آج نہیں اور جو آج ہے وہ سو سال بعد نہیں ہوگا۔ ہم سب نے جانا ہے۔ آپ کے والد صاحب کو لبلبے کا کینسر ہے جس کا علاج نہیں۔ گھر لے جائیے اور خدمت کیجیے۔ 8-6 ماہ کی مدت جئیں گے۔“

یہ خبر ہمارے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھی۔ باقی بہن بھائیوں کے دل پر کیا گزری اور انہوں نے اس صدمے کو کیسے سہا یہ تو وہی بتا سکتے ہیں، البتہ میری زندگی پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ کالج کی پڑھائی بھی ان ہی دنوں میں شروع ہوئی تھی اور انہی دنوں میں، میں نے سگریٹ بھی پینا شروع کر دی تھی۔ اب ایسی حالت میں میری ایک کلاس فیلو نے اس وقت میرا بہت ساتھ دیا۔ چنانچہ میں ہر وقت اسی کے پاس بیٹھنے لگا تا کہ میری توجہ بٹی رہے۔ اس وقت میرا

ساتھ میرے انٹر اور ڈی جے کے ساتھی گلزار نے بھی دیا جس کا میڈیکل میں داخلہ نہیں ہوا تھا۔ رات بھر اس کے ساتھ اور سارا دن کلاس فیلو کے ساتھ۔ کالج میں اور کوئی دوست نہیں تھا نہ کسی کو ابو کا بتایا تھا۔ اظہار کچھ نظریاتی وجوہات پر دور ہو گیا تھا۔ انٹر کے دو برسوں میں اسکول کے دوستوں سے پہلے ہی دوری ہو گئی تھی۔ تھوڑی بہت دوستی رؤف عثمانی اور اس کے توسط سے عنایت علی خان اور طالب سے تھی۔

جون میں کالج کے انتخابات ہوئے اور جمعیت کے رانا محمود اختر اور انیس الرحمٰن کامیاب ہوئے اور این ایس ایف کے افتخار یوسف اور عامر خاں کو شکست ہوئی۔ پریشانی کے باعث میں نے کچھ حصہ نہ لیا۔ حنیف حاجی ہماری کلاس کا سی آر منتخب ہوا۔ ابو کی صحت دیکھ کر باجی کی شادی ستمبر 15 کو طے پائی، مگر بڑے ملے جلے جذبات سے انہیں رخصت کیا۔ اس وقت میری دادی چنیوٹ سے کراچی آ گئی تھیں اور ابو کی بیماری اور دیکھ بھال میں بھرپور ساتھ دیتی تھیں۔

☆☆☆

ستمبر میں باجی کی شادی کے بعد تین مہینے بہت کٹھن تھے۔ کالج میں ایک پوزیشن ہولڈر کو سگریٹ پیتے اور دن بھر کسی کے ساتھ اناٹومی لیکچر ہال یا معین آڈیٹوریم میں پچھلی سیٹوں پر بیٹھے دیکھ کر ہم جماعتوں اور سینئرز میں کوئی اچھا تاثر نہیں پڑا تھا۔ اکتوبر کا مہینا تھا شاید، حنیف حاجی سی آر کچھ ہفتوں کے لیے ملک سے باہر گھومنے گیا اور پتا نہیں کیوں مجھے قائم مقام سی آر بنا گیا۔ میرا نہیں خیال اس کا یہ فیصلہ لوگوں نے سر آنکھوں لیا ہوگا۔ حنیف جن لوگوں کے ساتھ پھرتا تھا وہ سب شپ آنرز کالج سے تھے اور سب ناظم آباد میں رہتے تھے سوائے موسیٰ خان جو تارتھ ناظم آباد میں مقیم تھا۔ شعیب پٹیل، احتشام، عرفان اور زاہد اصغر حنیف کے دوسرے ساتھی تھے۔

دسمبر تک ہماری کلاسز شروع ہوئے تقریباً چار ماہ ہو چکے تھے، مگر میرا پڑھائی میں دل بالکل نہیں لگتا تھا۔ ابو کی طبیعت بھی روز بہ روز بگڑتی جا رہی تھی۔ 11 دسمبر 78ء کو یوم عاشورہ تھا اور حسب عادت میں کھارادر پہنچا ہوا تھا۔ شام قربیاں کے بعد محسن نے مجھے گھر چھوڑا۔ اس رات تک تو ابو کو ہوش تھا اور تھوڑی بہت بات بھی کر رہے تھے، لیکن اگلے دن 12 دسمبر 11 محرم کو ان پر غنودگی چھا گئی۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا مگر ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی دو پہر تین بجے ان کا

انتقال ہو گیا۔ ہمارے گھر میں یہ پہلی فوتگی تھی۔ 58 سال کی بھی کوئی عمر ہوتی ہے؟ دکھ یہ تھا کہ آخری چند ماہ انہوں نے بیماری کی بہت تکلیفیں جھیلیں۔

دوسرے دن تعزیت کے لیے کالج کی بس میں تقریباً پوری کلاس ہمارے گھر آئی۔

شاید اس دن کلاس والوں کو اندازہ ہوا ہو کہ پچھلے چند ماہ مجھ پر کیسے گزرے ہوں گے۔ یہ سال، جو خوشیوں سے شروع ہوا اس کا اختتام بہت غمگین تھا۔ 79ء کے شروع میں جیسے ہی سوگ سے تھوڑا ابھر آیا تو اندازہ ہوا کہ گزشتہ چھ ماہ میں تعلیمی سرگرمیاں بالکل ہی نظر انداز ہو گئیں۔ اگر مجھے اپنی شخصیت کا بھرم بحال کرنا ہے تو بہت محنت کرنا ہوگی۔ میں نے ایک دفعہ پھر کتابوں کا رخ کیا۔ شہاب شہود جو ناظم آباد میں رہتے تھے، ان کے ساتھ مل کر نوٹس کی چھپائی شروع کی مگر کامیابی نہ ہوئی اور اس میں نقصان بھی ہوا۔ تھوڑا بہت سیاست میں بھی کام شروع کیا اور جمعیت کی طرف سے اپنی ہی کلاس کو اناٹومی پڑھانا شروع کی۔ میرے ساتھ جمعیت کے شفیق الرب بھی تھے۔ ادھر این ایس ایف کی طرف سے شاہد قریشی اور اسحٰق باوا مرحوم نے بھی چھوٹے گروپ کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔

اپریل 79ء تک میں کافی سنبھل چکا تھا، لیکن سگریٹ پینے کی عادت پکی ہو گئی تھی۔ طیف کے دوستوں سے بھی سلیک سلیک ہوئی اور ناظم آباد کے لوگوں سے ملنا جلنا شروع ہوا۔ شاکر علی جعفری بائیو کیمسٹری، آفاق صاحب فزیالوجی، وحید صاحب انیمر یولوجی اور معظم صاحب ہسٹو پڑھاتے تھے۔ ان دنوں مجھے نقالی کا بہت شوق ہوا۔ میں پہلے بھی لوگوں کی آرام سے کاپی کر لیتا تھا۔ ایک دن کلاس کے کسی فنکشن میں، میں نے تمام اساتذہ کی نقل اتاری جو لوگوں کو بہت پسند آئی۔ اس طرح میری شخصیت کا یہ روپ بھی سامنے آیا۔

ان ہی دنوں ہم سے ایک سال جونیئرز کا انٹر کا نتیجہ بھی آ گیا تھا اور آنے والی فرسٹ ایئر کے طلبا کو جمعیت کا پیغام سنانا شروع کیا تا کہ کلاسز شروع ہوتے ہی ہم انہیں پڑھا کر اپنی طرف کھینچیں۔

☆☆☆

جولائی میں ہم سال دوم میں یوں ہوئے کہ سال اول کی کلاسز کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس وقت تک ہم نے بھی پڑھائی کا باقاعدہ آغاز کر دیا تھا۔ نصاب کے اعادے اور

سیاسی مہم کے لیے ہم نے سال اوّل کو پڑھانا شروع کر دیا۔ ٹیوشن پڑھانے میں تو ہم کلاس نہم سے ہی ماہر تھے لہٰذا ہمیں گروہ جمع کرنے میں ذرا مشکل نہیں ہوئی۔

جیسے کچھ لوگوں کے پسندیدہ استاد تھے اسی طرح پڑھانے والوں نے بھی اپنے پسندیدہ شاگرد چنے ہوئے تھے۔ جس گروپ سے ہماری اچھی دوستی تھی ان میں یاسمین نعمان اور عمرانہ اقبال کا گروپ قابل ذکر ہے۔

یاسمین نعمان اس وقت کراچی کی معروف گائنی کولوجسٹ ہیں۔ ان کے گروپ میں منہاج اور تاج شامل تھیں۔ عمرانہ اقبال کے گروپ میں عائشہ غوث، صوفیہ، کہکشاں، یاسمین شامل تھیں۔ عائشہ غوث کی رہائش عرفان صبیح کے برابر میں تھی اور وہ ہماری پوائنٹ سے ہی آتی تھیں۔ ان کا بھائی فیاض تھا جو ایس ایم سی میں پڑھتا تھا۔ منہاج نے فضائی انڈسٹری میں نام کمایا اور آج کل سیریز میں فلائٹ سرجن ہیں۔

اگست میں ہم نے بھی اپنی پڑھائی تیز کر دی تھی۔ ناظم آباد کی وجہ سے ہمارے تعلقات حنیف حاجی کے گروپ سے اور مستحکم ہونے لگے۔ کالج داخلہ کے بعد کچھ عرصہ میں بالکل تنہا ہو گیا تھا۔ کچھ عرصہ رؤف عثمانی اور عنایت علی خان سے دوستی رہی لیکن وہ بھی آہستہ آہستہ دور ہو گئے۔ میں نے حنیف سے ان کے گروپ میں آنے کی خواہش ظاہر کی۔ حنیف نے کہا کہ پہلے وہ سب لوگوں سے پوچھے گا پھر بتائے گا۔ سوائے ناظم آباد کے میری اور کوئی چیز ایسی نہیں تھی کہ وہ مجھے گروپ میں شامل کرتے۔ یہ سب اسکول کے زمانے سے ساتھ تھے اور سب نے شب اور زور سے انٹر کیا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ کچھ عرصہ میں ان کے ساتھ زیادہ اٹھتا بیٹھتا تھا اور پھر پورا گروپ میری طرف جھکا ہی تھا۔ شاید کچھ عرصہ ان کی آپس میں گفت و شنید ہوئی اور پھر ایک دن باقاعدہ انہوں نے مجھے اپنے گروپ میں شامل کر لیا۔

شروع شروع تو ہم نے شعیب پٹیل کے گھر جا کر پڑھائی کی۔ اس کا گھر D-3 میں تھا اور ہمارے گھر کے عقب میں رہنے سے لائن پار کر کے آتا تھا۔ رات دیر تک پڑھائی کر کے میں واپس گھر آ جاتا۔ پھر احتشام سے دوستی ہوئی جو موسیٰ سے بہت قریب تھا۔ موسیٰ مجھے گھر سے لیتا اور ہم احتشام کے گھر جا کر پڑھتے۔ کبھی کبھی میں اور احتشام موسیٰ کے پاس چلے جاتے۔ میرے گھر میں تو کوئی کمرا خالی نہیں تھا۔ عابدہ باجی نے اپنے لاؤنج میں ہمیں پڑھنے کے لیے جگہ دے دی۔ لہٰذا اکثر موسیٰ اور احتشام میرے پاس وہاں آ جاتے۔ باجی کے گھر کے پیچھے یونس بن کباب کی دکان کھلی تھی۔ ہم تقریباً روز ہی اس کا بن کباب کھاتے۔

اس زمانے میں ہم سب کا نظام ہاضمہ بھی ماشاءاللہ کافی صحت مند تھا۔ بن کباب کھاتے، کھانا بھی کھاتے اور... رات بارہ بجے پھر کھانے کی چل ہوتی تو 7 نمبر پر بھجک کی کڑاہی سے بھوک مٹاتے۔ ان سب کے باوجود پڑھائی کے دوران بھی منہ چلتا رہتا۔ اگر کبھی پوری رات پڑھائی کرتے تو پھر حلوا پوری، چھولے یا چائے پراٹھے کا ناشتا بھی ہوتا۔ اب تو یہ حال کہ چوبیس گھنٹے میں ایک دفعہ بھی کھا لو تو غنیمت ہے۔

ماضی کی طرح شام کو چل کر پڑھتے ہوئے ناظم آباد نمبر 2 نکل جاتا، اکثر وہاں یا تو وقار ایوب سے گپ لڑاتا یا عرفان صبیح کے ساتھ چینک والی چائے پی جاتی۔ عرفان میاں اپنے محلے والوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے میں مشغول ہوتے۔ ان کے دوست رضوان الزماں جو ان کے برابر میں رہتے تھے، اپنی بیٹنگ کا جوہر دکھاتے۔ رضوان بعد میں قومی ٹیم میں بھی منتخب ہوئے اور ملکی و غیر ملکی میچوں میں پاکستان کی نمائندگی بھی کی۔

امتحان کی تاریخ مئی جون 1980ء کی آ گئی تھی۔ بس جیسے جیسے دن قریب آتے گئے ہم ایک دفعہ پھر انٹر والے موڈ میں آ گئے۔ تاہم اس دفعہ مجھے امید نہیں تھی کہ کوئی پوزیشن حاصل کر سکوں گا، کیونکہ پہلا سال تو سمجھیں ضائع ہی ہو گیا تھا۔ انتہا دبھی بھرپور سیاسی کاموں میں لگے ہوئے تھے، ہاں البتہ جبار ہمیشہ کی طرح چپ چاپ دن رات اسی طرح پڑھائی میں آگے آگے تھے۔

میری عادت تھی کہ میں جو کچھ پڑھتا تھا اس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں قلمبند کرتا۔ میرے دوستوں کو بھی یہ خلاصہ پسند آتا، کیونکہ اسے یاد کرنے اور دہرانے میں بہت آسانی ہوتی۔ لوگوں نے اسے نوٹس کا نام دیا جس سے نہ صرف میرے دوستوں نے استفادہ حاصل کیا بلکہ کئی سال تک جونیئرز میں بھی یہ نوٹس مقبول رہے۔ اکثر لائبریری میں دوسروں کے پاس میرے نوٹس کی فوٹو کاپی نظر آتی جن سے وہ اپنے امتحان کی تیاری کر رہے ہوتے۔

امتحان سے ایک ماہ قبل میں نے عابدہ باجی کے گھر اپنا اڈا جما لیا تھا۔ رات تین چار بجے تک موسیٰ یا احتشام کے ساتھ پڑھائی ہوتی۔ صبح گیارہ بجے اٹھتے ہی پھر پڑھنے لگ

جاتے۔ شام کو عرفان یا وقار کے پاس چکر لگتا اور رات کھانے کے بعد پھر بیٹھک رہا کرتا ہوتا۔ موسیٰ کے ابا کونسلر تھے اوران کے پاس بڑی ٹویوٹا کریسیڈا کار تھی۔ رات موسیٰ اپنی کبھی کبھی موڈ بنتا تو پڑھائی سے وقفہ لے کر ہم بھی آتے اور ڈرائیو پر نکل جاتے۔ عموماً ہمارا رخ کلفٹن یا طارق روڈ ہوتا۔

☆☆☆

ہمارا کلینکل گروپ ”جی ٹو“ کہلاتا تھا۔ یہ گروپ فرسٹ پروف کے بعد وجود میں آیا۔ سوائے میرے اس گروپ کے تمام افراد شپ اونرز یا اس سے بھی پہلے پرائمری اسکول سے ساتھ تھے۔ میرے داخلے کی بڑی وجہ ناظم آباد میں رہائش تھی، کیونکہ ایک کے علاوہ سب ناظم آباد ہی میں رہتے تھے۔ آیئے اپنے گروپ کے لوگوں کا آپ سے تعارف کرائیں۔ حنیف حاجی ہمارے گروپ کے لیڈر تھے اور شاید اب بھی ہیں۔ ہم سب کو ساتھ رکھنے میں ان کا بہت اہم کردار ہے۔ گریجویشن کے بعد برطانیہ میں داخل ہونے کی کوشش کو آدھے راستے میں خدا حافظ کہہ کر مکہ شہر میں آباد ہو گئے۔ ان کی شادی دو سال جونیئر روبینہ جاپان والا سے ہوئی وہ اپنی کلاس کی پوزیشن ہولڈر تھیں اور اب بھی جنرل فزیشن کی حیثیت سے کام کرتی ہیں۔ طالب نے چندہ سال مکہ میں بے شمار حج اور عمرے کرنے کے بعد دوبارہ برطانیہ کا رخ کیا اور آج کل فالج کے ماہر کی حیثیت سے شمال مغرب برطانیہ میں کنسلٹنٹ لگے ہو گئے ہیں۔ ماشاء اللہ ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے اور محترم چند سال قبل نانا بننے کے بعد حال ہی میں دادا بن چکے ہیں۔

بچپن ہی سے سر کے بال کم تھے تو ہم ان کو انکل سرگم کے نام سے بلاتے۔ شاید حج اماں کے پیٹ میں ہوتے ہی کیا تھا تو ہمیشہ لوگ ان کو حاجی کہہ کر بلاتے۔ ان کے ٹیلنٹ پر شاید ہی کسی کو شک ہو مگر انگریزی میں انہیں غیر معمولی عبور تھا اور سنج پن کے باعث اکثر کینجز بھی کہلاتے۔

موسیٰ خان جن کی رہائش شمالی ناظم آباد میں تھی اور جماعت اسلامی کے کونسلر طاہر خان کے صاحبزادے تھے۔ ڈاؤ کی سیاست میں جمعیت کے لیے انہوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ گریجویشن کے بعد میرے ہمراہ برطانیہ آئے اور کچھ برس یہاں کام کر کے امریکا منتقل ہو گئے۔ ان کی اہلیہ غزالہ بدیع بچوں کے امراض کی ماہر ہیں اور ان کا ایک بیٹا ہے۔ یہ ٹیکساس کی اسٹیٹ ہوسٹن میں مقیم ہیں۔ کارڈیالوجی ان کا خاص میدان ہے اور اس میں خاصہ نام کمایا ہے۔ موسیٰ خان کا غصہ بہت تیز تھا اور نہ صرف این ایس ایف کے ہلکا گوا اپنے گروپ کے لوگوں کو بھی ہاتھ جڑ دیتے تاہم ان پر جان بھی چھڑکتے۔ سوتے وقت بستر سے زیادہ ان کے پاس تکیے کا انبار ہوتا اور مجال ہے کوئی ان کی نیند میں خلل ڈال سکے کر جست گالیوں سے ان کی تواضع کرتے۔

زاہد اصغر ناظم آباد میں حنیف سے ایک گلی چھوڑ کر رہتے تھے۔ ان کے بھائی بہت عرصے سے امریکا میں ریڈیولوجسٹ تھے۔ زاہد کو گریجویشن کے بعد امریکا منتقل ہونے میں زیادہ وقت نہیں اٹھانی پڑی۔ رفتہ رفتہ ان کے سارے بہن بھائی بھی امریکا چلے گئے۔ زاہد نے پیتھالوجی میں خصوصی تربیت لینے کے بعد نیویارک اسٹیٹ میں تیس سال پیتھولوجسٹ کی حیثیت سے کام کیا۔ ان کے بھائی نے پہلے لاہور واپسی کی اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ”ڈاکٹرز اسپتال“ کی بنیاد رکھی۔ چھ سال قبل زاہد بھی لاہور منتقل ہو کر ”ڈاکٹرز اسپتال“ سے وابستہ ہو گئے۔

متحدہ عرب امارات میں مقیم
اردو قارئین کے لیے خوشخبری

جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز کراچی (پاکستان)
کے چاروں رسائل

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ اور ماہنامہ سرگزشت

ایک فون کال کے فاصلے پر

آپ کال کریں، مطلوبہ رسالہ آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گا۔
اردو بک ورلڈ ایف زیڈ سی۔ بزنس سینٹر، شارجہ پبلشنگ سٹی فری زون، الزاہیہ، شیخ محمد بن زاید روڈ، ای 311 شارجہ

971504805734

URDU BOOKS WORLD FZC,
BUSINESS CENTRE
SHARJAH PUBLISHING CITY
FREE ZONE, AL ZAHIA,
SHEIKH MOHAMMED BIN ZAYED RD,
E311, SHARJAH, UNITED ARAB EMIRATES

ان کی بیگم طیبہ گھریلو خاتون ہیں اور ان کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ پاکستان میں زیادہ عرصہ نہ رہ سکے اور اب پھر امریکا پلٹ گئے ہیں۔ ہم ان کو نورا کہہ کر بلاتے۔ ہمارے گروپ کے سب سے جیب بخیل تھے۔

عرفان شیخ جو ہمارے گروپ میں سب سے زیادہ خاموش طبیعت اور ٹھنڈے مزاج کے تھے، ناظم آباد 2 نمبر میں مقیم تھے۔ یہ بھی 90ء کی دہائی کے شروع میں برطانیہ آگئے اور بے ہوشی میں خصوصی تربیت لی۔ یہ نارتھ ایمپٹن میں مقیم ہیں۔ ان کی بیگم فوزیہ ان کی کزن اور ٹیچر ہیں۔ ان کے دو صاحب زادے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل دادا بن چکے ہیں۔ عرفان ہمارے گروپ میں بظاہر سب سے خاموش تھے لیکن وہ اپنا سارا لاوا شاید اپنے محلے کے لیے سنبھال کر رکھتے۔ ہمارے گروپ میں اکثر خواتین کے معاملے میں دل پھینک تھے لیکن شاید ان کی نسبت کزن کے ساتھ پہلے ہی طے ہو چکی تھی۔ ہمارے ساتھ اس قدر شرافت سے رہتے کہ ہم نے ان کا نام ٹھنڈا گوشت رکھ دیا تھا۔

شعیب چنیل ناظم آباد نمبر 3 کے رہائشی تھے۔ ان کی شادی ہمارے گروپ میں سب سے پہلے ہوئی تھی۔ ان کی بیگم زہرہ چنیل کا تعلق امریکا کی اسٹیٹ کیلیفورنیا سے تھا۔ شعیب نے ایم بی بی ایس کے فوراً بعد ہاؤس جاب کیے بغیر امریکا کا رخ کیا اور وہاں بچوں کے امراض میں تربیت لی۔ شعیب چنیل نے 2006ء میں گریجویشن کے بعد پہلی اور آخری دفعہ اس گروپ کے ساتھ کچھ وقت گزارا جس کے بعد اب وہ اس گروپ سے ناطہ توڑ چکے ہیں۔ پاکستان سے قبل برما میں تھے اور گروپ میں واحد تھے جو رات اور اکثر امتحان کے دوران لنگی پہن کر گھومتے۔ کہتے تھے کہ ہوا لگتی رہتی ہے۔ ہم ان کو پاٹلا کہہ کر بلاتے۔ ویسے تو ہم سب کو ہی ہانکنے کی عادت تھی، مگر ان کا تو بہت کمال کا تھا اور ہم اسے گھونے کا نام دیتے۔

رضوان خالق مرحوم کچھ عرصہ ہمارے گروپ میں رہنے کے بعد عبدالجبار کے گروپ میں چلے گئے تھے۔ 2010ء میں ان کا انتقال ہوا تھا۔ ہمارے گروپ کی خواتین میں آصفہ، شیبی، شمشاد مرحومہ، خیر النساء، افشاں، شفقت، شہناز، بدر منیر اور مہر النساء تھیں۔ سوائے آصفہ کے جو آج کل لاہور میں پریکٹس کر رہی ہیں، کسی اور سے ہمارا رابطہ نہیں ہے۔ اس گروپ کی خاص بات یہ ہے کہ یہ لوگ گاہے بگاہے نہ صرف ایک دوسرے سے ملتے ہیں، بلکہ اکثر

لوگوں کا گروپ چھٹیاں ساتھ مناتا ہے۔ ہم پچھلے برس ان کی ازدواج نے بھی شمولیت کی اور پورے گروپ نے گلگت بلتستان کا دس روزہ چھٹی کا پروگرام بنایا۔ اب سے کچھ ہی دن قبل ان سب نے مل کر کروشیا، مانٹی نیگرو اور بوسنیا میں چھٹیاں ساتھ گزاریں۔

احتشام ہمارے گروپ میں واحد سرجن ہیں۔ کافی خاموش طبع انسان ہیں اور شائستہ گفتگو کے عادی ہیں۔ حنیف ہی کی گلی میں تین مکان چھوڑ کر رہتے تھے۔ سب سے پہلے برطانیہ آکر پلیب کے امتحان میں کامیابی پانے والے پہلے فرد تھے جنہوں نے سب سے پہلے برطانیہ میں کام کرنا شروع کیا۔ کولوریکٹل سرجن ہیں۔ ان کی بیگم شہلا کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ ایک گھریلو خاتون تھیں۔ احتشام کے دو بیٹے ہیں۔ احتشام اور موسیٰ کی جوڑی بھی کیا خوب تھی۔ چولی دامن کا ساتھ تھا۔ ایک دوسرے کے بغیر دو دن بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ شوق بھی ایک جیسے تھے، مثلاً میوزیکل چیزوں میں دونوں کی بحث ہم سب کے اوپر سے گزر جاتی۔ پتا نہیں بس ہر وقت ووفر اور ٹوفر کا ہی ذکر ہوتا۔ بڑے بڑے اسپیکر ڈیک اور ایمپلیفائر ان کے محبوب مشغلے تھے۔ احتشام تھوڑے ضدی واقع ہوئے تھے اور ہم اکثر انہیں پیارے ضدی کہہ کر بلاتے۔

☆☆☆

27 مئی 80ء کو اناٹومی کا پہلا اور 31 مئی کو دوسرا پیپر ہوا۔ 4 اور 9 جون کو فزیالوجی اور 13 کو بائیو کیمسٹری کے پیپر کے ساتھ تھیوری ختم ہوا۔ اللہ کا شکر ہے تمام پیپر میری توقعات کے مطابق ہوئے۔ پریکٹیکل اور وائیوا تین ہفتے بعد شروع ہونا تھا۔ اس کی تیاری میں نے حنیف حاجی کے گھر کی۔ اس کے ہاں چھت پر ایک کمرا تھا۔ میں تلک والی چائے پیتا تھا وہ تھرماس میں بنا کر لے آتا۔ رات ایک ہی بستر پر سوتے۔ پتا نہیں حنیف سوتا بھی تھا کہ نہیں کیونکہ باوجود دبلا پتلا ہونے کے میرے خراٹوں کا والیوم لاؤڈ اسپیکر سے کم نہ تھا۔

جولائی کے تیسرے ہفتے میں امتحان کا اختتام ہوا اور ہماری آوارہ گردی کا دور شروع ہوا۔ اب ہم سے دو سال جونیئر کی کلاس آ گئی تھی چنانچہ ایک دفعہ پھر ہم نے پڑھانا شروع کر دیا۔ اس کلاس میں عظمت فرید کی بہن کوکب بھی ڈاؤ میں آئی تھیں۔ عظمت آرمی میڈیکل کالج میں میڈیسن پڑھ رہا تھا۔ ہمارا ڈاؤ کا بیچ مارشل لا کی وجہ سے تھوڑی تاخیر

سے چل رہا تھا۔ اس لیے عظمت ہم سے ایک کلاس آگے ہو گیا تھا۔

طالبات کے گروپس کو بڑھ جانے میں نہ صرف سیاسی کام ہو جاتا تھا، بلکہ اپنی دہرائی بھی۔ میرے کئی دوست رشک کرتے تھے کہ تم ساری اچھی لڑکیوں کو پڑھاتے ہو تو انہیں بہت جلد ہوتا ہے۔ بہر میں، شفیق الرب اور شاہد قریشی ان سب کے بھائی کہلاتے تھے۔ مجال ہے کہ کوئی صرف نام سے پکارتا ہو۔ کوئی لڑکی اچھی بھی لگتی ہو تو بھائی کا لفظ سن کر بندہ الٹا شرمندہ ہو جاتا تھا۔ ہمارے کالج میں رواج تھا کہ بندہ ایک سال بھی سینئر ہو تو لڑکا یا لڑکی سب نام کے ساتھ بھائی کہہ کر ہی بلاتے تھے۔ جن کا آنکھ لڑ جاتا ہو جاتا وہ تو بس دنیا سے بے خبر کسی کونے کھدرے میں بیٹھے ہوتے تھے۔ انہیں کالج سے بس اتنا لگاؤ تھا کہ صبح صبح پہنچ جاتے اور پوائنٹ کی بسیں جانے کے بعد بھی کئی کئی گھنٹے کیمپس کو آباد رکھتے۔ اس وقت تک زیادہ تر جوڑے ہم کلاس ہی بنے تھے۔ ہاں البتہ دو سال جونیئر کے آتے ہی کچھ جوڑے ایک یا دو سال کے فرق سے بھی بننا شروع ہو گئے تھے۔

ہر کلاس میں لڑکوں کا ایک گروہ ایسا ضرور ہوتا جو ان جوڑوں کے لیے کباب میں ہڈی ضرور بنتا۔ یہ عموماً وہ ہوتے جن کی کوئی سیاسی وابستگی نہیں تھی اور نہ ہی ان کا پڑھنے لکھنے میں دل لگتا۔ انہیں بس ان جوڑوں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جوڑے چھپ چھپا کر کسی غیر معروف کونوں میں ہی اپنا ٹھکانا تلاش کرتے۔ ہماری کلاس میں بھی ایک اسی قسم کا گروہ بے چین، اسٹوڈنٹ فیڈریشن یعنی بی ایس ایف کے نام سے مشہور تھا۔ لڑکیاں عموماً ان کو "ٹھکوں" کا لقب دیتیں اور ان بے چاروں کو کلینیکل گروپ بنانے میں بھی مسئلہ ہوتا، کیونکہ گروپ میں ستر اور تیس کے تناسب سے لڑکیاں شامل کرنا ضروری تھا۔

ہم سے دو سال جونیئر میں جو گروپ مجھ سے بہت قریب تھا وہ عظمت کی بہن کوکب کا گروپ تھا۔ تمام لڑکیاں جمعیت کی حامی اور سیاست میں بہت پُرجوش تھیں۔ روبینہ رؤف، عائشہ مقیم، شاہین شرافت، عافیہ تہذیب، نائلہ صدیقی، عمرانہ اور ریما شرف الدین سب ہی جمعیت کی جان تو ڑ حامی تھیں۔ کوکب کی شادی ہمارے اسکول کے ساتھی شاہین ملک سے جبکہ کوکب کی گروپ فیلو شاہین کی شادی ہماری کلاس کے شعیب توحید سے ہوئی اور اس طرح

انطباق (Superpose)

کسی شکل کو ایک دوسری شکل پر اس طرح رکھنا کہ دونوں کے متناظر حصے منطبق ہو جائیں۔ ایک مثلث کو دوسرے مثلث پر اس طرح منطبق کیا جائے کہ پہلے مثلث کے ضلعے اور زاویے دوسرے کے ضلعوں اور زاویوں پر ٹھیک ٹھیک بیٹھ جائیں۔ اگر دو مثلث ایک دوسرے پر منطبق ہو جائیں تو ان کے اضلاع اور زاویے باہم برابر ہوتے ہیں۔ ان برابر ضلعوں کے مقابل زاویے متناظرہ زاویے اور برابر کے زاویوں کے مقابل اضلاع متناظرہ اضلاع کہلاتے ہیں۔ اگر دو قائم الزاویہ مثلثوں کے وتر برابر ہوں اور ان کا ایک ایک ضلع بھی برابر ہو تو دونوں مثلث منطبق ہوں گے۔ منطبق مثلثوں کے رقبے بھی برابر ہوتے ہیں۔

مرسلہ: زرین مصطفی۔ ایبٹ آباد

سینئر، جونیئر، جوڑوں کا وجود رفتار پکڑتا گیا۔

ہر کلاس میں لڑکی اور لڑکوں کو ان کی انگریزی کے مطابق پہچانا جاتا۔ یعنی جو انگریزی فر فر بولتے انہیں موڈ اور وہ جن کی انگریزی کمزور ہوتی اردو میڈیم کے نام سے جانے جاتے۔ یہ لوگ ایک دوسرے میں گھلتے ملتے نہیں تھے۔ اس کے علاوہ سیاسی وابستگی سے بھی دو واضح گروپ تھے۔ جماعتی اور سرخے۔ موڈ گروپ زیادہ تر سرخوں کی حمایت کرتا۔ اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ آج سے بارہ برس قبل یعنی 2012ء میں کراچی میں ہماری کلاس کی ری یونین ہوئی تو اس میں کچھ لڑکیاں ایسی بھی تھیں جن سے میں نے کالج کے پورے سات برس بھی سلام دعا بھی نہیں کی تھی۔ میری بیگم بھی میرے ساتھ تھیں۔ کہنے لگیں: یار آپ کی کلاس فیلوز کتنی خوش اخلاق ہیں۔ میں نے بتایا کہ آج میں نے بھی ان سے زندگی میں پہلی بار گفتگو کی ہے، تو بہت حیران ہوئیں۔ پوچھنے پر میں نے بتایا۔ "اس لیے کہ ہمارا تعلق اردو میڈیم گروپ سے جو تھا۔"

28 اگست کو ہمارا نتیجہ آیا تو مرزا ہاسد بیگ کی پہلی پوزیشن تھی۔ دوسری ایس ایم سی سے تھی اور جبار کی تیسری۔ میری کراچی میں چوتھی اور ڈاؤ میں تیسری پوزیشن تھی۔ اظہار اس دفعہ پہلے تین میں نہیں تھے۔ مجھے خاص خوشی اس لیے تھی کہ کئی لوگوں نے میری فرسٹ ایئر کی حرکات دیکھ کر

کہہ دیا تھا کہ یہ اب پہلے تین تو کیا تیس میں بھی نہیں ہوگا۔

☆☆☆

ہمارے داخلے کے وقت ڈاؤ میں جمعیت کی یونین تھی۔ ستمبر 1979ء کے انتخابات میں جمعیت کے ہمایوں ظفر کو این ایس ایف کے نسیم شیخانی نے شکست دی۔ جمعیت کو مزید صدمہ اسی دن مولانا مودودی کے انتقال سے پہنچا۔ اگست 1980ء میں ہمارے پہنچنے کے آس پاس ہی الیکشن ہوئے جس میں جمعیت کے امیدوار عمر ناظم اور ضیا معیز تھے۔ بظاہر یہ دونوں بالترتیب اردو اور انگریزی کے بہترین مقرر تھے جن کی شعلہ بیانی سننے دور دور سے لوگ آتے۔ جمعیت کو پورا یقین تھا کہ اس بار تو وہ انتخابات میں ہار ہی نہیں سکتے۔ مگر اس دفعہ بھی این ایس ایف کا پینل راحیل رشید اور ناصر سلیمان کی سربراہی میں منتخب ہوا۔ اس سال جمعیت کو بہت بڑا دھچکا لگا تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ اس دن عمر ناظم کی تقریر نے مضبوط اعصاب کے لوگوں کو بھی رلا دیا تھا۔

1979ء کے انتخابات میں تو میں جمعیت کا خاموش حامی تھا۔ تاہم 1980ء کے انتخابات میں بھرپور حصہ لیا۔ اس زمانے میں ایک دو عرب طلبہ کو ٹیوشن پڑھانا شروع کی تھی اور ایک نعرہ طیبہ علی طیبہ کراچی یونیورسٹی میں بہت مشہور ہوا تھا۔ عربوں کی مدد سے اس کے الفاظ سمجھ کر اور اس میں کچھ اپنی طرف سے اضافہ کر کے اس نعرے کو میں نے ڈاؤ میں متعارف کرایا اور آگے چل کے یہ نعرہ لوگ مجھ سے منسوب کرنے لگے۔

ڈاؤ کی طلبہ تنظیم کے انتخابات کا اثر قومی سطح تک ہوتا۔ گو کہ سیاست کافی حد تک صاف ستھری ہوتی لیکن کبھی کبھار دونوں اطراف کے کچھ تیز دماغ والے لڑکوں اور ہاتھا پائی پر بھی اتر آتے۔ اس زمانے میں اسلحے کی ابتدا نہیں ہوئی تھی اور لڑائی میں لاتوں اور مکوں کا استعمال ہی کیا جاتا۔ 14 جولائی 1980ء کو این ایس ایف اور جمعیت میں جھگڑا بہت عرصہ یاد رکھا گیا کہ اس میں این ایس ایف کے دولڑکوں کو کافی چوٹیں آئیں۔ کہتے ہیں عمر ناظم کا اس میں بڑا ہاتھ تھا۔ شاید یہی اس کی شکست کا سبب بنا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

انتخابات کی سرگرمیاں اس قدر دلکش اور پرلطف ہوتی تھیں کہ اچھا بھلا اور غیر سیاسی انسان بھی اس میں شرکت کیے بغیر نہ رہ سکتا۔ انتخابات کی تاریخ آنے سے دو روز قبل ہی دونوں جماعتوں کے کارکن رسیاں اور پنیاں اپنی اپنی ڈگیوں میں رکھتے کہ اعلان ہوتے ہی اہم جگہوں پر قبضہ کر لیں جہاں اپنے بینرز لگائیں۔ گو کہ بعد میں جھگڑا ہوجاتا مگر جو پنیاں پہلے لگاتا اس کا ہاتھ اس بات چیت میں اونچا رہتا۔ انتخابات کی مہم کے دوران دن بھر دونوں جماعتوں کے جلسے ہوتے اور کارکن، لوگوں کو جمع کر کے اپنے اپنے پنڈال میں لانے کی کوشش کرتے۔ پوائنٹس کے وقت نعرے بازی ہوتی اور پھر شام کو گھر گھر جا کر لوگوں کو قائل کرنے کا سلسلہ چلتا۔

جمعیت کا موقف اسلامی نظام کا قیام تھا اور وہ لوگوں کو قرآن و سنت کے حوالے سے اپنی طرف کھینچتے۔ یہ جماعت اسلامی کی بچہ تنظیم تھی۔ سبز گنبد نبویؐ کے حوالے سے ان کی نظر میں ایشیا سبز تھا اور وہ این ایس ایف کو ماؤ اور لینن کا یار کہہ کر ان کو غیر اسلامی طرز زندگی پھیلانے کا الزام دیتے۔ جبکہ این ایس ایف ایک آزاد خیال جماعت تھی جو مذہب کو سیاست میں لانے کے مخالف اور غریبوں کے استحصال کے خلاف تھی۔ وہ ملک میں عدل و انصاف اور جمہوریت کا بول بالا چاہتے تھے۔ مارشل لاء اور ضیا کے مخالف تھے۔ ضیاء الحق جو اس زمانے میں افغانستان پر روس کے قبضے میں امریکا کے اتحادی کا کردار ادا کرتے ہوئے افغان جہاد کے لیے مذہبی جماعتوں کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ این ایس ایف کا پرچم کالا اور لال تھا اس لیے ان کے حامیوں کو سرخا کہا جاتا۔ ان کا نعرہ ایشیا سرخ جمہوریت کے علمبردار شہیدوں کے خون کی علامت تھا۔

تمام رات کارکن بینرز اور پمفلٹ کی تیاری کرتے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ایشوز تلاش کرتے۔ این ایس ایف کی مہم ہاسٹل 4 اور جمعیت کی ہاسٹل 3 سے چلتی۔ پولنگ کی رات ایک ایک ووٹ کی گنتی لاؤڈ اسپیکر پر سنائی جاتی اور باہر کالج کے طلبہ کی اکثریت بورڈز پر براہ راست دونوں کی گنتی اور تعداد دیکھ کر نعرے بازی کر رہے ہوتے۔ عموماً نتائج مکمل ہوتے ہوتے رات کے تین یا چار بج جاتے۔ میلے کا سماں ہوتا۔ آج بھی نتائج کی وہ رات کا سوچتا ہوں تو دل مچلنے لگتا ہے۔ میڈم رضیہ اور شاکر جعفری اس عمل میں پیش پیش ہوتے اور گنتی کا اعلان بھی وہی کرتے۔ انتخابات کے بعد کئی دن تک کالج میں ہو کا عالم ہوتا۔ سب جھنڈے، بینرز اور بیج اتر جاتے اور کالج پھر سے ایک تعلیم گاہ لگنے لگتی۔

ہمارے عرب شاگردوں میں وہ لوگ جو آج تک رابطے میں ہیں، ان میں سلیمان ملک مدینے میں، سعد حمیدی ریاض میں، عبدالرب مانچسٹر میں، سید علی مصر میں اور رضوان غزہ میں مقیم ہیں۔ سب نے خصوصی تربیت لے کر اسپیشلسٹ جاب پکڑی ہوئی ہے۔ کئی لوگ میڈیسن کو خیر باد کہہ کر بڑے بڑے اسپتالوں کے چیف لگ گئے۔ کافی عرصے تک سب سے رابطہ رہا، مگر اب آہستہ آہستہ زیادہ تر سے ختم ہو گیا ہے۔

اس زمانے میں ہمارے دیکھا دیکھی کئی اور لوگوں نے بھی عربوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ ہر کسی کو ہماری طرح پذیرائی تو نہیں ملی، تاہم آمدنی اچھی خاصی ہو جاتی تھی۔ بہر حال، ہمارے پاس ایک معقول رقم جمع ہو گئی تھی جو ہم نے گریجویشن کے بعد باہر ملک جا کر مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے سنبھال رکھی تھی۔

☆☆☆

فرسٹ پروف سے فراغت اور امتحانات میں ناکامی کے بعد ایک بار پھر سے تعلیمی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ ہمارے گروپ میں آصف، نجمہ، شفقت، افشاں، شمشاد مرحوم، خیر النساء، روبینہ، شہناز شامل تھیں۔ گو کہ ہمارے گروپ میں سب ہی کچھ مختلف طالبات کی اُمید کر رہے تھے، مگر ایسا ہو نہ سکا۔ وارڈز تو ہم کیا خاک جاتے تھے بس گھوم گھام کر یا حاضری لگا کر چھوٹ لیتے تھے سوائے جب کوئی پروفیسر پڑھا رہا ہو۔ ہمارا سارا زور تو بس کتابیں ہضم کرنے پر ہوتا تھا۔ پاکستان میں عالم اس کو کہتے ہیں جس نے کتابیں رٹی ہوں۔ عملی تربیت پر زور بہت کم ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے لوگ ڈگریاں لے کر ویلے پھرتے ہیں۔ اسی وجہ سے بیرونِ ملک امتحانات میں بھی رگڑا کھاتے ہیں کہ عملی تربیت کا فقدان ہوتا ہے۔

اس سال ہمارے صرف دو مضامین جنرل پیتھالوجی اور فارماکولوجی تھے۔ کئی مشکلات اور سال ضائع ہونے کے باوجود فرسٹ پروف میں تیسری پوزیشن نے ہمارا دماغ خراب کر دیا تھا اور ہمارے ذہن میں اب یہ خناس بھر گیا تھا کہ اگر اس دفعہ پورا سال محنت کریں تو پہلا نمبر بھی آ سکتا ہے۔ بس اس سال ہم نے ارادہ کیا کہ امتحان سے چار ماہ قبل ہوسٹل میں منتقل ہو جائیں گے اور جان کا زور لگا دیں گے۔ مل کر پڑھنے کی ہم سب کو عادت تھی، لہٰذا میرے، موئی اور احتشام بھی ہوسٹل آ گئے۔ شعیب اور حنیف اس سال نہیں آئے۔ زاہد عرفان تو کبھی آئے نہیں۔ وہ صرف ہم سے ملنے ہی آتے کیونکہ وہ اپنے گھر میں بیٹھ کر تیاری کرنا بہتر سمجھتے تھے۔

ہوسٹل کی بھی کیا زندگی تھی۔ ہر جگہ کی طرح وہاں بھی سیاست تھی۔ کُل چار ہوسٹل تھے۔ ایک نمبر میں زیادہ تر سندھی اور عرب تھے۔ دو نمبر پر پنجابیوں کا گروہ تھا۔ تین نمبر جس میں ہم تھے اکثریت جماعتی یا بہاری رہتے تھے اور چار نمبر این ایس ایف کا مرکز اور ساتھ میں کچھ عرب بھی وہاں مقیم تھے۔ ہر ہوسٹل میں میس تھا جہاں کھانا نہایت ہی مناسب نرخ پر ملتا۔ اکثر لوگ صرف رات کا کھانا ہی لگاتے۔ ہمارے میس کو ایک بابا جی چلاتے تھے۔ ان کی شکایت یہ ہوتی کہ لوگ وقت پر پیسے نہیں دیتے اور لڑکوں کو شکایت کہ وہ کھانا مقدار میں کم دے کر پیسے زیادہ کماتے ہیں۔ ایک گرلز ہوسٹل سول اسپتال کے داخلی گیٹ کے بائیں طرف تھا۔ ہمارا تو وہاں کبھی رسائی نہیں ہوا مگر چند جوڑے ایسے تھے جن کا قیام ہوسٹل میں تھا اور اکثر رات گئے کالج کے مختلف مقامات پر بیٹھ کر مضامین عشق پڑھ رہے ہوتے۔ ڈاؤ اور سول اسپتال کی چار دیواری میں وہ سب کچھ ہوتا جو باہر معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لوگ چھپتے بھی تو اپنے ہی دوستوں اور ہم جماعتوں سے، کیونکہ باہر والوں میں سے تو کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اعتراض کرے۔

بہر حال ہمارا مقصد تو پڑھائی تھا، چونکہ میرے گھر میں میرا کوئی کمرا تھا نہیں، امی کو میری بہت فکر رہتی تھی اس لیے روز شام کو سول میڈیکوز میں پبلک فون سے امی سے بات کرتا۔ انہیں تسلی ہو جاتی۔ اس سال وہاں باہر کینٹین میں فون نہیں تھا۔ یہ کینٹین خوشحال خان نامی بندہ چلاتا تھا۔ آج بھی وہاں کی چائے اور انڈا گھٹالا بہت یاد آتا ہے۔ اکثر اپنے کمرے سے آواز لگاتا: خوشحال انڈا گھٹالا تیز مرچوں والا بھیج دو۔ اسے پتا تھا مجھے اور موئی کو لال مرچ کے علاوہ اس میں ہری مرچ بھی کثرت سے چاہیے ہوتی تھی۔ اس سال ہمارا کمرا اگلی منزل پر تھا جس میں، میں، موئی اور چند سینئر تین چوتھائی حصے میں رہتے تھے۔ ہماری کلاس کے طلاوت خان نے ایک چوتھائی حصے کو پارٹیشن سے محصور کیا ہوا تھا۔ وہاں وہ ایک دوسرے پٹھان کے ساتھ رہتا تھا اور اکثر جب میں اور موئی زور سے بات کرتے تو وہ ناراضگی سے ٹھک ٹھک کرتا۔ کچھ عرصے بعد ہمارے حصے میں ہم سے دو سال جونیئر ظفر عزیز بھی آ گئے تھے، کیونکہ ہم نے تو

urdunovels.com

صرف وہ ملیا چار مہینے پڑھنے کے لیے ہی استعمال کرتا تھا۔
ہمارے ہوسٹل کا سیکریٹری رضوان تھا۔ کافی لوگ اس کے آگے پیچھے ہوتے۔ ہم بھی ان میں شامل تھے۔ وہ ہمارا ہی کلاس فیلو تھا۔ ہمارے ہوسٹل اور اسپتال کے راستے میں میمن برادری کا فاطمہ جاجیانی شادی ہال تھا۔ ہمارے ساتھ ہاسٹل میں ایک صاحب ایسے بھی تھے جو عموماً بن ٹھن کر روز وہاں کھانا کھانے جاتے۔ ہم نے ایک دن سوال کیا کہ ایسا کیسے کر لیتے ہو تو کہنے لگا۔ "بالکل کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ لڑکے والے سمجھتے ہیں یہ لڑکی والوں کا مہمان ہے اور لڑکی والے سمجھتے ہیں لڑکے کی طرف سے! اور اس طرح میرے میس کے پیسے بچ جاتے ہیں!"

اس سال چونکہ ہوسٹل میں ہمارا اپنا کمرا نہیں تھا اس لیے دوپہر اور شام رکشے کی سواری کر کے گلشن اور کلفٹن میں عربوں کو پڑھانے جاتا۔ اس زمانے میں ٹریفک اتنا خراب نہیں ہوتا تھا جیسے آج کل ہے۔ رات واپسی پہ پڑھائی کرتے۔ امتحان سے دو ماہ قبل میں پڑھانا بند کر دیتا تھا۔ عربوں کو پڑھا کر آمدنی اچھی ہو جاتی تھی۔ ایک آدھ دفعہ ان کے مرہونِ منت ہمیں بھی فائیو اسٹار ہوٹل میں چائے پینے کا اتفاق ہوا۔ ہم بڑے حیران ہوئے کہ جو چائے کا کپ ہم چار آنے میں پیتے تھے وہ وہاں پانچ روپے کا ملتا تھا اور عربوں کو وہ نہایت سستا لگتا۔ ایک دفعہ ان میں سے کسی نے کچھ کھانے کو منگایا تو مجھے سمجھ نہ آئی کہ وہ کیا گند بلا تھا۔ روٹی کے اوپر ہی عجیب قسم کا سالن انڈیلا ہوا تھا۔ پتا چلا پیزا ہے۔ ہم نے اس دن پہلی دفعہ کھانے والی اس مخلوق کا دیدار کیا، مگر کھایا نہیں کیونکہ یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اسے کھاتے کیسے ہیں؟

عرب طلبہ ماشاءاللہ بہت خوش حال لوگ تھے۔ کئی ایک تو پڑھائی میں مناسب تھے، لیکن زیادہ تر تعلیمی اعتبار سے بہت کمزور تھے۔ کمائی کے علاوہ ہمیں کھانے پینے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا تھوڑا تجربہ ہوا اور ساتھ ساتھ کچھ انگریزی میں گفت و شنید کی بھی عادت پڑی۔ گو کہ ہماری طرح ان کی بھی انگریزی الا ماشاءاللہ ہی تھی۔ جو زیادہ امیر تھے وہ پیسے دے کر بھی پاس ہوتے، جو کم امیر تھے وہ ہماری مدد کا سہارا لیتے اور کوشش کرتے کہ کسی طرح پڑھ جائیں، لیکن ہماری نظر میں تو وہ بھی بہت امیر تھے۔

ڈاؤ میں کئی گریجویٹس سعودیہ، کویت، قطر، عمان، مصر اور ترکی سے آئے جنہیں وہاں داخلہ نہیں ملتا، گو کہ طبی تعلیم انگریزی میں ہوتی مگر اردو سے ناواقفیت ان کے لیے مریضوں سے رابطے میں ایک بڑی مشکل پیدا کرتی۔ ہمارا وہ ڈاؤ کے اچھے طلبہ سے تدریس کی مدد سے یہ کمی پوری کرنے کی کوشش کرتے۔ عربوں کے پڑھانے سے تھوڑا بہت عربی سیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔

سب سے زیادہ لڑکے عرب، یمن یا فلسطین سے تعلق رکھتے اور ان کی اکثریت کو نہ صرف پڑھائی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، بلکہ کئی ایک شراب اور نشے کے بھی عادی تھے۔ چونکہ ان کے پاس پیسے کی فراوانی تھی اس لیے اکثریت کے پاس گرل فرینڈز بھی تھیں۔

☆☆☆

اپریل اور مئی کا مہینا تھا۔ تیاری زوروں پر تھی۔ میں اور موسیٰ شام تک لائبریری میں پڑھتے اور رات ہوسٹل میں۔ رات کو جب بھوک لگتی تو نیچے ابراہیم چاچا یا رشید چاچا کو آواز لگاتے اور ان سے کھانا منگواتے تاکہ وقت ضائع نہ ہو۔ دونوں کو بہت ناگوار گزرتا۔ یہ ہمارے ہوسٹل کے نیچے بینچ پہ سوئے ہوتے۔ ابراہیم چاچا تو کافی بزرگ تھے۔ دن میں لطیف آ کر کمرے کی صفائی بھی کر دیتا۔ اکثر شام کو جب گھر فون کرنے جاتا تو جبار کو فون کر کے ٹوہ لگاتا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے اور کیسے تیاری کر رہا ہے۔ جبار اس سال میرا ہدف تھا کیونکہ اس کو ہرا دیا تو پہلی پوزیشن آ جائے گی۔

31 مئی کو پہلا پرچہ جنرل پیتھو کا تھا۔ اس سے ایک رات قبل نہ جانے کیوں ایسا لگا مجھے کچھ یاد نہیں۔ سوچ سوچ کر گھبراہٹ ہو رہی تھی اور بالکل نروس بریک ڈاؤن والی کیفیت تھی۔ مجھے یاد ہے مرحوم عبدالمطلب نے بڑی ہمت بندھائی۔ گھبراہٹ میں ہی نیند آ گئی۔ خیر، دوسرے دن پیپر اچھا ہو گیا۔ چار دن بعد فارما تھا وہ بھی زبردست ہوا۔ وائیوا کچھ دن بعد تھا اور اسی دوران روزے شروع ہو گئے۔ اس زمانے میں پورے روزے رکھتے، حالانکہ بہت گرمی تھی۔ اظہار نے رٹلن کی گولی کا بتایا تھا کہ اس سے نیند بھاگ جاتی ہے اور توجہ اچھی ہو جاتی ہے۔ جس دن پڑھائی کم ہوتی اس رات یہ گولی کھا کر پوری رات جاگتے۔

ان دنوں نازیہ حسن کے گانے بہت مشہور ہوئے تھے اور آج بھی سنو تو بندہ فوراً جون 81ء میں چلا جاتا ہے۔ 14 جون کو پریکٹیکل اور وائیوا تھا۔ میڈم سلمیٰ اور اکرم صاحب کے علاوہ کاظمی صاحب اور لاڑکانہ سے بھی ایک پروفیسر حسن میمن آئے ہوئے تھے۔ جبار کا امتحان مجھ سے ایک دن

پہلے وہ تھا کیونکہ اس کا نام اے سے شروع ہوتا اور آگے ہی دن ہمارا ہوتا۔ اس دن جبار کو فون کر کے پوچھا تو وہ آ گیا۔ ایسا ہی کر گیا۔ اس معاملے میں وہ تھا نا کہیں تھا کیونکہ اسے بھی معلوم تھا کہ میں اس کے مقابلے پر ہوں۔ خیر، دوسرے دن پیپر ادا ہوا۔ میڈم اور کاظمی صاحب نے تو بھی سوال پوچھے پر جب ہم دوسری جانب اکرم صاحب کے پاس پہنچے تو انہوں نے کافی دیر عجیب سوال پوچھے۔ مجھے بھی مدد کی کہ ہر سوال کا جواب دیا یہاں تک کہ اکرم صاحب نے بے دلی سے شکن کو کہا۔ ”اسے ناک آؤٹ کرو۔“ وہ بھی کافی دیر پوچھتا رہا۔ لگتا تھا وہ ہمارا دن تھا کہ اچھے اچھے شاٹ آسانی سے کھیلے گئے۔ یہی حال ہمارا احمد صاحب اور چیلہ رام کے ساتھ قارما میں بھی ہوا۔

نتیجہ میں نتیجہ آیا اور بالآخر اس سال ہم نے جبار کو ہرا ہی دیا۔ اس سال کسی کی ڈسٹنکشن نہیں آئی تھی اور دونوں مضامین میں سب سے زیادہ نمبر ہمارے ہی تھے سوائے رول آنر کہا جاتا تھا۔ 300 میں سے 225 پر ڈسٹنکشن تھی اور ہمارے نمبر 222 اور 223 تھے۔ نتیجے کے دن ہم کالج ہی میں موجود تھے۔ جماعتیوں نے فوراً کاندھے پر اٹھایا اور نعرۂ تکبیر اللہ اکبر اور جمعیت جمعیت کے نعرے لگانے لگے جیسے ہم کہیں اسلام کی جنگ فتح کر کے آئے تھے۔ وہ پہلی دفعہ تھی جب ہم نے پہلی پوزیشن لی تھی۔ اس کے بعد یہ کارنامہ ہم نے 2009ء برطانیہ کے ایم بی اے امتحان میں کیا جب کلاس میں بیس گوروں کو پچھاڑ کر ہم نے اول پوزیشن لی تھی۔

1981ء میں علاقائی تنظیموں نے اتنا زور نہیں پکڑا تھا صرف پی ایم او سرگرم تھی۔ اگرچہ میں پنجابی تھا مگر پلا بڑھا کراچی میں۔ لہٰذا اکثر لوگ مجھے پنجابی کے نام پر دھبا کہتے اور کچھ نے تو میرا نام کراچی کا مچھر رکھ دیا تھا۔ مجھے پنجابی بھی بہت کم آتی تھی۔ سمجھ لیتا مگر بولتا تو لوگ مذاق اڑاتے۔ پی ایم او کے زیادہ تر لوگ سرخے تھے۔ فرسٹ پوزیشن آنے کے کچھ ہی عرصے بعد مجھے پی ایم او والوں نے اپنا جوائنٹ سیکریٹری بنا دیا۔ شاید ان کا خیال تھا کہ اس طرح میں این ایس ایف کی طرف مائل ہو جاؤں۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد انتخابات میں ایک دفعہ پھر ہم جمعیت کے لیے زور شور سے کام کرتے رہے اور جلسوں میں ”طیبہ علی طیبہ“ کے نعرے لگاتے رہے۔ بس پھر کیا ہمیں پی ایم او سے نکال باہر کیا گیا۔ کالی پنجابی ہوسٹل 2 کی طرف جاتے ہوئے جب ہمارے ہوسٹل کے سامنے سے گزرتے تو شدید نفرت سے ہمیں دیکھتے۔ ان انتخابات میں مرحوم قاضی تنویر عزیز، سہیل بٹ، طارق شہاب اور جمیل اعظم فاروقی سمیت جمعیت کا پورا پینل حتیٰ کہ سوشل سیکریٹری بھی منتخب ہو گیا۔

انتخابات کی مہم میں جمعیت کی کافی خواتین کے ساتھ کام کرنے کو ملا۔ بس اسی دوران ہمیں ایک خاتون نے

ہمارا ایمان ہے کہ کسی کو محبت سے کھانا کھلانے سے انسان آفات الٰہی سے محفوظ رہتا ہے۔ ایک مشہور حکایت ہے جب فرعون کا ظلم و ستم اور نافرمانیاں حد سے تجاوز کر گئیں تو فرشتوں نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا کہ پروردگار اس سرکش بندے کو جو خدائی کا دعوے دار بھی ہے آخر اتنی ڈھیل کیوں دی جا رہی ہے؟ اس کی پکڑ کیوں نہیں ہوتی؟ ارشاد ہوا کہ اس کے دستر خوان (مہمان خانے) سے ایک ہزار غریب مسکین مسافر اور نادار صبح کو اور اتنے ہی رات کو کھانا کھاتے ہیں۔ مجھے زیب نہیں دیتا کہ جو میرے بندوں کو بغیر کسی غرض کے رزق پہنچا رہا ہے میں اس کا تختہ کیسے الٹوں۔

بہرحال جب فرعون کو کیفر کردار تک پہنچانے کا آسمانی فیصلہ ہو ہی گیا تو اس پر عمل درآمد یوں ہوا کہ فرعون کے وزیر ہامان کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ صبح اور شام کے یہ دو ہزار مفت خورے سرکاری خزانے پر بار ہیں۔ اس نے فرعون کو سمجھایا کہ ان کاہلوں اور نکموں کی سرپرستی بہت ہو گئی اب یہ رسم بند ہونی چاہیے۔ فرعون نے پہلے تو ہامان کا مشورہ یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ اس کے آباؤ اجداد کے زمانے سے ایسا ہوتا آ رہا ہے لیکن ہامان کے مسلسل اصرار پر اس نے ایک وقت کا کھانا بند کرا دیا۔ کچھ عرصے بعد ہامان نے اسے باور کرایا کہ جس طرح ایک وقت کے کھانے کا بندوبست لوگ خود کرنے لگے ہیں اسی طرح دوسرے وقت کا بھی کر سکتے ہیں۔ فرعون نے اس کی بات نہیں مانی لیکن کھانے والوں کی تعداد آدھی کر دی۔ ہامان کے اکسانے پر یہ تعداد بتدریج گھٹتی گئی اور سرکاری خزانہ بھرتا گیا۔ یہاں تک کہ صرف دو کھانے والے رہ گئے۔ پھر ایک رہ گیا۔ اگلے روز جب اسے بھی لوٹا دیا گیا تو وہ فرعون کا آخری دن تھا۔ جب وہ اپنے لاؤ لشکر سمیت غرقاب ہو گیا۔

بہت جتا دیا۔ کوئی لڑکی بات نہیں تھی۔ اگر کوئی بندہ یہ کہے کہ پانچ سالوں میں اسے کوئی خاتون اچھی نہیں لگی تو یہ سراسر جھوٹ ہوگا۔ یہی بات خواتین کے لیے بھی کہوں گا۔ اکثر اوقات تو لڑکوں کو ایک سے زیادہ لڑکی اچھی لگتی ہے۔ ہمارا ماحول اس زمانے میں کافی کنزرویٹو تھا لہٰذا اکثر عشق یک طرفہ ہی ہوا کرتے تھے۔ سوائے چند جوڑوں کے اکثریت تصوراتی عشق کا ہی لطف اٹھاتی تھی۔

☆☆☆

ڈاؤ میڈیکل کے شب و روز بھی کمال تھے۔ تعلیم، سیاست، لطف اندوزی اور عشق و عاشقی سب ایک ساتھ نظر آتے کیونکہ کسی کے امتحان چل رہے ہوتے تو کوئی بالکل فارغ ہوتا۔ کوئی پکنک میں تو کوئی ڈائسیکشن ہال میں۔ کوئی پریکٹیکل میں تو کوئی لیکچر میں۔ کوئی خود پڑھتا اور کوئی صرف لڑکیوں کو پڑھا رہا ہوتا۔

امتحانات سے کچھ عرصہ قبل پوری کلاس منظر عام سے غائب ہو جاتی۔ کبھی کوئی نظر بھی آتا تو چہرے پر تناؤ اور سنجیدگی کے بارہ بجے ہوتے۔ کچھ لوگ جنھیں کالج سے بے پناہ عشق ہوتا وہ اس دوران بھی لائبریری میں پڑھتے یا پڑھتے دکھائی دیتے۔ دوران امتحان باہر کچھ لوگ پرچوں کی سپلائی لائن کا کردار ادا کرتے۔ 1986ء سے قبل نقل بھی باعزت طریقے سے ہوتی، یعنی لوگ یہ کام چھپ چھپا کر کرتے اور شرم محسوس کرتے۔ بعد میں تو کھلا کھاتا تھا۔

تازہ تازہ امتحان سے فارغ ہوئے ہوتے ان کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی رونق ہوتی۔ زیادہ تر سیاسی کاموں میں ہاتھ بٹاتے اور فراغت کا فائدہ اٹھاتے۔ کچھ لوگ جونیئرز کی کلاسز لیتے اور کچھ لینڈنگ لائبریری، کو آپریٹو اسٹور یا ٹرانسپورٹ کا انتظام چلا رہے ہوتے۔ موسم ابر آلود ہوتا تو پکنک لازم ہو جاتی۔ جن کو اور کوئی مصروفیت نہ ملتی وہ کیمل سٹ بناتے یا لڑکیاں تاڑتے۔ سیاست کا حال تو آپ نے پچھلے صفحات میں پڑھ ہی لیا ہے۔

کہیں ہم مزاج لڑکے لڑکیوں کا گروپ گپ شپ میں مصروف ہوتا تو کہیں لڑکیوں کا گروپ ''ایم ایم ٹری'' کے نیچے ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف ہوتا۔ کچھ لڑکیاں صحن آڈیٹوریم کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر قہقہے لگا رہی ہوتیں۔ اسنیک کارنر، اسپورٹس ایرینا اور اناٹومی میوزیم لڑکوں کی پسندیدہ جگہیں تھیں۔ اناٹومی لیکچر ہال اور صحن آڈیٹوریم کے پیچھے کا حصہ نئے جوڑوں کے لیے سب سے محفوظ جگہ تھی۔ بات آگے بڑھتی تو ڈاکٹر کیفے کے سامنے ایرانی ہوٹل میں رومانس آگے بڑھتا اور بات پکی ہونے پر تو ہر وقت ساتھ رہتا، چلنا، پڑھنا اور کھانا کھانے تک میں بھی ساتھ بیٹھنا ہوتا۔

میرے مشاہدے کے مطابق کالج میں جو بھی جوڑے بنے اور جنھوں نے بعد میں شادی بھی کی ان کی کبھی طلاق سننے میں نہیں آئی اور جنھوں نے یک طرفہ عشق کیا وہ کبھی کامیاب ہوتے نظر نہیں آئے۔ ہمیں جو لڑکی پسند آئی اسے جیسے ہی اس بات کا پتا چلا کہ ہم ان میں دلچسپی رکھتے ہیں ان کے پورے گروپ نے ہی ہم سے بات کرنا چھوڑ دی، حالانکہ ہم جماعتی تھیں۔ ہمارے گروپ میں ایک صاحب اپنی کلاس کی ہی خاتون سے فرسٹ ایئر سے فائنل تک پیار کرتے رہے، پر بات اس سے آگے نہ بڑھی۔ ایک اور صاحب کا دل ہر خاتون پر آیا ہوتا، مگر کوئی انھیں لفٹ نہ کراتی۔ ایک صاحب نے تو ہر کلاس سے ایک خاتون پر فوکس کیا ہوتا تا کہ اگر ایک امتحان میں مصروف ہو تو باقی کالج آتی رہیں اور ان کا دل بہلا رہے۔ ایک صاحب تو اپنے یک طرفہ عشق میں اس قدر سنجیدہ تھے کہ اپنی خاتون کی پوائنٹ بس میں روز سوار ہو کر راؤنڈ ٹرپ لے کر آ جاتے۔

کھانے کا بھی عجیب لطف تھا۔ اسنیک کارنر کے سموسے، چائے یا بن کباب کے ساتھ اور کینٹین کا بریانی، مصالحہ کڑاہی اور چکن جلفریزی جیسا مزہ پھر کسی کھانے میں آج تک نہیں آیا۔ پوائنٹ کی بس جیسی سواری پھر نہ نصیب ہوئی۔ کچھ لوگ میڈیکل ٹاپکس پر ایک دوسرے کو امپریس کر رہے ہوتے تو کچھ وائیوا میں پوچھے گئے سوال جواب نوٹ کر رہے ہوتے۔ کچھ کی نظریں اپنی پسندیدہ پر لگی ہوتیں۔

اسنیک کارنر کے بابا جی، کینٹین کے بھورے بالوں والے چچا ناصر فوٹو گرافر اور شہاب الدین عرف شاہو ڈاڈا کالج کے آئی کون تھے۔ آج بھی کالج کے شب و روز کا سوچوں تو یہی ذہن میں آتا ہے:

یہ دولت بھی لے لو یہ شہرت بھی لے لو
بھلے چھین لو مجھ سے میری جوانی
مگر مجھ کو لوٹا دو ڈاؤ کا ساون
وہ کالج کی پکنک وہ دورِ شادمانی

بقیہ واقعات اگلے شمارے میں

رحمٰن کے مہمان

محمود شام

اساتذہ میں شمار کیے جانے والے قلمکار کا قلم چلے تو نو آموز لکھاریوں کے لیے اسباق کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ زیرِ نظر تحریر نہ صرف ایمان کی تازگی کا باعث ہے بلکہ الفاظ کے صحیح استعمال، روداد کو مربوط کرنے کا فن بھی سامنے آتا ہے۔

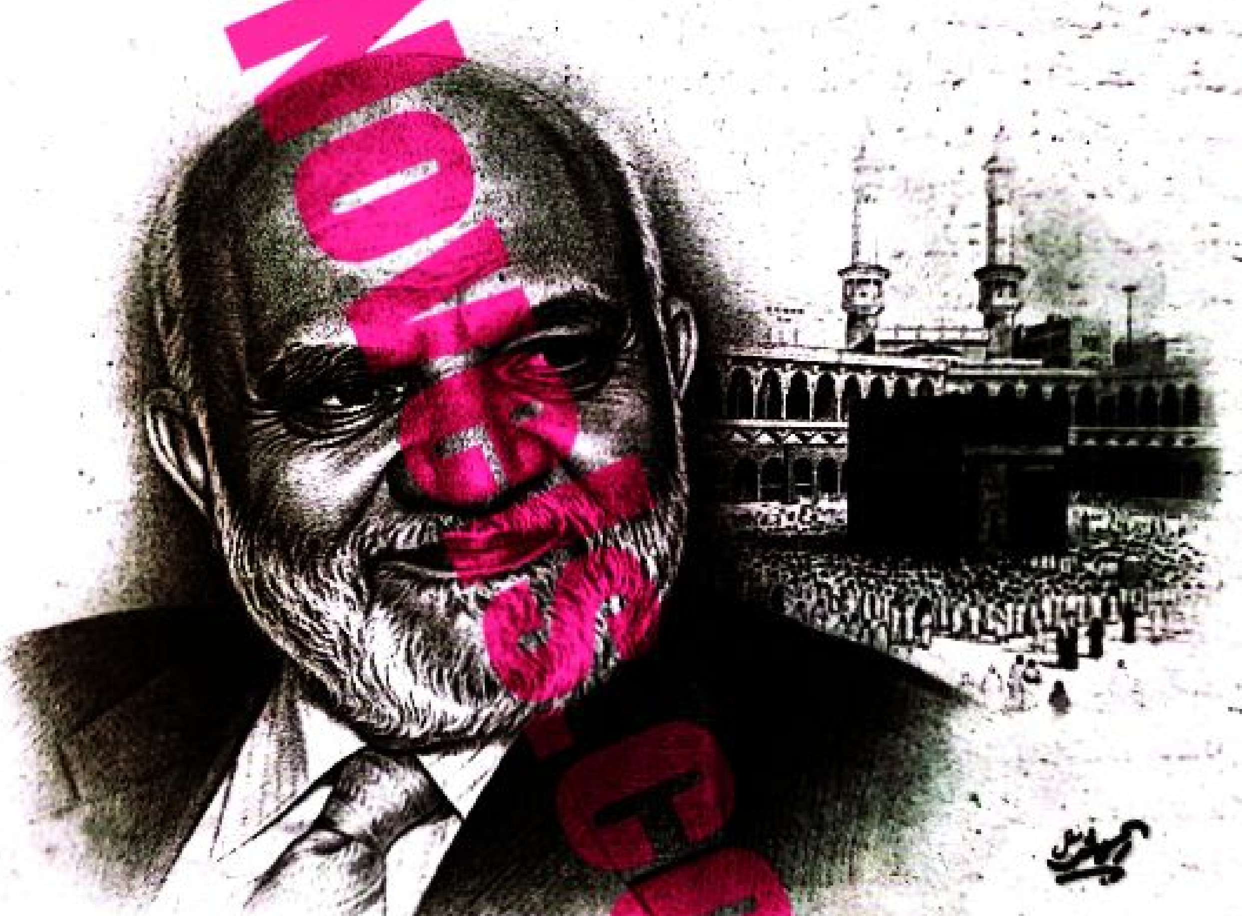

ایسی دلچسپ تحریر کم کم ہی لکھی گئی ہے

میں طارق محمود شام، بیگم بلقیس بانو، بیٹا سلیم محمود، ہمارے ہم محلہ شاہد مہتاب، ان کی بیگم یاسمین شاہد، ایک مقدس سفر کے عزم کے ساتھ شارع فیصل سے ایئرپورٹ کی سمت رواں ہیں۔ آج کراچی کے درودیوار، شارع فیصل، بالکل مختلف دکھائی دے رہے ہیں۔ یہاں سے پہلے بھی گزرے ہیں۔ پہلے بھی بہت سے اندرونی و بیرونی سفر کیے ہیں۔ بہت سی منزلیں سر کی ہیں، مگر یہ سفر کچھ اور ہے۔ اس کی منزل، منزلِ حقیقی ہے۔ دل اور ذہن آج پہلی بار ہم خیال ہیں۔ یہ مسافت توحید کی تائید کے لیے ہے۔ یہ فاصلے اپنے عہد کی تجدید کے لیے طے ہو رہے ہیں۔

کراچی ایئرپورٹ کی مسجد کا مینار ہر سفر کے آغاز یا اختتام پر دعوت نظارہ دیتا رہا ہے لیکن آج ہم وہاں قادر مطلق کے سامنے سر جھکا رہے ہیں۔ پہلی بار یہاں قدم رکھا ہے۔

اللھم افتح لی ابواب رحمتک (اے اللہ ہم پر اپنی رحمت کے دروازے کھول دے) سنگ مرمر کا فرش گیلا ہے۔ بارش کے آثار موجود ہیں۔ احتیاط سے چل رہے ہیں۔ نماز فجر کی باجماعت... اور کئی برسوں بعد۔ لڑکپن جھنگ میں ہوتے تھے۔ عین جوانی میں۔ اپنے عظیم والد حکیم صوفی شیر محمد کی معیت میں مسجد میں۔ مسجد میں نمازیں باجماعت پڑھتے تھے۔ پھر دنیاداری، لہو ولعب، غفلت، کوتاہی، گناہوں کے بازار میں خرید و فروخت میں لگے رہے۔ دنیوی بادشاہوں کے درباروں میں حاضری کے اشتیاق میں بادشاہوں کے بادشاہ کے دربار میں حضوری فراموش ہوتی رہی۔ آج کی صبح ایک تسکین اور راحت لے کر مجھے اپنی آغوش میں لے رہی ہے۔

یہ جہاز زندگی پہلے ایسی منزلوں کی طرف لے جاتا رہا ہے جو کاروباری تھیں۔ سیاسی تھیں۔ بین الاقوامی تھیں۔ آج سعودی ایئر لائنز کی پرواز ایس وی 703 ہمیں اس منزل کی طرف لے جارہی ہے جس کی تمنا ہر کلمہ گو کو رہی ہے۔ ہر صاحب استطاعت پر زندگی میں ایک بار حج فرض ہے اور یہ اسلام کے بنیادی پانچ ارکان میں سے ہے۔ 1 شہادت۔ 2 صلوٰۃ۔ 3 صیام۔ 4 زکوٰۃ۔ 5 حج۔

میں صاحب استطاعت تو برسوں سے تھا۔ یہ فرض کیوں ادا نہ کرسکا۔ سرکاری حج وفود میں شرکت کی پیشکشیں مختلف ادوار میں ہوتی رہی ہیں۔ مولانا کوثر نیازی سے نیاز حاصل رہا۔ وفاقی وزیر مذہبی امور تھے بھٹو صاحب کے زمانے میں۔ صحافی بھی تھے۔ شاعر بھی۔ بہت خیال رکھتے تھے۔ مگر دل اور ضمیر یہ کہتے رہے کہ یہ سفر اپنے خرچ پر ہونا چاہیے۔ مختلف وزرائے اعظم کے ساتھ دوروں میں، بادشاہوں کے محلات میں، صدر کے ایوانوں میں، وائٹ ہاؤس، کریملن، چیپلز گریٹ ہال، چیلسی پیلس، راشٹرپتی بھون، 10 ڈاؤننگ اسٹریٹ، سرکاری خرچ پر جاتے رہے ہیں۔ سعودی عرب بھی شاہ کے محل میں، ریاض میں جانا ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے میری خواہش کی لاج رکھی۔ آج اپنے خرچ پر یہ سعادت حاصل کرنے کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔

سعودی ایئر لائنز کے کاؤنٹر کے سامنے قطار لگی ہے۔ احرام باندھے اللہ کی توحید کی اور محمدؐ کی رسالت کی شہادت دینے والے۔ سامان جمع کروانے اور بورڈنگ کارڈ کے حصول کے لیے کھڑے ہیں۔ کبھی کبھی آواز بلند ہوتی ہے

لبیک اللھم لبیک لا شریک لبیک
ان الحمد والنعمۃ لک والملک
لا شریک لک

☆☆☆

ہماری بیگم کئی برس سے اصرار کررہی ہیں کہ ہمیں حج کا فرض ادا کرلینا چاہیے۔ اس بار ہم نے سرکاری حج میں شمولیت کے لیے درخواستیں دی ہیں لیکن نامراد رہے ہیں۔ ارادہ مصمم ہے۔ پرائیویٹ حج کے لیے بیٹے نے مختلف گروپوں سے رابطے کیے ہیں۔ بالآخر ختم نبوت حج گروپ پرائیویٹ لمیٹڈ سے معاملات طے پاجاتے ہیں۔ حج گروپ آرگنائزر اسکیم کے تحت ہم 18 دن کے لیے روانہ ہورہے ہیں۔ اپنے طور پر تو ہم نے مناسک حج کے بارے میں تفصیل سے پڑھا بھی۔ تین اتوار پرانی نمائش پر واقع مجلس تحفظ ختم نبوت کی مسجد میں باقاعدہ تین چار گھنٹے کی تربیتی ورکشاپ بھی ہوتی رہی ہیں۔ حج کے سارے مراحل کے بارے میں مفتی خالد محمود بہت ہی محبت سے، شفقت سے درس دیتے رہے ہیں کہ کیا کیا کرنا ہے، 18 دن کیسے گزارنے ہیں، اللہ کے حضور کیسے گڑگڑانا ہے۔ کراچی ایئرپورٹ سے روانگی سے لے کر خانہ کعبہ کے مینار نظر آنے پر۔ طواف، سعی، منیٰ میں قیام، عرفات، مزدلفہ، جمرات، قربانی، طواف زیارت، طواف وداع۔ مدینہ منورہ میں حاضری۔ پیارے نبیؐ کے روضے پر سلام کیسے پیش کرنا ہے۔ مسجد نبوی میں باجماعت نمازوں کے آداب۔

امیگریشن والے بھی دوسرے سفروں کے مقابلے میں مختلف لگ رہے ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ ان کے کاؤنٹر سے بھائی بہنیں بزرگ ایک انتہائی مقدس سفر کا عزم کیے ہوئے ہیں اس لیے انہیں پوری محبت سے عقیدت سے رخصت کرتا ہے۔

لاؤنج میں بھی مختلف سماں ہے۔ پرواز کا انتظار ہے لیکن کوئی شور وغل نہیں۔ مرد حضرات۔ خواتین۔ اکثر کے ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں۔ سب بار بار سبق دہرا رہے ہیں۔

urdunovels.com

"سعودی ایئر لائنز کی پرواز ایس وی 703۔ جدہ روانہ ہو رہی ہے۔ مسافر حضرات گیٹ نمبر 25 سے جہاز میں سوار ہو جائیں۔"

کراچی سے جدہ ہم تین گھنٹے 45 منٹ میں پہنچ جائیں گے۔

اکیسویں صدی میں ٹیکنالوجی نے یہ سفر کتنا آسان اور مختصر کر دیا ہے۔ کبھی فاصلہ اونٹوں پر کئی مہینے میں طے ہوتا تھا۔ پھر ٹرین اور بسوں کے ذریعے ہفتوں میں۔

کراچی سے مکۃ المکرمہ 1745 میل۔ 2808 کلومیٹر۔

☆☆☆

مجھے زمانے یاد آ رہے ہیں۔ بزرگ اپنے سارے رشتے داروں سے مل رہے ہیں۔ کہا سنا معاف کروا رہے ہیں۔ اپنے شہر کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی جا کر ملاقاتیں کرتے ہیں۔ معافی مانگ رہے ہیں۔ زیادہ تر سوچ یہ ہے کہ لمبا سفر ہے۔ معلوم نہیں لوٹ سکیں گے یا نہیں۔ اکثر کی تو یہ خواہش ہے کہ مکے مدینے میں دم نکلے تو بڑے نصیب کی بات ہو گی۔

ایک دور یہ بھی ہے کہ اس مقدس سفر کے لیے بحری جہاز میسر ہیں۔ بہت کم کرایہ۔ الشمس یاد آ رہا ہے۔ ملک کے وزیر اعظم یا صدر عازمین حج کو کراچی کی بندرگاہ سے الوداع کہہ رہے ہیں۔ کراچی کی خوش نصیبی ہے کہ یہاں بندرگاہ پر بھی

لبیک اللھم لبیک لا شریک لبیک
ان الحمد والنعمۃ لک والملک
لا شریک لک

کی صدائیں گونجتی رہی ہیں اور ایئرپورٹ پر بھی۔ ان دنوں حج پروازوں سمیت ساری بین الاقوامی پروازیں صرف کراچی سے جاتی رہی ہیں۔

اب تو اسلام آباد، لاہور، پشاور، ملتان، کوئٹہ، سیالکوٹ کبھی شہروں کو یہ اعزاز حاصل ہو گیا ہے۔ اعلان ہو رہا ہے۔ چند منٹ بعد ہم میقات کے مقام سے گزریں گے۔ جو حضرات احرام باندھنا چاہتے ہیں۔ تیاری کر لیں۔

چند منٹ گزر گئے ہیں۔ ہم میقات کے مقام سے گزر رہے ہیں۔ پورا جہاز

لبیک اللھم لبیک لا شریک لبیک
ان الحمد والنعمۃ لک والملک
لا شریک لک

کی روح پرور آوازوں سے گونج رہا ہے۔

ہم حج تمتع کر رہے ہیں۔ زیادہ تر خواتین و حضرات حج کی اسی قسم کا انتخاب کرتے ہیں اور اسے دوسری دو قسموں حج افراد اور حج قران کی نسبت آسان خیال کیا جاتا ہے۔ ہم حج کا مہینہ شروع ہونے کے بعد روانہ ہو رہے ہیں۔ گھر پر ہی احرام باندھ لیا ہے۔ صرف عمرے کی نیت سے۔ مکہ مکرمہ پہنچتے ہی اس احرام سے ان شاء اللہ عمرے کے تینوں مراحل طے کریں گے۔

پہلے بیت اللہ کا طواف۔ پھر صفا و مروہ کی سعی۔ اس کے بعد حلق۔

☆☆☆

کتنی سرعت سے ہم حجاز کی سرزمین میں داخل ہو گئے ہیں۔

زمانے ہیں کہ اس آرزو میں افریقہ، ایشیا، یورپ، مشرق وسطی سے اونٹوں پر قافلے چل رہے ہیں۔ جگہ جگہ بدو، خطرات، بے آب و گیاہ سرزمین۔ جنگل، صحرا پھر بھی کلمہ گو اپنا فرض ادا کرنے کے لیے سب کچھ بھول کر آگے بڑھ رہے ہیں۔

جنوبی عمان سے قبل از موٹر حج سفر:

یہ مسقط ہے۔ ہمارا برادر ملک جس سے ہم نے گوادر کی بندرگاہ خریدی۔ جواب ہمارے لیے خوشحالی کا سرچشمہ بن رہی ہے۔ دیکھیں یہ کتنی مشکل سے سفر حج کا فریضہ ادا کرتے تھے۔

1970 کے عشرے تک جنوبی عمان سے خشکی کا سفر موٹر کے بغیر ہی تھا۔ لوگ حج کے لیے مکہ پیدل جاتے یا اونٹوں پر۔ بہت سے قافلوں کی شکل میں اور کچھ انفرادی طور پر بھی۔

ظفار سے پیدل جانے والے یمن کے ساحل تک پیدل سفر کرتے۔ مغرب کی طرف جاتے تو درمیان میں یمن کی پہاڑیاں بھی آتیں یا مشرق کی طرف خلیج کے راستے۔ مشرق کی جانب سفر کرنے والے شارجہ یا ابوظہبی سے قطر جاتے۔ پھر خشکی سے سفر جاری رکھتے۔ سفر کے آخری حصے صنعا کے شمال یا قطر کے جنوب میں قافلوں میں شامل ہو جاتے۔

یہ سفر طویل بھی تھے۔ اطلاع کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا تھا۔ ان کے قبیلے یا خاندان والے سمجھتے کہ وہ راستے میں چل

UrduNovels.com

بے ہیں۔ بہت زیادہ بوجھ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اس لیے بکرے کی کھال کے تھیلے۔ پانی کی چھاگلیں۔ کپڑوں کا ایک جوڑا۔ کھانے کے لیے کھجوریں۔ سوکھی مچھلی۔ لوبیا، چنے کا آٹا۔ جسے گوندھ کر راستے میں دہکتے پتھروں پر روٹی پکائی جاتی۔

واپسی پر بوجھ کے باعث بہت سے حجاج آب زم زم بھی نہیں لاتے تھے۔ اکثر حجاج کرام واپسی میں کئی مہینے لگ جاتے۔ وہ [illegible] آتے۔ خواتین کے لیے اسکارف یا کمبل خریدتے۔ کمبل بہت اہم تھے کیونکہ یہ ظفار میں دستیاب نہیں تھے۔

1950 میں ایک عمانی اپنے ماموں کے سفر حج کی داستان سناتا ہے۔

میں ایک شخص کی کہانی سنانے جا رہا ہوں۔ جب ٹرانسپورٹ نہیں تھی۔ نہ جہاز نہ کار صرف اونٹ تھے۔ حج کے لیے وہ شخص بے تاب تھا۔ وہ کہتا تھا میں حج پر جا رہا ہوں۔ وہ حج کے بارے میں سوچتا رہتا۔ وہ اپنے ماں باپ کو بھی نہیں بتاتا تھا۔ کیونکہ اسے ڈر تھا کہ وہ منع کر دیں گے۔ وہ اکیلے پر بھروسا نہیں کر سکتے تھے۔ ان دنوں سفر بہت دشوار تھے۔ یقین ہی نہیں ہوتا تھا کہ کے پہنچ سکیں گے۔ اس نے یہ بتایا کہ مختلف شہر دیکھنے جا رہا ہوں۔ پھر واپس آؤں گا۔ وہ ایک شہر میں گیا۔ والدین کے لیے کپڑے اور کھانے کا سامان خریدا۔ اپنے والدین کو ایک شخص کے ہاتھوں بھیج دیا۔ اور اس شخص سے کہا کہ میرے والدین کو بتانا میں حج پر جا رہا ہوں۔ وہ میرے لیے پریشان نہ ہوں۔ یہ شخص پیدل ہی گیا۔ پہلے جبل قمر، پھر جوداب، جان، پھر خیاش، مکالا کی طرف سفر جاری رکھا۔ راستے میں کوئی اور بھی مل گیا۔ پھر وہ مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ ایک یا ڈیڑھ مہینا لگا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے کامیابی دی۔ اس کی نیت صاف تھی۔ اس لیے سب کچھ اس کے حق میں رہا۔ اس کے پاس بہت کم پیسے تھے جب یہاں سے روانہ ہوا۔ جو اس کے کھانے پینے کے لیے کافی تھے۔ اگر آپ کی نیت اچھی ہو تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ اللہ قدم قدم مدد کرتا ہے۔ حج کے بعد وہ واپس آیا۔ شارجہ کے ذریعے۔ وہاں اس نے چھ سات مہینے کچھ کام کیا۔ وہ وہاں سے اپنے والدین کو پارسل بھیجتا رہا اور کچھ رقم بھی۔ اس نے کمبل بھی بھیجے۔ اس زمانے میں اگر آپ کے پاس کمبل ہیں تو آپ زندہ رہیں گے۔ یہاں کی سخت سردی شدید بیمار کر دیتی تھی۔ لوگوں کے پاس کپڑے نہیں ہوتے تھے۔ بہت سے اپنے روز کے لباس میں ہی سو جاتے تھے۔ اس زمانے میں بچھونا صرف گائے کی کھال کا ملتا تھا۔ وہ اس کھال کو چٹائی کی طرح استعمال کرتے۔ وہ اس کی صفائی کرتے اور اس قابل بنا لیتے کہ چٹائی کی طرح استعمال ہو سکے۔ جب کمبل آتے تو وہ فخر سے بتاتے کہ فلاں نے بھیجے ہیں۔ اس سے انہیں اندازہ بھی ہوتا کہ فلاں ابھی زندہ ہے۔ وہ خوش بھی ہوتے۔

اس شخص نے دو یا تین سال وہاں گزارے۔ واپسی پر بہت سامان ساتھ لایا۔ قبیلے والوں نے صدقے کے بکرے کاٹے اور سب کو بتایا کہ وہ بخیریت ہے۔ یہ ہوتا ہے اس شخص کے ساتھ جو ایک بار ارادہ کر لے کہ کچھ کرنا ہے۔ اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ اسے کامیابی سے نوازتا ہے۔ آسانیاں پیدا کرتا ہے اور وہ حج کی سعادت حاصل کر لیتا ہے۔

پہلے اس کے پاس ایک پائی بھی نہیں ہوتی تھی۔ حج کی برکت ہے کہ اسے کام بھی مل گیا۔۔ اور اس نے اپنے والدین کے لیے سامان بھی بھیجا۔ اناج بھی۔ اللہ سب کی اسی طرح مدد کرے۔

اب ایک کہانی سنیے۔ اونٹ کے ذریعے سفر حج کی۔ یہ کہانی بھی ماموں کے سفر حج کی ہے۔ زمانہ 1960 کا ہے۔

آپس میں ذکر ہوتا تھا کہ فلاں اونٹ لے کر حج پر گیا۔

پھر ایک نے کہا کہ میں حج کے لیے جا رہا ہوں اور وہ اونٹ پر گیا۔

بہت عرصہ لگا اور جب وہ مکہ پہنچا تو پتا چلا کہ حج تو ہو چکا۔

حج تو عرفات میں قیام ہے۔ اب کوئی مناسک باقی نہیں تھے۔ لوگ حج کے تمام ارکان سے فارغ ہو چکے تھے۔

تب اس نے کہا کہ میں یہیں رکوں گا اور وہ وہاں ایک سال تک ٹھہرا۔

یہاں اس کے قبیلے والے سمجھے کہ وہ مر گیا ہے۔ انہوں نے اس کے لیے بکرے کاٹے۔

لیکن وہ شخص وہیں قیام پذیر رہا کہ اگلے سال کے حج کا وقت آ گیا۔ اس نے تمام لوگوں کے ساتھ مناسک حج ادا کیے۔ پھر واپس اپنے قبیلے میں آیا۔ اپنے اہل خانہ کے پاس لوٹا۔

urdusoftbooks.com

جب وہ اپنے گھر آیا تو اس نے ایک نوجوان لڑکی دیکھی۔ وہ خوش ہوا کہ بیٹی بڑی ہوگئی۔
لڑکی چھن بیٹی کو پتا نہیں تھا کہ یہ اس کا باپ ہے۔
اس نے پوچھا کہ تم کون ہو؟
لڑکی نے کہا کہ میں فلاں فلاں کی بیٹی ہوں۔
اس نے پوچھا۔ تمہارا باپ کہاں ہے؟
لڑکی نے کہا۔ میرا باپ تو فوت ہو چکا ہے۔
باپ نے کہا۔ میں تمہارا باپ ہوں۔
پھر دونوں گلے ملے روئے پھر سارا خاندان اکٹھا ہوگیا۔

یہ ہے کہانی حج کی۔
یہ دشواریاں، مشکلات اور بے یقینی ہوتی تھی۔ 1960 تک کے سفر حج میں بھی۔ مسقط کے جنوبی عمان میں بہت زیادہ غربت تھی۔ ٹرانسپورٹ نہیں تھی۔

ہشام بن عبدالملک کا سفر حج۔ 725ء۔

تاریخ اسلام بہت ہی المناک دور سے گزر رہی تھی۔ 656 میں تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی کی شہادت کے بعد 70 سال تک اور 692ء میں عبداللہ بن زبیر کی شکست کے 30 سال بعد تک۔ کسی خلیفہ نے مکہ مدینہ میں رہائش اختیار نہیں کی تھی۔ 725ء میں ہشام بن عبدالملک پہلے خلیفہ وقت تھے جنہوں نے حجاز کا باقاعدہ دورہ کیا۔ کسی خلیفہ کا سفر حج صرف ذاتی عبادات کے لیے نہیں ہوتا تھا۔ بے شمار سرکاری اور ریاستی امور اس کے منتظر ہوتے تھے۔ سفر حج کی سربراہی۔ مسلم حکمرانوں کے لیے امت کی قیادت اور رہنمائی کی علامت بھی ہوتی تھی۔

724ـ743ء تک حکمرانی کرنے والے خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے اپنے مسند خلافت سنبھالنے کے صرف ایک سال بعد دمشق سے حجاز کا سفر اختیار کیا۔ اس سفر کے حقائق بعض مسودوں اور مخطوطات سے حاصل کیے گئے کہ امیر المومنین نے عرفات میں کیا دعائیں کیں۔ منیٰ میں قیام کیسے رہا۔ ان فرامین کے ذریعے امت مسلمہ کو باخبر کیا گیا۔

ہشام بن عبدالملک دمشق سے سیدھے مدینہ المنورہ پہنچتے ہیں۔ جہاں وہ ایک نامور عالم دوسرے خلیفہ راشد حضرت عمر فاروق کے پوتے سلیم بن عبداللہ بن عمر کی نماز جنازہ کی امامت کرتے ہیں۔ مدینے کے چار ہزار نوجوانوں کو فوجی خدمات کے لیے بھرتی کرتے ہیں۔ وہ ایک مقامی عالم ابوالزناد سے تحریری درخواست بھی کرتے ہیں کہ انہیں حج بیت اللہ کے دوران ملحوظ کیے جانے والے مناسک اور شعائر سے آگاہ کریں۔ بعد میں وہ مدینہ سے مکہ کا سفر اختیار کرتے ہیں۔ جہاں حج کے تمام مراحل امیر حج کے طور پر طے کرتے ہیں۔ مکے میں بھی وہ ایک عالم طوس بن کیسان کی نماز جنازہ پڑھاتے ہیں۔

☆☆☆

اعلان ہو رہا ہے۔ ''چند ہی لمحوں بعد ہم جدہ ایئرپورٹ پر اترنے والے ہیں۔ حفاظتی بند باندھ لیں۔ کرسی کی پشت سیدھی رکھیں۔ کھڑکی کے پردے کھلے رہیں۔''

ٹائلٹس پر قطار لگی ہوئی ہے۔ میری طرح ذیابیطس (شوگر) کے مریضوں کا یہ مسئلہ ہے کہ بار بار ٹائلٹ جانا ہوتا ہے۔ میں بہت دیر سے اپنے خالق و مالک سے بھی خاص دعا کر رہا ہوں کہ میرے یہ مسائل حج بیت اللہ کے مختلف مناسک میں خلل نہ ڈالیں۔ میرے مالک میرے پروردگار خصوصی کرم کرنا۔ جدہ ایئرپورٹ پر اترنے کا تصور کر رہا ہوں کہ جہاز سرنگ سے لگے گا۔ ہم ایئرپورٹ لاؤنج میں اتریں گے۔ امیگریشن پر ذرا طویل قطار ہوگی اور ہم آدھ پون گھنٹے میں پاسپورٹ پر مہر لگوا کر مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔

جہاز سعودی عرب کی مقدس سرزمین پر اتر چکا ہے۔ دور ایک کونے میں قیام کرتا ہے۔ جہاں بسیں منتظر ہیں۔ پھر ایک طویل سفر۔ عازمین حج کے لیے الگ امیگریشن ٹرمینل ہے شاید۔ بلڈنگیں شروع ہوگئی ہیں۔ احرام باندھے سینکڑوں نہیں ہزاروں مسافر موجود ہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ یہاں کیوں رکے ہوئے ہیں۔ مکہ روانہ کیوں نہیں ہوئے ہیں۔

بلڈنگ 8 کے سامنے بس رک گئی ہے۔ سیڑھیوں سے ہم اوپر پہنچتے ہیں۔ محکمہ صحت سعودی عرب کے اہلکار ہمارا استقبال ہمارے منہ میں قطرے ڈال کر کر رہے ہیں۔ اس کے بعد ہمارے سامنے ایک خلقت موجود ہے۔ مجھے تلاش ہے ٹائلٹ کی۔ شاہد مہتاب میری مدد کے لیے ساتھ ہیں۔ وہاں قطاریں لگی ہیں۔ ڈیوٹی پر مامور کارکن شور مچا رہے ہیں۔ حاجی حمام خراب ہے۔ ہمیں صفائی کر لینے دو۔

دوسری طرف بلڈنگ تک نظر آرہی ہے۔ وہاں بھی سینکڑوں عازمین حج موجود ہیں۔ ہم سے پہلے کی آئی ہوئی پروازوں کی امیگریشن ابھی ہوتی ہے۔ ذہن تسلی دے رہا ہے کہ یہ عشق کے مراحل ہیں۔ حافظ یاد آرہے ہیں۔

عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکل ہا

اور یہ کہ

اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

ایک دروازہ عقب میں کھلا ہے۔ وہاں سے ہم دوسرے ایریا میں داخل ہو گئے ہیں۔ کرسیاں پہلے سے بھری ہوئی ہیں۔ بہت سے عازمین زمین پر چادریں بچھا کر بیٹھے ہیں۔ بہت سے سو رہے ہیں۔ کچھ قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف ہیں۔ ہر رنگ۔ ہر نسل۔ ہر زبان مگر ایک اللہ۔ ایک رسولؐ۔ ایک قرآن کو ماننے والے ہر طرف نظر آ رہے ہیں۔ نماز کی ادائیگی کے لیے بھی ایک گوشے میں دریاں بچھی ہیں۔ ہماری پرواز سوا دس بجے صبح پہنچ گئی تھی۔ ہم سے پہلے آدھی رات۔ صبح سویرے کی پروازوں کے مسافر بھی ابھی اپنی امیگریشن کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم پیچھے جھانک رہے ہیں۔ بہت سے کاؤنٹر ہیں۔ سعودی خواتین و حضرات۔ امیگریشن کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ باری باری مختلف پروازوں کے مسافروں کو نمٹایا جا رہا ہے۔

آخر ہیں یہ ان اہلکاروں پر اتنے ہجوم دیکھ رہے ہیں اور اپنی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔

انتظار کرنے والے مسافر کافی چائے کھانے پینے کی اشیا خرید کر لا رہے ہیں۔ کئی گھنٹوں میں بھوک بھی چمک اٹھی ہے۔ شاہ نہتاب ایک تھیلی لے کر آ رہے ہیں۔ بنگلہ دیشی بھائیوں نے یہ مرمرے (بھنے ہوئے چاول) پیش کیے ہیں۔ بنگلہ دیشی بھائی بہنوں کے احرام اور عباؤں پر بنگلہ دیش کا پرچم نمایاں ہے۔ ہر عمر کے بنگلہ دیشی ہیں۔ بزرگ جوان۔ کل تک یہ ہمارا ہی حصہ تھے۔ مشرقی پاکستانی۔ یہ چٹا گانگ کی بندرگاہ سے بحری جہازوں میں حج کرنے آتے تھے۔ شاہ صاحب کو کہیں سے استعمال شدہ کارٹن مل گیا ہے۔ اس کا گتہ بچھا کر ہم بھی فرش پر بیٹھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ سعودی ایئر لائنز والوں نے ہاتھ میں بیگ اٹھانے نہیں دیے اس لیے چادریں چٹائیاں سب سامان میں ہیں۔

ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ جگہ مل گئی ہے۔ اللہ اکبر۔ اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔

احرام کو سنبھالنا، طہارت، وضو بھی خاصی مشق ہو رہی ہے۔ کیسے فرض۔ بہت احتیاط درکار ہے۔ عشق کے مرحلے طے ہو رہے ہیں۔

شور مچ گیا ہے۔ کراچی سے آنے والی پرواز 703 کی باری آ گئی ہے۔ سب ڈھلوان سے تیز تیز اتر رہے ہیں۔ کہنیاں مار کر آگے نکل رہے ہیں۔ ایک ہی شہر سے آئے ہیں ایک ہی ملک سے تعلق ہے۔ مگر سب سے آگے رہنے کی خواہش مجبور کرتی ہے۔ ہمارے گروپ کے لیڈر تو کہیں نظر نہیں آ رہے۔ وہ تو مسجد ہی میں عالمی تحفظ ختم نبوت کی تربیتی نشستوں میں بھی نظر نہیں آئے تھے۔ البتہ احمد زکی کسی صاحب رہنمائی کر رہے ہیں۔ سرکاری اہلکار قطار میں ہموار رہے ہیں۔ امیگریشن آفیسر شاید تھک چکے ہیں اس لیے ٹھپے لگانے کی رفتار بہت سست ہے۔ ہر مسافر کی انگلیوں، انگوٹھوں کی تصدیق کا مرحلہ بھی ہے۔ ہماری قطار کے دونوں طرف خواتین امیگریشن آفیسر یہ فریضہ انجام دے رہی ہیں۔

کچھ دیر بعد سرکاری اہلکار حکم صادر کر رہے ہیں کہ یہاں صرف خواتین قطار میں کھڑی ہوں۔ مرد دوسری لائنوں میں چلے جائیں۔ اب تک تو کہا جا رہا تھا کہ خواتین اپنے محرم سے الگ نہ ہوں۔ یہاں انہیں علیحدہ کیا جا رہا ہے۔ میاں بیوی دونوں پریشان ہیں۔ رفاقت توڑی جا رہی ہے۔ زیادہ تر بزرگ جو برسوں سے ساتھ ساتھ قدم بڑھا رہے ہیں۔ لیکن سعودی حکم ہے۔ تعمیل تو کرنا ہو گی۔ اس سے انکار کی مجال نہیں ہے۔ بات درست ہے کہ ہر مسافر کی انگلیاں پکڑ کر بائیو میٹرک سسٹم پر عملدرآمد کرنا پڑتا ہے اس لیے سعودی خواتین اہلکاروں کا یہ فیصلہ شرعاً صحیح ہے۔ لیکن یہ پابندی پہلے سے ہونی چاہیے تھی۔

ہم جو قطار میں تیسرے نمبر پر آ چکے تھے۔ اب کسی اور قطار کے آخر میں کھڑے ہیں۔

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

پاکستانی عازمین حج آپس میں بڑبڑا رہے ہیں۔ شکوہ شکایات۔ مگر سعودیوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ وہ اپنا وقت لے رہے ہیں۔ خوش گپیاں بھی ہو رہی ہیں۔ مسافر کو سامنے کھڑا چھوڑ کر آفیسر صاحب اپنی نشست سے اٹھ کر دوسری نشستوں کے آفیسروں کے پاس بھی چلے جاتے ہیں۔ دونوں کاؤنٹروں پر امیگریشن کا عمل رک جاتا ہے۔ اسے کوئی سپروائزر نہیں دیکھتا۔

مرحلے بالآخر گزر جاتے ہیں۔ اگلی پرواز کے مسافروں کو بھی بلا لیا گیا ہے۔ وہ پیچھے قطار باندھ رہے ہیں۔ انڈونیشیا، ملائشیا، بھارت، سوڈان، بنگلہ دیش،

پاسپورٹ نمبر ایک سے بڑی مرتبہ نظر آرہے ہیں۔ ان سب کا
ہجوم ایک ہے۔ مرکز و محور ایک ہے۔ برسوں سے یہ قافلے
چل رہے ہیں۔ آگے بھی چلتے رہیں گے۔ اپنی عقیدتوں کا اظہار
کرتے رہیں گے۔

سامان حاجی ہونا ہے جو کئی گھنٹے پہلے اتارا گیا ہے۔

میں پچھلی صدیوں میں چلا گیا ہوں۔

اونٹوں کی بڑی تعداد دکھائی دے رہی ہے۔ کچھ اونٹوں پر عازمین حج سوار ہیں۔ کچھ پر سامان لدا ہوا ہے۔ ہم تو چند دن کے لیے آئے ہیں۔ اس لیے بھی سامان کم ہے۔ ایئر لائنز کی پابندی بھی ہے۔ یہ جو کئی کئی مہینوں کے لیے آرہے ہیں ان کا سامان بھی بڑی تعداد میں ہے۔ قافلے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔

نواب مصطفیٰ علی شیفتہ کا سفرِ حج۔

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ یاد آرہے ہیں۔ وہی حضرت غالب والے۔ یہ 1839ء ہے۔ 1255ھ۔ ان کے سفر کی مدت 2 سال اور چھ دن رہی ہے۔ مشکلات کا ذکر لیکن کتنی شکر گزاری کے ساتھ۔

15 شعبان 1255ھ کو ہمارا بادبانی جہاز بمبئی سے روانہ ہوا اور 5 رمضان المبارک کو عدن کی بندرگاہ پر پہنچا۔ عدن میں چند پختہ مکانات کے سوا باقی سب مکانات خس پوش ہیں۔ ہم نے سید زین کے ہاں قیام کیا جو اس بستی کے سربرآوردہ مشائخ میں سے ہیں۔ پہلے سے کوئی واقفیت نہ ہونے کے باوجود کمال درجے کی شفقت و محبت سے پیش آئے۔ عدن پر آج کل انگریزوں کی حکومت ہے۔ سات ماہ گزرے انہوں نے سابق حکمران سے اس شہر کو چھین لیا اس کا سبب یہ ہوا کہ انگلستان کی حکومت کو اپنے دخانی جہازوں کے لیے جو سویز کے راستے لندن آتے جاتے ہیں۔ ایک ایسا مقام مطلوب تھا جہاں پر سامان ”آب و آتش“ آسانی سے فراہم ہو سکے چنانچہ انہوں نے فرمانروائے عدن کو پیشکش کی کہ عدن کی آمدنی سے زیادہ ہم سے لو اور یہاں کی حکومت ہمارے حوالے کر دو۔ امیر عدن ایک ناتجربہ کار سیدھا سادہ آدمی تھا اس نے نتائج پر غور کیے بغیر معاہدہ کر دیا جب انگریزوں نے عدن کا قبضہ مانگا تو اس کی آنکھیں کھلیں قبضہ دینے سے گریز کیا، اس پر انگریزوں نے اس سے لڑائی چھیڑ دی اور عدن پر بزور قبضہ کر لیا۔ جس رقم کا امیر سے وعدہ کیا تھا وہ بھی اسے نہ دی۔ میرے آنے سے ایک دن پہلے ایک معرکہ ہو بھی چکی ہے۔

عدن کا شہر سمندر کے ساحل سے تین کوس دور ہے۔ یہ مسافت شہر جانے والے بحری مسافروں کے لیے انتہائی تکلیف کا باعث ہے۔ کیونکہ آنے جانے کے لیے خاص انتظام کرنا پڑتا ہے۔ دورانِ عدن میں قیام کر کے 7 رمضان کو واپس جہاز پر آ گئے۔

8 رمضان کو جہاز کے بادبان کھولے گئے۔ 9 رمضان کو چاشت کے وقت باب المندب سے بخیریت گزرے۔ یہ بڑی خطرناک گزرگاہ ہے۔ دوپہر کے قریب جہاز نے بندرگاہ مخا میں لنگر ڈالا ہم اگلے دن دس رمضان کو شہر مخا گئے۔ یہاں کی عمارتیں پختہ اور سفید ہیں لیکن گلی، کوچے بے حد تنگ ہیں۔ یہاں سبزیوں اور پھلوں کی افراط ہے۔ یمن کے رہنے والے ایک عالم مولانا محمد جمال سے ملاقات ہوئی یہ مخا کی جامع مسجد میں بخاری شریف کا درس دیتے ہیں۔ قضا و قدر نے اہلِ یمن کے قامت زیبا کو تقویٰ و علم کے لباس سے آراستہ کیا ہے۔ صنعا جو یمن کا مرکزی شہر اور دارالحکومت ہے، محدث سرزمیں ہے، قاضی شوکانی جو صنعا کے قاضی القضاۃ تھے بتاؤ کہ سلف کے بعد فن حدیث میں تبحر کے اعتبار سے ان جیسا کون ہے؟ قاضی صاحب کسی امام کی تقلید نہیں کرتے تھے۔ اپنے اجتہاد پر عمل کرتے تھے۔ 13 رمضان کو شام کے وقت جہاز حدیدہ کے قریب لنگر انداز ہوا۔ رات کو ساحل کے نزدیک نہ جا سکے۔ 14 رمضان کو جہاز حدیدہ کی بندرگاہ میں ٹھہرا۔ 15 رمضان کو ہم حدیدہ شہر میں گئے۔ ایک مکان کرایہ پر لیا جو جامع مسجد کے قریب تھا۔ آج کل مخا، حدیدہ اور یمن کا کچھ اور علاقہ محمد علی بادشاہ مصر کے قبضے میں ہے۔ ابراہیم پاشا کو یہاں کا گورنر مقرر کیا ہے۔ اس جگہ کے سربرآوردہ علما میں شیخ عمر سندھی حنفی ہیں۔ سندھ سے یہاں آکر کسبِ علم کیا ہے۔ ان کے پاس بے حد عمدہ کتابیں کثیر تعداد میں ہیں۔

حدیدہ سے دس کوس کے فاصلے پر مراوہ نامی ایک گاؤں ہے جو جناب سید محمد عبد الباری کی جائے سکونت ہے۔ ان کے فضائل مدت سے سن رکھے تھے اس لیے ان کی زیارت کی بے حد تمنا تھی۔ 19 رمضان کی شب کو عازم مراوہ ہو گیا اور صبح کے وقت وہاں پہنچ گیا۔ سید صاحب موصوف نے جس خلوص و محبت سے اس فقیر کا خیر مقدم کیا وہ حد بیان میں نہیں آسکتا مختصر یہ کہ مہمان نوازی ان سے سیکھنی چاہیے۔

27 رمضان المبارک 1255ھ کو جہاز حدیدہ سے روانہ ہوا۔ تین دن بعد تیسویں رمضان کی شب میں ایک

کوئی رات گزری ہوگی کہ ہمارا ایک جہاز سمندر میں چھپی ہوئی ایک چٹان سے ٹکرا گیا۔ ٹکر ایسی تھی کہ اس میں شگاف ہو گیا۔ اس وقت موت ہمیں اپنے سامنے کھڑی نظر آ رہی تھی۔ ساری رات ہم اسی عالم میں گزری جب سورج کی روشنی خوب پھیل گئی تو دور سمندر کے درمیان ایک دھبا نظر آیا جو کوئی جزیرہ معلوم ہوتا تھا ڈوبتا جہاز سے ایک چھوٹی کشتی اتار کر سمندر میں ڈال دی گئی ہم اس پر بیٹھ گئے اور اس کا رخ جزیرے کی طرف موڑ دیا۔

ہماری کشتی کا حال ایک بچے جیسا تھا کہ آندھی اڑائے اڑائے پھرے، موجوں کے تھپیڑے کبھی اسے ادھر پھینک دیتے اور کبھی ادھر دھکیل دیتے، کبھی کشتی پانی پر چلتی اور کبھی پانی کشتی پر سے گزرتا تھا۔ اہل کشتی سر تا پا پانی سے بھیگ گئے لیکن اس کیفیت سے کیا ہوتا؟ میں تو ڈوب رہا ہوں مجھے تری کا کیا ڈر۔ بعد از خرابی بسیار کسی نہ کسی طرح اس جزیرے تک پہنچ گئے۔ یہ جزیرہ اس قدر چھوٹا تھا کہ چشم حاسد بھی اس سے کہیں زیادہ فراخ ہوتی ہے اور دل لئیم اس سے زیادہ کشادہ ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہاں کسی درخت کا وجود تک نہ تھا کہ اس کے سائے میں بیٹھ سکیں یا اس کا پھل کھا سکیں۔ پانی اور کھانے کی کسی چیز کا بھی نام و نشان تک نہ تھا۔ جزیرے کا نہ کوئی ساحل تھا اور نہ وہاں تک پہنچنے کا کوئی راستہ۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ کسی نہ کسی ڈھب سے اس جزیرے میں اتر جائیں اور "اجل مقدر" تک وہیں قیام کریں۔

تباہ ہونے والے جہاز سے اترتے وقت جو سامان پانی سے محفوظ اور اوپر تھا اس کو سمندر میں ڈال دیا گیا تھا کیونکہ اس کو لے جانے کی بظاہر یہی ایک صورت تھی جو سامان ہماری قسمت میں تھا وہ خالق بحر و بر کے حکم سے ہم کو مل گیا اور جس کو ضائع ہونا تھا وہ ضائع ہو گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ بیشتر سامان ہمیں مل گیا مگر اس وقت نہ سامان ضائع ہونے کا غم تھا اور نہ مل جانے کی خوشی۔ میٹھے پانی کے بڑے بڑے پیپے بھی سمندر میں ڈال دیے گئے۔ ان میں سے صرف آٹھ پیپے ہاتھ آئے۔ اسی طرح سامان خوراک میں جتنا حصہ نکالا جا سکا نکال لیا۔ اس میں زیادہ تر چاول اور باجرہ تھا جس کو اہل جہاز نے تجارت کے لیے لادا تھا۔ جزیرے پر اترنے کے بعد جب ہمارے ہوش و حواس بحال ہوئے تو آپس میں مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ پانی کے صرف آٹھ پیپے ہیں اور آدمی دو سو سے زیادہ، کھانے پینے کی اور کوئی چیز جزیرے میں موجود نہیں۔ ظاہر ہے کہ پانی کے آٹھ پیپے چند روز میں ختم ہو جائیں گے اور جب تک کسی دوسرے مقام کا پتا نہ چلے یہاں سے چلنا ممکن نہیں۔ سب نے بیک زبان کہا اس چھوٹی کشتی میں ہم میں سے چھ آدمی جان ہتھیلی پر رکھ کر بیٹھ جائیں اور پھر دیکھیں کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ اگرچہ ایسی معمولی کشتی کا بحر زخار سے سلامت گزر جانا محال نظر آتا ہے مگر مجبوری ہے اگر سمندر میں اس کے غرق ہونے کا ڈر ہے تو جزیرے میں پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جانے کا خوف ہے۔ آخر چار دن کے بعد "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" کے مصداق نو آدمی اس چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر ساحل کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ ان کے امیر مولانا فضل علی تھے۔ ان میں ایک مولوی برہان الدین بھی تھے۔ یہ پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ ان سے یمن میں ملاقات ہوئی تھی۔ نہایت نیک سرشت اور صحیح الفکر آدمی ہیں۔ دو حج اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ اس بار ارض پاک میں مستقل سکونت کے ارادے سے ہجرت کر کے جا رہے ہیں۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد ہم جزیرے میں بیٹھ کر رحمت الٰہی کا انتظار کرنے لگے۔ ہر صبح کو بیدار ہو کر سمندر پر نگاہیں گاڑ دیتے اور ہر شب سونے سے پہلے اس کشتی کا ذکر ضرور کرتے۔

اس کشتی کو روانہ ہوئے بارہ دن گزر گئے کہ شام کے وقت سطح سمندر پر دو چھوٹی کشتیاں نمودار ہوئیں۔ یہ ہمارے لیے عید کے چاند کی مانند تھیں ہم نے خیال کیا کہ ہمارے ساتھی ساحل کا پتا معلوم کر کے واپس آ گئے لیکن جب ملاح اتر کر ہمارے پاس آئے تو دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ سب اجنبی ہیں۔ اگر ان سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ تم نے جو آدمی بھیجے تھے وہ سات دن کے بعد قنفذہ (ساحل سمندر پر ایک گاؤں) پہنچ گئے تھے اور وہاں کے حاکم کو اپنی داستان مصیبت سنائی تھی۔ اس حاکم کے حکم سے سات چھوٹی کشتیاں تمہاری مدد کے لیے روانہ ہوئیں وہ کئی دن تک سمندر میں یہ جزیرہ تلاش کرتی رہیں۔ لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا، بالآخر پانچ کشتیاں ان کے ملاح واپس قنفذہ چلے گئے۔ مولانا فضل علی اور ان کے ساتھیوں نے ان لوگوں کو واپس ہونے سے بہت روکا لیکن وہ نہ مانے۔ ہم دو کشتیاں لے کر بحر قلزم کی طرف روانہ ہوئے اور جزیرے کی تلاش میں دن رات ایک کر دیے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے اور تمہارے پاس پہنچ گئے۔

اب اس جزیرے سے چلنے کا مرحلہ آیا تو معلوم ہوا کہ استے زیادہ آدمیوں کا ان کشتیوں میں سمانا دشوار ہے۔ مجبوراً ایک کشتی تین روز بعد اور دوسری چھ روز بعد جس قدر آدمی بٹھائے جا سکے بٹھا کر روانہ کردی اور خود اللہ پر توکل کر کے اسی ویرانے میں ٹھہرا رہا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اپنے بندوں پر حدِ بیان سے باہر ہے۔ بنا بریں جہاز ٹوٹنے کے چھبیسویں دن ایکا ایک دو اور کشتیاں آتی دکھائی دیں جب کنارے پر پہنچیں تو ملاحوں میں سے کوئی صورت آشنا نہ پایا۔ علیک سلیک کے بعد ان سے پوچھا یہاں کیسے پہنچے تو انہوں نے بتایا کہ وہ پانچ کشتیاں جو واپس چلی گئی تھیں قنفدہ پہنچیں اور اپنی سعی ناکام کا حال سنایا تو حاکم قنفدہ ان پر سخت غضبناک ہوا اور ان کو حکم دیا کہ واپس جا کر دوبارہ جزیرہ تلاش کریں۔ حاکم نے ان کے ساتھ ایک اور کشتی بھیجی۔ چند روز تو سب کشتیاں ساتھ ساتھ چلیں پھر موجوں کے تلاطم اور ہوا کے طوفان سے الگ الگ ہو گئیں۔ ہم اتفاق سے تمہارے پاس پہنچ گئے۔ دوسری کشتیاں کدھر گئیں اور اب کہاں ہیں ہمیں اس کی کچھ خبر نہیں۔

ان دو کشتیوں کے آنے پر ہم نے پختہ ارادہ کرلیا کہ اس دفعہ ہم سب ان پر سوار ہو کر اس جزیرے کو چھوڑ دیں گے اگر تمام آدمیوں کی گنجائش نکالنے کے لیے کچھ سامان چھوڑنا پڑا تو اسے بھی چھوڑ دیں گے۔ ابھی ان کشتیوں پر سوار ہونے کا قصد ہی کر رہے تھے کہ باد و باراں کا طوفان آگیا اور سمندر میں وہ تلاطم برپا ہوا کہ الامان والحفیظ، ناچار طوفان فرو ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ کہیں دس دن بعد طوفان باد و باراں ختم ہوا اور ہم 5 ذیقعد کو عصر کے وقت اس ویرانے کو خیرباد کہہ کر کشتیوں میں سوار ہو گئے۔ 8 ذیقعد کو دوپہر کے وقت بخیریت ایک ساحلی قصبے میں پہنچ گئے۔ الحمد للہ علی ذالک حمداً کثیراً ویران جزیرے میں ہم ماہ پانچ دن مقیم رہے۔

سب سے پہلے پینے کے پانی کا حال بیان کرتا ہوں کہ اتنی قلیل مقدار تقریباً دو سو آدمیوں کے 30 دن تک کیسے کافی ہوئی اسے سن کر اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا جلوہ نظر آئے گا سنو! ایک پیالہ صبح کو اور ایک شام کو ہر شخص کو ملتا تھا۔ اس احتیاط اور کفایت شعاری کے باوجود امید بالکل نہیں تھی کہ یہ پانی چھ سات دن تک ہمارا ساتھ دے گا۔ ان دو پیالوں سے پیاس کیا بجھتی اور روٹی پکانے کی کیا تدبیر ہوتی؟ مجبوراً سمندر کے آبِ شور سے کھانا پکانے کا کام لیا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھو کہ ابر کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا اور اس سے بارانِ رحمت کا نزول ہوا۔ ہم نے جزیرے میں گڑھے کھود لیے اور برتن رکھ دیے اس طرح کچھ پانی فراہم ہو گیا اور دو تین دن کھانے پینے کا سامان حسب دلخواہ ہو گیا۔ اس کے بعد میرے دل میں خیال آیا کہ سمندری پانی اگر کشید کرلیا جائے تو شاید پینے کے قابل ہو جائے چنانچہ ایسا کیا گیا تو واقعی کھارا پانی بہت لذیذ ہو گیا۔

طولِ سخن کوتاہ اس زمانے میں جبکہ بظاہر ابتلا کی صورت تھی مگر اس کے پردے میں اللہ تعالیٰ کے گوناگوں افضال پوشیدہ تھے اگر ان عنایاتِ الٰہی کی تفصیل بیان کروں تو ریاکاری کی تہمت سے ڈرتا ہوں۔ اگر ان کا تذکرہ بالکل چھوڑ دوں تو کفرانِ نعمت کی سزا سے ہراساں ہوں۔ تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا پہلا انعام یہ تھا کہ اس صبر نے سپاس گزاری اور ثنا خوانی کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا، دوسرا انعام یہ ہے کہ اس خرابے میں تحیر خیز طریق پر آب و دانہ عطا فرمایا اور پھر ہمیں ہلاکت خیز جگہ سے آسانی کے ساتھ نکال بھی دیا۔ تیسرا انعام یہ ہے کہ ہم میں کسی ایک کو بھی کوئی ضرر نہیں پہنچا۔ سامان میں سے بھی ننانوے فیصد بچ گیا۔ فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔

☆☆☆

زمانوں کا فرق ہے۔ لیکن آنکھوں میں چمک وہی ہے۔ دل میں جذبہ وہی ہے۔ سامان لے کر کسٹم اور سیکیورٹی کے مراحل سے گزر کر باہر آ رہے ہیں تو استقبال کرنے والوں کے ہاتھوں میں سبز ہلالی پرچم دیکھ کر ساری تھکن اور الجھن کافور ہو گئی ہے۔ وہ سامان کی ٹرالی بھی ہمارے ہاتھ سے لے رہے ہیں اور آگے آنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔ ایک کارکن پاکستانی پرچم لہراتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔ ہم سب عازمین حج اس کی پیروی کر رہے ہیں۔

اس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں

کچھ دور چل کر لگ رہا ہے۔ ہم پاکستان میں پہنچ گئے ہیں یا پاکستان یہاں آگیا ہے۔

کراچی، لاہور، ملتان، پشاور، سیالکوٹ، رحیم یار خان، کوئٹہ کے اسٹینڈ لگے ہوئے ہیں۔ جہاں جہاں سے حج پروازیں آ رہی ہیں۔ ان کے لیے الگ الگ استقبالی مقامات ہیں۔

صوفے، کرسیاں، کچھ نوجوان ٹھنڈے پانی کی

بج بھی۔ تھوڑی دیر
ہمیں پیش کر رہے ہیں۔ عصر کی
وضو خانے ہیں۔ ساتھ ہی عمارت گاہیں۔
ستاتے ہیں۔ قصر ادا کرتے ہیں پھر ہمیں
نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ دو رکعت
آجاتی ہیں گی۔ اپنی منزل مقصود۔ مکۃ المکرمہ کے لیے۔ اس پر
وقت تو اشیع نے سب کی طبیعت بحال کر دی ہے۔ امیگریشن
کے دوران چہروں پر جو اکتاہٹ اور بیزاری تھی اب اس کی
جگہ بشاشت نے لے لی ہے۔

اپنا اپنا سامان اٹھاتے اور بس میں رکھوا دیں۔
سب کو اللہ کے گھر سب سے پہلے جانے کی بے تابی
ہے۔ بزرگ جوان سب ہمت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ بس
کے نچلے خانے میں سامان بھر دیا گیا ہے۔ بس میں سوار
ہونے سے پہلے اپنا پاسپورٹ معلم کے نمائندے کے
حوالے کرنا ہے۔ جنوبی ایشیا کے لیے معلم یا المطوف الگ
ہیں۔ ہمارے مطوف السید محمد بن محمود کوشک ہیں۔ ختم نبوت
حج گروپ کا ان سے معاہدہ ہے۔ یہ نوجوان جو ہمارے
پاسپورٹ اپنے قبضے میں لے کر ہمیں بس میں سوار ہونے
دے رہا ہے۔ یہ کوشک کا بندہ ہے۔ ہنس مکھ، متحرک،
فعال، اپنے کام میں ہوشیار سب بیٹھ چکے ہیں۔ اعتماد الحق
شمسی حاضری لے رہے ہیں۔ سب کو اسکول کے دن یاد آ
رہے ہیں۔ پہلے لبیک کہا جاتا تھا۔ اب نئے دور میں یس سر
یا یس میڈم میں جواب دیا جاتا ہے۔

بس آرام دہ ہے۔ ہوائی جہاز جیسی سیٹیں۔ سامنے
ایک ٹرے بھی منسلک۔ گلاس یا پانی کی بوتل رکھنے کے لیے بھی
جگہ۔ ایئرکنڈیشننگ بھرپور۔ ڈرائیور کی سیٹ کے پیچھے ایک
بڑا باکس جس میں ٹھنڈے پانی کی بوتلیں مسافروں کے
لیے۔

اعلان ہو رہا ہے۔ مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔
ڈرائیور کا حکم ہے کہ تین تین مسافر اتر کر نماز پڑھ کر آتے
رہیں۔ اس میں کیا حکمت ہے۔ ہماری سمجھ میں تو نہیں آئی۔
پاسپورٹ تو پہلے ہی لے لیے گئے ہیں۔ سب کی رائے یہ
ہے کہ منزل مقصود پر جا کر ہی پڑھ لیں گے۔ روانگی ہو رہی
ہے۔

لبیک اللھم لبیک

چھوٹے کے۔ یہ راستہ دن میں تو دیکھا ہوا ہے۔ جب
عمرے کی سعادت حاصل کرنے آئے تھے۔ رات میں کچھ
اندازہ نہیں ہو رہا ہے۔ بہت سی بسیں رکی ہوئی ہیں۔ ہماری
بس بھی رک رہی ہے۔ یہاں بسوں کی رجسٹریشن ہو رہی

ہے۔ مطوف کے نمائندے یہاں بھی ایک ایک پیکٹ ہر
ایک کو تھما گئے ہیں جن میں کچھ کھانے کے لوازمات پانی اور
جوس موجود ہے۔

☆☆☆

روشنیاں ہی روشنیاں۔ بڑے بڑے ریستوران
جیسے کراچی میں دو دریا پر یا سپر ہائی وے پر ہیں۔ ساک یعنی
چھلی کی بہت تشہیر کی گئی ہے۔ میں راستے بھر اس
انتظار میں رہا ہوں جہاں ایک بہت بڑی کتاب، مکے کی
حدود شروع ہونے کا اظہار کرتی ہے۔ مگر یہ بس کسی اور راستے
سے مکے میں داخل ہو چکی ہے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر
احرام باندھے میرے بھائی نظر آ رہے ہیں۔ خریداری ہو
رہی ہے کھانے کھائے جا رہے ہیں۔

اللہ کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ ہم اپنی منزل سے ہمکنار ہو
چکے ہیں۔ مکۃ المکرمہ۔ سبحان اللہ۔ جہاں قریباً 4 ہزار برس
پہلے اللہ تعالیٰ کے حکم پر ہمارے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ
السلام نے بیت اللہ کی بنیاد رکھی اور جہاں قریباً 1500 برس
پہلے اس ہستی نے آنکھ کھولی جس کے لیے یہ سارے جہاں
تخلیق کیے گئے۔ جہاں 40 برس کی عمر میں اس عظیم شخصیت
کو نبوت سے نوازا گیا۔ اس شہر میں فخر موجودات۔ سرور
کائنات پر کفار نے عرصہ حیات تنگ کیا۔ پھر اس شہر سے وہ
ہجرت پر مجبور ہوتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق میرے سامنے
الٹے جا رہے ہیں۔ ذیقعد 6 ھ میں۔ حضور اکرمؐ دو ہزار
ساتھیوں کے ہمراہ عمرے کے لیے تشریف لا رہے ہیں اس
کے لیے کفار سے معاہدہ ہو گیا ہے۔ تین دن قیام کے بعد
مدینہ واپسی ہو رہی ہے۔ جب کفار خود معاہدے کی پابندی
نہیں کرتے ہیں تو پیغمبر اسلام تطہیر کعبہ کا فیصلہ کرتے ہیں۔
10 رمضان المبارک 8ھ کو دس ہزار آراستہ فوجوں کے
ساتھ اس شہر کا رخ ہوتا ہے۔

☆☆☆

آواز آ رہی ہے۔ 1431 سال پہلے کی ہے۔
ہم جہاں سے گزر رہے ہیں، یہیں کہیں آس پاس۔ زبیر بن
عوامؓ، خالد بن ولید، غفارہ، انصار خیمہ زن ہیں۔
قریش خوف زدہ ہیں کہ اس لشکر جرار کا مقابلہ کیسے
کریں گے۔ ہم نے تو مسلمانوں پر بہت ظلم کیے ہیں۔ اب
یہ غالب آ رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ نہ جانے کیا سلوک
کریں۔

لیکن رحمت اللعالمینؐ ارشاد فرما رہے ہیں:

"جب تک کوئی شخص حملہ آور نہ ہو اس پر تلوار نہ اٹھائی جائے، جو شخص ہتھیار ڈال دے اسے قتل نہ کیا جائے، جو آدمی ابوسفیان کے گھر پناہ لے اسے امان دی جائے جو آدمی اپنے گھر کا دروازہ بند کر دے اس پر چڑھائی نہ کی جائے، جو کوئی کعبہ شریف میں داخل ہو جائے تو اسے امان دی جائے اور جو شخص بھاگ جائے اس کا تعاقب نہ کیا جائے۔"

انسانیت کی اعلیٰ اقدار اس طرح قائم کی جاتی ہیں۔

امام الانبیاء حضور اکرمؐ خانہ کعبہ میں داخل ہو چکے ہیں۔ جہاں کفار نے 360 بت پرستش کے لیے رکھے ہوئے ہیں۔ ایک اللہ کی عبادت اور اس سے مدد مانگنے کی تلقین کرنے والے نبی آخرالزماںؐ لاٹھی کی ٹھوکر سے ایک ایک بت کو گرا رہے ہیں اور یہ آیت تلاوت کر رہے ہیں۔

"جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا"

(حق آ گیا۔ باطل بھاگ گیا۔ یقیناً باطل بھاگنے والا ہی ہے)

بس رک گئی ہے۔ ہم ایک سرنگ میں ہیں۔ پتا نہیں سرنگ کا سفر کتنا طویل رہا ہے کیونکہ میں تو 1431 سال پہلے کے مکے میں اپنی آنکھیں خیرہ کر رہا ہوں۔

فیرمونٹ کلاک ٹاور ہوٹل ہماری قیام گاہ دائیں ہاتھ ہے۔

لابی میں سب کمروں کی چابیاں حاصل کرنے کی تگ و دو میں ہیں۔ رات بھیگ رہی ہے۔ سب کی آنکھوں میں نیند ہے۔ شاہد مہتاب چابیاں لے کر آ رہے ہیں۔ ہم میاں بیوی اور بیٹے کو ساتویں منزل پر شاہد مہتاب کو پندرھویں منزل پر کمرا ملا ہے۔ یہ ہوٹل حرم کا ہی حصہ ہے۔ وقف ہے، کئی منزلیں، کئی سو کمرے۔ کھڑکی کے پردے ہٹا کر دیکھ رہا ہوں کہ حرم کی کوئی جھلک دکھائی دے۔ یہ کمرا شاید کسی اور رخ پر ہے۔ نیچے زائرین کی بسیں بڑی تعداد میں نظر آ رہی ہیں۔

☆☆☆

23 اگست 2017ء، یکم ذی الحجہ 1438ھ۔

بہت طویل دن رہا ہے۔ پاکستان سے حجاز (اب 1930 سے سعودی عرب) لگتا ہے کہ ہم نے کئی ہفتوں میں طے کیا ہے۔ قضا نمازیں ادا کر کے سونے کا ارادہ ہے۔ صبح سویرے ان شاء اللہ کعبۃ اللہ میں حاضری دیں گے۔

جمعرات 24 اگست 2017ء۔ 2 ذی الحجہ 1438ھ

اذان کی آواز آ رہی ہے۔ میں اٹھ بیٹھتا ہوں۔ سلیم محمود کہہ رہے ہیں یہ تہجد کی اذان ہے۔ فجر کی نہیں۔

تہجد کے نفل ہوٹل میں ہی ادا کر کے ہم سب نماز فجر اور اس کے بعد عمرے کے لیے کشاں کشاں روانہ ہو رہے ہیں۔ لفٹ پر ہی حرم کی منزل کی نشاندہی کی گئی ہے۔ لفٹ رکتی ہے تو آواز آتی ہے "حرم" ایک بڑی لابی سے گزر کر نیچے اترتے ہیں تو سامنے وہ مینار ہیں۔ وہ باب ہیں جنہیں دیکھنے کی آرزو ہر کلمہ گو کو ہوتی ہے۔ کسی کو بلاوا آ جاتا ہے، کسی کو نہیں۔

میں تو حیراں ہوں، مجھے کیسے بلاوا آ گیا۔ میرا جیون تو گناہوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ کوتاہیوں میں گزرے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 3,500 روپے

بیرونِ ممالک کے لیے زرِسالانہ 50,000 روپے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:
مرزا اثمر عباس
0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

70 برس، غفلت میں بسر ہوتی زندگی، دنیوی درباروں میں حاضریاں، حکمرانوں، بادشاہوں، وڈیروں، صنعت کاروں، تاجروں، میڈیا مالکوں کی خوشامدوں میں گزرے دن رات۔

حرم کے سامنے ہوں۔ مینار مجھے بلا رہے ہیں۔ اپنی خوش نصیبی پر ناز کر رہا ہوں۔ اپنے گناہوں پر نادم ہوں۔ اپنی کوتاہیوں پر شرمندہ ہوں۔

لبیک اللھم لبیک

☆☆☆

2200 سال قبل مسیح اور اس کے بعد 2017 سال۔ تقریباً چار ہزار سال پہلے میرے لیے اللہ تعالیٰ نے طے کیا تھا کہ میں یہاں حج بیت اللہ کے لیے حاضر ہوں گا۔

"چار ہزار سال پہلے سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام جب بیت اللہ شریف کی تعمیر سے فارغ ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ "اب آپ لوگوں میں اعلان کریں کہ وہ بیت اللہ کا حج کرنے آئیں۔"

آپ عرض کرتے ہیں۔ پروردگار! یہاں تو دور دور تک انسانی آبادی کا نام و نشان نہیں ہے۔ یہ تو جنگل اور چٹیل میدان ہے اور جہاں آبادی ہے وہاں تک میں اپنی نحیف آواز کیسے پہنچا سکتا ہوں۔"

تو اللہ کا حکم آتا ہے۔ علیک الاذان و علی البلاغ

آپ کے ذمے صرف اعلان کرنا ہے ابلاغ میری ذمہ داری ہے۔ ساری دنیا میں اسے پہنچانا اور پھیلانا ہماری ذمہ داری ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام مقام ابراہیم پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ڈال کر دائیں بائیں اور شرقاً غرباً بلند آواز سے اعلان کرتے ہیں۔

"اے لوگو! پروردگار عالم نے اپنا گھر بنایا ہے۔ تم اس کا حج کرنے کے لیے آؤ۔"

اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس آواز کو زمین و آسمان کی تمام مخلوق نے سنا۔ نہ صرف دنیا میں موجود انسانوں کے کانوں تک یہ آواز پہنچی بلکہ عورتوں کے رحم اور مردوں کی طلب میں بھی جو بچے تھے اور جو قیامت تک پیدا ہونے والے تھے اور جو روحیں عالم ارواح میں تھیں ان کے کانوں تک یہ آواز پہنچی۔ بطور معجزہ ان سب تک یہ آواز پہنچائی گئی۔

اللہ کریم نے جس کی قسمت میں اس مبارک گھر کی زیارت لکھی تھی۔ ان سب نے اس پر لبیک کہا۔ جس کو جتنی بار یہ شرف حاصل کرنا تھا۔ اس نے اتنی ہی مرتبہ لبیک کہا۔ درختوں، پہاڑوں پتھروں غرض ہر چیز نے لبیک کہا۔

☆☆☆

میں بھی ان روحوں میں سے ہی ہوں۔ اللہ نے آج مجھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آواز پر لبیک کہنے کے لیے یہاں آنے کا موقع دیا ہے۔ میں تو اللہ کے حبیب حضرت محمد کی امت میں سے ہوں۔ مجھ پر تو حج بیت اللہ فرض ہے۔ میں حاضر ہوں۔

لبیک اللھم لبیک

خوش نصیب ہوں میں۔ یہ سب سیکڑوں ہزاروں دو چادروں میں لپٹے، بھائی۔ عباؤں میں چھپی بہنیں سب کے دن پھر گئے ہیں۔ سب خوش قسمت ہیں۔ حرم پاک میں موجود ہیں۔ حدود حرم بڑھ رہی ہیں۔ کلمہ گوؤں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ سہولتیں بھی ہر سال پہلے سے زیادہ ہوتی ہیں۔ دنیا بھر میں جو نئی ٹیکنالوجی ایجاد ہو رہی ہے۔ وہ یہاں استعمال میں لائی جاتی ہے۔ انسانی زندگی آسان ہو رہی ہے۔ ان سے یہاں بھی عمرے اور حج کے لیے آنے والے انسانوں کے لیے آسانیاں پیدا کی جاتی ہیں۔ یہ وہی علیم و خبیر ہے۔ جو طے کرتا ہے کہ انسانوں کو ممکنات میں سے امکانات میں سے کب کس حقیقت سے روشناس کرتا ہے۔ سب اس کی مخلوقات ہیں۔ وہی بہتر جانتا ہے کہ کس کو کس ایجاد کی توفیق دینی ہے اور اس سہولت سے کون کون فائدہ اٹھائے گا۔

یہ زمین بے آب و گیاہ تھی۔ اب گل و گلزار ہے۔ فلک بوس عمارتیں سر اٹھا رہی ہیں۔ پہلے زائرین خیمے ساتھ لے کر آتے تھے۔ ان میں دن رات بسر کرتے تھے۔ اب خیموں کی جگہ پانچ ستارہ ہوٹل آگئے ہیں۔ کئی کئی سو کمروں والے۔ اب حاجی وہاں قیام کرتے ہیں۔ یہ قادر مطلق طے کرتا ہے کہ کس صدی میں دنیا کا کیا نقشہ ہوگا۔ کس صدی میں انسان پیدل چلیں گے کس میں اونٹ اور گھوڑوں پر سوار ہوں گے۔ کس میں ریل چلے گی۔ کس میں بحری جہاز اور کب اللہ کا نائب حضرت انسان ہوا کے دوش پر اڑتا پھرے گا۔

ریل کے حاجی۔

یہ 1900 ہے۔ بیسویں صدی کا آغاز۔ غیر مسلموں نے ریلوے ایجاد کر دی ہے۔ ریل سے سفر حج کا دورانیہ کم

میکانزم۔

1850 اور 1919 کے درمیان بھاپ سے چلنے والی ٹیکنالوجی نے دنیا بھر کے مسلمانوں میں ولولوں میں ایک نئی امنگ پیدا کر دی۔ یورپ کے حاجی کے لیے ایک نئی امنگ پیدا کر دی۔ بحری سفر کے لیے بھاپ سے چلنے والی ریل اور سمندری جہاز کی ٹیکنالوجی بھی تھی اور آبادیاں بھی۔ ڈاک جہازوں کی ٹیکنالوجی نے نقل و حرکت کے لیے بڑے پیمانے پر پھیلاؤ اور [illegible] کی نقل و حرکت کے لیے بڑے پیمانے پر ذرائع فراہم کر دیا گیا۔ نئی نئی بندرگاہیں بنیں۔ ریلوے سے [illegible] قریب ہوئے۔ بمبئی، سنگاپور، قاہرہ، ایک ایک ٹیکنالوجی کی دور سے پہلے کے مسلمانوں کے لیے سفر کا مشکل سلسلہ تھا۔

مسلمان ملکوں کے بہت سے شہر ان بندرگاہوں سے منسلک تھے۔ مختلف علاقوں کے مسلمان ان تیز رفتار سفری سہولتوں کی وجہ سے آپس میں بھی ملنے لگے اور حج کے لیے بھی بڑے پیمانے پر استعمال کرنے لگے۔ ان سفری سہولتوں کی وجہ سے حج کے سفر میں تبدیلی بڑے پیمانے پر آ گئی۔

ایک فرق یہ بھی پڑا کہ پہلے بعض ٹریول ایجنٹ صرف حج کے سفر پر توجہ دیتے تھے۔ اب وہ دوسرے عام سفروں کے لیے بکنگ کرتے، اس میں حج کے عازمین کی بھی بکنگ کر لیتے۔ حج پیکیج مجموعی ٹرانسپورٹ بزنس کا حصہ بن گیا۔

ان سہولتوں کی بدولت عازمین حج کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ 1911 میں صرف جاوا جیسے دور دراز علاقے سے 7600 خوش نصیب پہنچے۔ یہ ظاہر ہونے لگا کہ حج اب صرف خوشحال مسلمانوں یا بہت زیادہ پارسا مومنوں تک محدود نہیں رہا ہے۔

یہ سفر جہاں سہولتیں لائے وہاں اتنی تعداد میں مسافروں کی نقل و حرکت سے بعض متعدی بیماریاں بھی پھیلنے لگیں جن میں ہیضہ نمایاں تھا۔

ایک روشن پہلو یہ بھی ہوا کہ ان بحری جہازوں میں صرف مسلم ہی سفر نہیں کرتے تھے۔ دوسرے مذاہب کے ماننے والے بھی اپنی اپنی منزلوں کی طرف جاتے تھے۔ اس طرح مختلف مذاہب کے پیروکاروں سے مسلمانوں کا رابطہ ہوا۔ ان کے ذہن کھلنے لگے۔ اسلام کی اشاعت بھی ہوئی۔

اس میں بھی ریلوے کا جال تیزی سے پھیلا۔ اس لیے ایران اور بعض دوسرے ممالک کے مسلمان اس راستے سے سفر کرنے لگے۔ 1893 میں روسی قونصل نے جدہ میں روس سے آنے والے حاجیوں کے وفد کا شمار کیا تو اس کی تعداد ہندوستان اور ایران سے ہر سال آنے والے 25000 عازمین کے برابر تھی۔

1880 کے عشرے میں بخارا کی مشہور سڑک کی تعمیر تک اس نے ہندوستان سے اور 1900 کے عشرے میں وسطی مسلم ملکوں [illegible] نے روسی سلطنت سے حاجیوں کے سفر کا انتظام [illegible] تجارتی قافلوں پر یہ کرتے تھے۔ [illegible] عازمین اونٹ اور گھوڑوں پر سفر کرنے لگے۔

1920 کے عشرے تک ایران میں کوئی ریلوے نہیں تھی۔ اس لیے وہ بحری جہاز [illegible] کے لیے پہلے بمبئی [illegible] کی بندرگاہ [illegible] جاتے۔ وہاں سے [illegible] پہنچتے۔ جہاں سے [illegible] جاتے۔ بحیرۂ اسود کی روسی بندرگاہ [illegible] پہنچتے۔ جہاں سے آسانی سے استنبول اور جدہ جا سکتے۔ ریلوے اسٹیشنوں اور بندرگاہوں کے قریب حاجیوں کے لیے ہوٹل بھی تعمیر تھے۔ روسی سلطنت میں حج یادگاریں بنائے گئے تھے۔

بحری جہازوں اور ریلوے سے سفر حج کرنے والے عازمین نئے شہروں سے گزرتے اور قیام کرتے۔ اس طرح ان کا ذہن کھلتا۔ نئے نئے لوگ ملتے۔ دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے بھی ملاقات ہوتی۔ ہندوستان والوں کے لیے بعض سنگاپور اور افریقہ کی بندرگاہوں میں قیام ناگزیر تھا۔ اس راستے سے حج کرنے والے بعض خوشحال افراد نے سفرنامے قلمبند کیے ہیں جن میں مناسک حج کے جذباتی اظہار کے ساتھ نئی دنیا میں۔ ثقافتیں اور معاشرے دیکھنے پر بھی مسرت ظاہر کی گئی ہے۔

حمیدیہ حجاز ریلوے یادگار۔

1900 میں سلطان عبدالحمید دوم نے استنبول سے مکہ تک ریلوے کی تعمیر کا آغاز کیا۔ اس وقت کی جدید ترین ریلوے۔ اس کے اخراجات دنیا بھر کے خوشحال مسلمانوں کے عطیات سے پورے کیے گئے۔ یہ مسلم امہ کے بین الاسلامی اتحاد کا ایک منصوبہ تھا۔ تعمیر ستمبر 1900 میں شروع ہوئی اور ستمبر 1908 میں تکمیل کو پہنچی۔ جب استنبول سے عازمین کا سفر براستہ دمشق مدینہ کے لیے آغاز ہوا۔ اس تعمیر کو عثمانی دور کا سب سے اہم کارنامہ قرار دیا گیا۔ یہ فلسطین کے شہر حائفہ سے بھی گزرتی تھی جہاں سے مسافر دوسری ٹرین لے کر اس بین الاقوامی ٹریک کے مرکزی راستے پر جا سکتے تھے۔

حائفہ ریلوے اسٹیشن اس لیے مرکزیت اور اہمیت رکھتا تھا کہ یہاں یورپی مسافر بھی موجود ہوتے تھے جن میں یہود و نصاریٰ دونوں شامل ہیں۔ وہ اپنے اپنے مقدس مقامات کے لیے یہاں سے سفر کرتے تھے۔ سلطان عبدالحمید نے یہ یادگاری ستون استنبول یا مدینہ میں نہیں حائفہ میں تعمیر کروایا جس سے عثمانیوں کی عالی بصیرت اجاگر ہوتی ہے کہ وہ پوری انسانیت کے آرام اور تحفظ کو مدنظر رکھ رہے تھے۔

حجاز ریلوے کی تعمیر نے 40 دن کے سفر کو 3 دن کی مسافت میں تبدیل کر دیا۔ بہت سے مسلمان جو اونٹوں کے ذریعے طویل سفر حج کو ہی اصل حج کہتے تھے۔ انہوں نے اس ریلوے سفر کو "زنانہ روٹ" کہنا شروع کر دیا۔ وقت وقت کی بات ہے اب تو زیادہ حجاج کرام ہوائی جہاز کو ہی وسیلہ سفر بناتے ہیں۔

دورِ عثمانیہ میں حج بیت اللہ کے مناسک۔

1517 میں مملوک سلطانوں کی شکست کے بعد مشرق وسطیٰ، شمالی افریقہ سب سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں آ گئے۔ مکہ، مدینہ اور یروشلم جیسے مقدس شہر بھی خلافت عثمانیہ کا حصہ بن گئے۔ عثمانی خلفاء کو خادم الحرمین کا خطاب مل گیا اور وہ حج کے راستوں کے محافظ بھی تصور کیے جانے لگے۔ مختلف ممالک سے مکہ مدینہ جانے والی شاہراہیں، ان کی حفاظت، دیکھ بھال، سہولتوں کی فراہمی، سلاطین کی ذمہ داری تھی اور ان کی مذہبی قیادت کا منصب بھی۔ عثمانی سلاطین نے دمشق سے مکہ کے پرانے راستوں کی تعمیر نو کا حکم دیا اور ان راستوں کی استنبول تک توسیع بھی کروائی۔ یہی راستہ یروشلم تک مسیحیوں کی تجارت اور کاروبار کے راستے کا بھی حصہ تھا۔

استنبول سے دمشق تک شمالی حصے میں اس دور میں عازمین حج کے لیے بہت سی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ ایسی بڑی عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ جنوبی حصے میں قلعے اور آبی ذخیرے تعمیر کیے گئے۔ بیسویں صدی میں سلطان عبدالحمید دوم (1876-1909) نے حجاز ریلوے لائن کی تعمیر کا حکم دیا جس سے استنبول، مکہ مدینہ سے مربوط ہو گیا۔

محققین کو اس روٹ پر بڑی عمارتوں کے آثار ملے ہیں۔ ان پر عربی اور دوسری زبانوں میں عبارتیں کندہ ہیں۔ اردن میں معان، سعودی عرب میں تبوک، قلعہ معظم، فلسطین میں حائفہ ریلوے اسٹیشن کے نزدیک یہ نشانیاں اور طغرے پائے گئے۔

معان، اردن میں جزیرہ نمائے عرب (اب سعودی عرب) میں داخل ہونے سے پہلے آخری حج اسٹیشن تھا جہاں عثمانیوں نے ایک قلعہ اور ایک آبی ذخیرہ تعمیر کروایا۔ ان قلعوں میں عازمین کے حج کے لیے جاتے وقت اور حج سے واپسی پر قیام و طعام کی سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں۔ آبی ذخیرے پینے کے پانی اور غسل وغیرہ کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ ان آثار نے ثابت کیا ہے کہ عثمانی دور میں سفر حج کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ اور محفوظ بنانے کے لیے سہولتوں کی فراہمی پر توجہ مرکوز کی گئیں۔ عین اس دور میں یورپ میں بھی انسانی سفر نئی ایجادات سے آسان اور تیز رفتار ہو رہا تھا۔ عثمانی خلیفوں نے وہی آسانیاں سفر حج پر جانے والوں کے لیے بھی مہیا کیں۔

معان میں قلعے کے داخلی دروازے پر یہ طغرئی آویزاں تھا جس کی عبارت کچھ ایسے ہے۔

"شاہ جہاں او ہفت اقلیم۔ رحم دلی نے حکم دیا۔ شام میں اپنے عامل (افسر) قباد پاشا کے ذریعے کہ معان میں قلعہ تعمیر کیا جائے اور ذخیرۂ آب۔ الحمدللہ۔ پاشا نے حرمین کو جانے والی شاہراہ کی تعمیر نو کی تزئین کی۔ عازمین حج نے شکریہ ادا کیا۔ دعائیں کیں۔ کتنا کرم ہے۔ کتنی نوازش ہے۔ خوش نویس سکونی نے یہ طغرئی تخلیق کیا۔"

اس طغرئی کے آخر میں ترکش سطر سے اس کی تعمیر کی تاریخ نکلتی ہے جو 1563 عیسوی اور 971 ہجری ہے۔

تبوک میں بھی ریلوے اسٹیشن کے ساتھ قلعہ تعمیر کیا گیا۔ یہ قلعہ دو منزلہ تھا۔ جس میں ایک بڑا ہال۔ کئی کمرے۔ ایک مسجد اور ایک کنواں تھا۔ دونوں منزلوں پر یہی سہولتیں تھیں۔ قلعے کے ساتھ ہی بڑے اونچے مینار تھے جہاں سے دور دور تک آس پاس کے علاقے کی نگرانی کی جا سکتی تھی۔

اس قلعے کے آس پاس موجود طغرے سلطان عبدالحمید اول سے سلطان عبدالحمید دوم تک کے دور کی تاریخ بیان کرتے ہیں۔

اسی طرح اس راستے پر کئی مقامات پر آبی ذخیرے قائم کیے گئے اور ان کے تحفظ کے لیے قلعے بنائے گئے جہاں باقاعدہ فوجی موجود رہتے تھے۔

بقیہ واقعات اگلے شمارے میں ملاحظہ کریں

پراسرار کھوپڑی

سید احتشام

محل کے کھنڈر سے اُسے ایک کاسۂ سر ملا۔ اس کھوپڑی کو وہ گھر لے آیا۔ ابھی وہ اپنے شہر پہنچا ہی تھا کہ اس پر قاتلانہ حملے شروع ہوگئے۔ کچھ لوگ اس کھوپڑی کو چھین لینا چاہتے تھے کیونکہ اس کھوپڑی میں اہم راز چھپا ہوا تھا۔

امریکا سے درآمد ایک حیران کن واقعہ

کچھ لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر خوامخواہ مصیبتوں کو دعوت دیتے ہیں یا پھر پریشانیاں ان کے تعاقب میں رہتی ہیں۔ اگرچہ ماہر حیات پروفیسر فریڈ کے بارے میں یہ طے کرنا تو مشکل تھا کہ کون سی بات درست تھی۔ پہلی یا دوسری لیکن اس کے دیرینہ دوست میجر ڈیوس کی رائے تھی کہ پروفیسر فریڈ، پریشانیوں کے لیے اپنے اندر ایک مقناطیسی کشش رکھتا تھا حالانکہ جب پروفیسر فریڈ، میجر ڈیوس کے ہمراہ میکسیکو گیا تو وہ پریشانیوں کو دعوت دینے کا قطعی کوئی

ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ محض سیر و تفریح کے خیال سے میجر کے ہمراہ ہو لیا تھا لیکن وہاں پہنچ کر جب ایز ٹیک (EZ TEK) کے کھنڈرات میں دلچسپی لی تو پہلے ہی موقع پر مشکلیں اس کے گلے پڑ گئیں۔

میجر ڈیوس ایک مشن کے سلسلے میں میکسیکو گیا تھا حالانکہ وہ ایک ریٹائرڈ مائننگ انجینئر تھا۔ اس نے اپنے چند دیرینہ دوستوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی نارتھ ویسٹرن کمپنی کی بعض رپورٹوں کا جائزہ لے گا لیکن وہ کام اس کی توقع سے کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا تھا۔ نارتھ ویسٹرن ایک مائننگ کمپنی تھی جو کانوں سے چاندی نکالتی تھی۔ پروفیسر فریڈ کو نہ تو چاندی سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی میجر کی پیشہ ورانہ مصروفیات سے، جس میں میجر الجھ کر رہ گیا تھا چنانچہ وہ ان معاملات سے بور ہو کر تن تنہا میکسیکو کی سیر کرنے نکل کھڑا ہوا۔ وہ ایک ماہر جرمیات تھا لیکن اسے آثار قدیمہ سے بھی خاصی دلچسپی تھی اور یہی دلچسپی اسے ایز ٹیک نسل کے کھنڈرات میں لے گئی جو سانتا ہیریا کے باہر واقع تھے۔ وہاں وہ کھنڈرات میں اپنی چھڑی سے چند چیزوں کو کریدتا رہا پھر اس نے وہاں سے وہ تین چیزیں اٹھائیں اور اس کے چند ہی گھنٹے کے بعد پریشانیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

17 مئی کو تپتی دھوپ میں دن بھر مارے مارے پھرنے کے بعد وہ سانتا ہیریا میں واقع اپنی بوسیدہ سی سرائے میں واپس آیا تو مارے تھکن کے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ بھوک بھی شدت کی لگ رہی تھی لیکن سرائے میں جو کھانا اسے پیش کیا گیا وہ اتنا بدمزہ تھا کہ اس نے دوبارہ ایز ٹیک کے کھنڈرات کا رخ کرنے سے توبہ کر لی۔ کھانا جیسے تیسے زہر مار کر کے اس نے شراب کی چند چسکیاں لیں، کچھ دیر تک سگار کے کش لیتا رہا اور پھر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ جلد ہی اسے نیند آ گئی۔

رات شاید آدھی بیت چکی تھی۔ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ نیم تاریک کمرے میں اسے اپنے بیڈ کے پاس دو انسانی سائے نظر آئے۔ اس نے اپنی آنکھیں ملیں۔ وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا؟ نہیں۔ یہ کوئی خواب نہیں تھا۔ اس کی چھٹی حس نے اسے نیند سے جگا دیا تھا۔

"کیا تمہیں کچھ چاہیے؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔

ان میں سے ایک یہ سوال سن کر ششدر رہ گیا۔

اچانک اس نے پروفیسر پر چھلانگ لگائی لیکن پروفیسر تیزی سے بیڈ کے دوسری طرف کود گیا۔ پھر وہ اتنے زور زور سے چیخنے لگا کہ وہ دونوں کھڑکی سے ہو کر چھت پر پہنچ گئے اور وہاں سے نیچے اپنے گھوڑوں کی پیٹھ پر چھلانگ لگا کر چا۔ سرائے کا رکھوالا اور باورچی اپنی بندوقوں سے ہوائی فائرنگ کرنے لگے۔ پروفیسر کی چیخوں نے پوری سرائے کو جگا دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں بیرک سے پولیس کا ایک اہلکار بھی وہاں پہنچ گیا۔

"ڈاکو ہوں گے۔" وہ منمنایا۔

"ہاں۔" پروفیسر نے اس سے اتفاق کیا۔ "وہ ڈاکو ہی تھے۔ تم فوراً ان کا پیچھا کرو۔"

اہلکار نے شانے اچکائے۔ "آج رات تو پیچھا کرنا بے کار ہو گا۔" وہ بولا۔ "سینور، آج آسمان پر چاند نہیں ہے اور اگر چاند ہوتا تب بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ ڈاکو آئے تھے اور بھاگ گئے۔ سینور، آپ ہم سے معجزے کی توقع نہ کریں۔ صبح میں اس واقعہ کی رپورٹ کر دوں گا۔ پھر سراغ لگانے کی کوشش کی جائے گی۔ کیا سینور کو لوٹا گیا ہے؟"

پروفیسر نے جلدی جلدی اپنا سامان چیک کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے لوٹا نہیں گیا تھا۔

"تو...... اس صورت میں!" اہلکار گویا ہوا۔ "ہمیں اپنی نیند خراب کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر سینور کو لوٹا بھی گیا ہوتا تو!"

پروفیسر کمزور پڑ گیا۔ اس نے برف کا پانی لانے کا حکم دیا۔

"سینور۔" سرائے کا مالک بولا۔ "گرمی کا موسم ہے۔ برف پگھل جاتی ہے۔"

پروفیسر اپنا سر پیٹ کر رہ گیا۔

صبح کو اس نے باہر نکلنے کے لیے کپڑے پہنتے ہوئے غور کیا کہ اس کے کالر کا ایک بٹن ٹوٹ گیا تھا چنانچہ اس نے سوچا کہ سب سے پہلے وہ کسی دکان سے بٹن خریدے گا۔ وہ جیسے ہی سرائے سے باہر نکلا، اسے برآمدے کے ایک ستون سے ایک شخص ٹیک لگائے کھڑا ہوا نظر آیا۔ وہ نہ صرف کانا تھا بلکہ شکل ہی سے کوئی چھٹا ہوا بدمعاش لگتا تھا۔ سانتا ہیریا میں صرف ایک ہی سڑک تھی۔ پروفیسر اس سڑک پر گامزن ہو گیا۔ جلد ہی اسے اپنی مطلوبہ دکان نظر آ گئی اور وہ دکان کے اندر داخل ہو گیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد جب وہ دکان سے نکلا تو اسے پھر وہی کانا بدمعاش دکان کے شوکیس کے پاس کھڑا ہوا نظر آیا۔ پروفیسر اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا

لیکن وہ جہاں جہاں گیا، اس نے اس کانے کو اپنا تعاقب کرتے ہوئے پایا۔ ایک جگہ اس نے رک کر ایک پولیس مین سے اس کانے کی شکایت کی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اہلکار اس کانے سے باز پرس کرتا، وہ غائب ہو گیا۔

پروفیسر، اپنی سرائے لوٹ آیا۔ پھر جب اس نے ایک کھڑکی سے باہر دیکھا تو وہی بدمعاش اسے برآمدے کے ایک ستون سے ٹیک لگائے ہوئے نظر آیا۔ پروفیسر کو اپنے اعصاب جواب دیتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ چنانچہ اس نے فوراً میکسیکو سٹی واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت میکسیکو سٹی کے لیے کوئی ٹرین نہیں تھی، لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ چھوٹی ٹرین سے 'گرینا ڈیلا' روانہ ہو جائے گا اور پھر وہاں سے میکسیکو جانے والی ٹرین پکڑے گا۔

☆☆☆

جب وہ ریلوے اسٹیشن پہنچا تو اچانک تین آدمیوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ وہ اس سے اس کا سامان چھیننا چاہتے تھے۔ پروفیسر کی چیخ و پکار سن کر ریلوے کے حکام وہاں پہنچ گئے اور وہ تینوں بدمعاش بھاگ کھڑے ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب سست رفتار ٹرین وہاں سے روانہ ہوئی تو پروفیسر نے سکون کی گہری سانس لی اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر غور کرنے لگا۔

یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ چونکہ میکسیکو میں ڈاکوؤں کا راج تھا، لہٰذا وہ ڈاکو رات میں اس کے کمرے میں گھس آئے تھے۔ یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں تھا لیکن ایک بدمعاش مسلسل اس کا تعاقب کیوں کر رہا تھا اور پھر اسٹیشن پر اس پر حملہ کیوں کیا گیا تھا؟ آخر اس کا کیا جواز تھا؟

وہ اپنی سیٹ پر مزید دھنس گیا اور پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ اس کی شخصیت متاثر کن نہیں تھی۔ وہ ایک منحنی سا شخص تھا اور عینک استعمال کرتا تھا۔ میجر ڈیوس کے خیال میں، وہ انتہائی نرم طبیعت کا حامل شخص تھا۔ اس نے پائپ میں تمباکو بھر کر پائپ جیب میں رکھ لیا اور ماچس تلاش کرنے لگا لیکن اس کے پاس ماچس نہیں تھی۔ اس نے کسی مسافر سے ماچس طلب کرنے کے خیال سے گردن اِدھر اُدھر گھمائی اور پھر اچانک اس کا پائپ ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔

تین سیٹ پیچھے وہی کانا بدمعاش بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا اور براہِ راست اسے گھور رہا تھا۔ پروفیسر اٹھ کھڑا ہوا اور سیدھا اس کانے کے پاس پہنچ گیا۔

"ماچس؟" وہ اپنے پائپ کی طرف اشارہ کر کے اس کانے سے مخاطب ہوا۔

کانے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ پروفیسر کو اپنی ہسپانوی پر کوئی بھروسا نہیں تھا۔ اس نے دوبارہ کوشش کی۔ "فاسفو...... پھر یلا؟"

اس مرتبہ بدمعاش نے اپنے کوٹ کو ذرا پیچھے کیا اور بڑے ہی پراسرار انداز میں ایک ہاتھ جیب میں ڈالا۔ پروفیسر کی نگاہ اس کی پتلون کی بیلٹ پر چلی گئی جس میں ایک چاقو اڑسا ہوا تھا لیکن بدمعاش نے اپنی جیب میں سے ماچس کی ڈبیا نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

پروفیسر نے اپنا پائپ سلگاتے ہوئے، اس بدمعاش کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ اس کے چہرے سے خباثت ٹپکتی تھی۔ ہونٹ پھیلے ہوئے تھے اور ٹھوڑی پر چاقو سے کٹنے کا گہرا نشان تھا۔

"شکریہ۔" پروفیسر نے پائپ سلگا کر ماچس اسے واپس کر دی۔ جواب میں کانا غرا کر رہ گیا۔

"یہ ٹرین بڑی سست رفتار ہے۔" پروفیسر نے تبصرہ کیا۔

جواب میں وہ ایک بار پھر غرایا۔

"لیکن یہ اپنے وقت پر گرینا ڈیلا پہنچ ہی جائے گی۔" پروفیسر نے کہا۔

اس مرتبہ وہ بدمعاش غرایا تک نہیں۔ پروفیسر نے اپنے شانے اچکائے اور واپس اپنی سیٹ پر چلا گیا۔

گرینا ڈیلا پہنچ کر پروفیسر نے پلیٹ فارم پر اِدھر اُدھر دیکھا لیکن وہ بدمعاش کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ پروفیسر کے پاس ایک بھاری بھرکم بیگ اور ایک سوٹ کیس تھا۔ اس نے وہ بیگ وہاں سے میکسیکو سٹی پارسل کروا دیا اور سوٹ کیس اٹھا کر رات گزارنے کے لیے امریکن ہوٹل پہنچ گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح ناشتے کے بعد ٹرین کی آمد میں دو گھنٹے رہتے تھے۔ چنانچہ وہ وقت گزارنے کے لیے شہر کی سیر کو نکل گیا اور اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہ کانا بدمعاش اب اس کا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔ لیکن جب وہ واپس اپنے ہوٹل پہنچا تو اس کے کمرے کا نقشہ ہی یکسر بدلا ہوا تھا۔ ہر شے کو الٹ پلٹ دیا گیا تھا۔

پروفیسر کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے منیجر کو طلب کر کے اپنی بھڑاس نکالی اور سوٹ کیس اٹھا کر ٹرین پکڑنے کے لیے اسٹیشن کی طرف چل دیا اور پھر دورانِ سفر

urdunovels.com

سکون سے بیٹھا پائپ پیتا رہا۔ جب وہ اپنی منزل پر پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ وہ سیکیورٹی کی روشنیوں اور لوگوں کے اژدحام سے مانوس تھا۔ ایک پورٹر نے اس کا سوٹ کیس اٹھا کر اسے ایک ٹیکسی تک پہنچا دیا۔ پروفیسر ٹیکسی ڈرائیور کو میجر ڈیوس کے گھر کا پتا بتا کر ٹیکسی میں آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی روانہ ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد پروفیسر نے اچانک محسوس کیا کہ ٹیکسی عام شاہراہ سے ایک تنگ سی غیر مانوس سڑک پر مڑ گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور اسے غیر ملکی سمجھ کر اس سے زیادہ کرایہ اینٹھنے کے لیے اسے ایک لمبا چکر دینا چاہ رہا تھا۔

"مختصر ترین راستہ اختیار کرو۔" پروفیسر چیخا۔

جواب میں ٹیکسی ڈرائیور نے رفتار میں اچانک اضافہ کر دیا۔ "میں کہتا ہوں......!" پروفیسر نے پھر چیخنا شروع کر دیا لیکن ٹیکسی ڈرائیور کے کان غالباً بہرے تھے۔

پروفیسر اسے دھمکیوں پر دھمکیاں دے رہا تھا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آخرکار اس نے ٹیکسی ایک تاریک گلی میں لے جا کر فٹ پاتھ کے کنارے روک دی۔ پروفیسر غصے سے آگ بگولا ہو کر ٹیکسی سے اترا۔ اسی وقت تاریکی میں سے دو افراد تیزی سے اس کے قریب آ گئے۔ پروفیسر گھبرا کر پیچھے ہٹا تو ٹیکسی ڈرائیور نے اسے پیچھے سے آگے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے ہی والا تھا کہ ان میں سے ایک نے اسے پکڑ لیا۔ پروفیسر اس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے بری طرح ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ اس دھینگا مشتی کے دوران وہ شخص دور جا گرا۔ پروفیسر مدد کے لیے پکارنے لگا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اس کی چیخ و پکار سن کر پولیس کا ایک اہلکار بھاگتا ہوا اس کی طرف آتا نظر آیا۔ دونوں بدمعاش آناً فاناً اسی ٹیکسی میں بیٹھ کر فرار ہو گئے۔ پروفیسر کو زیادہ چوٹ نہیں لگی تھی۔ صرف چند خراشیں آئی تھیں لیکن وہ اپنے سوٹ کیس سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ وہ زمین پر سے اٹھا اور دوسری ٹیکسی پکڑ کر گھر پہنچ گیا۔

☆☆☆

جب میجر ڈیوس نے اس کی مہم جوئی کی داستان سنی تو اسے غور سے دیکھنے لگا۔ "تم نے سانتا ماریا سے کیا اکٹھا کیا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" پروفیسر نے جواب دیا۔ "ایزٹیک کے کھنڈرات سے محض چند اینٹیں اور ایک دو چیزیں اٹھائی تھیں۔"

"آہا، پھر تو اس معاملے کی وضاحت ہو گئی۔" میجر بول پڑا۔

"کیا مطلب؟"

"تم کھنڈرات دیکھنے گئے اور تم نے مقامی باشندوں کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیا۔" میجر نے کہا۔ "کیوں؟ اس لیے کہ تم وہاں سے کوئی ایسی شے اٹھا لائے جس کی انہیں شدت سے تلاش ہو گی۔ اب مجھے صرف یہ بتا دو کہ تم ایزٹیک محل کے کھنڈرات سے کیا اٹھا کر لائے تھے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" پروفیسر نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "ایک منٹ...... میں وہاں سے ایک انسانی کھوپڑی اٹھا لایا تھا۔"

"کھوپڑی؟" میجر مسکرانے لگا۔ "تم کوئی مقدس کھوپڑی اٹھا لائے ہو اور حیران ہو کہ تم پر حملے کیوں ہوئے؟ تم نے اس کھوپڑی کا معائنہ کیا تھا؟"

"نہیں۔ مجھے ابھی اس کی فرصت ہی نہیں ملی۔" پروفیسر نے جواب دیا۔ "لیکن یہ سوچنا انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ......!"

"تمہیں وہ کھوپڑی کہاں ملی تھی؟" میجر نے اس کا جملہ اچک لیا۔

"میں کھنڈرات کے ایک گوشے میں اپنی چھڑی سے زمین کرید رہا تھا۔" پروفیسر نے جواب دیا۔ "وہ کھوپڑی ایک طاق میں پھنسی، پتھروں کے نیچے دبی ہوئی تھی۔"

"کیا کسی نے تمہیں اس کھوپڑی کے ساتھ دیکھا تھا؟" میجر نے سوال کیا۔

پروفیسر ایک بار پھر سوچنے لگا اور پھر گویا ہوا۔ "میں ایک گائیڈ کے ہمراہ وہاں سے روانہ ہو رہا تھا تو چار پانچ گھڑسوار کھنڈرات کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن میں نے کھوپڑی ایک کاغذ میں لپیٹ رکھی تھی۔ انہیں نظر نہیں آئی ہو گی۔"

"بہرکیف، تم اس سے ہاتھ دھو بیٹھے ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ تمہارے سوٹ کیس میں ہو گی جسے ٹیکسی ڈرائیور لے اڑا؟"

"بالکل نہیں۔" پروفیسر نے جواب دیا۔ "وہ اس بیگ میں تھی جو میں نے گریناڈیلا سے یہاں پارسل کیا تھا۔ میں ابھی جا کر اسٹیشن سے بیگ لے آتا ہوں۔"

"ٹھہرو۔ اکیلے مت جاؤ۔" میجر نے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

اور پھر دونوں اسٹیشن جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

اس کے تقریباً نصف گھنٹے بعد وہ بیگ سمیت اسٹیشن سے واپس آ گئے اور انہوں نے بیگ کھول لیا۔ پروفیسر نے اخبار کے کاغذ میں لپٹا ہوا ایک پارسل نکالا اور اس پر لپٹا ہوا کاغذ اتار کر کھوپڑی میجر کے سامنے رکھ دی۔ کھوپڑی کا نچلا حصہ غائب تھا لیکن وہ نہایت عمدہ حالت میں تھی۔ کاسہ سر اور چہرے کی ہڈیوں پر کہیں کہیں خشک کیچڑ جمی ہوئی تھی۔ میجر ڈیوس نے ایک پینسل اٹھا کر کھوپڑی کے اندرونی حصے کو کریدا۔ اس کا خیال تھا کہ کھوپڑی کے اندر کوئی پیغام چھپا ہوا ہو لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

پروفیسر نے کھوپڑی اس سے لے لی اور پینسل کی مدد سے خشک کیچڑ ہٹانے لگا اور تھوڑی ہی سی کیچڑ ہٹی تھی کہ اسے کھوپڑی کی چکنی سطح پر کوئی تحریر نظر آئی جو غالباً پینسل سے لکھی گئی تھی۔ پروفیسر اس تحریر کو حیرت سے گھورنے لگا اور پھر اس نے میجر کو دکھایا۔

”یہاں پینسل سے کچھ لکھا ہوا ہے۔“ وہ بولا اور دوبارہ مٹی ہٹانے لگا یہاں تک کہ کھوپڑی بالکل صاف ہو گئی اور وہ دونوں غور سے کھوپڑی کا جائزہ لینے لگے۔

ان کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی تھی۔ کھوپڑی کے وسط میں، پیشانی پر ایک مثلث بنا ہوا تھا۔ اس کی داہنی آنکھ کے اوپر اس مثلث کے متوازی دائیں ایک مستطیل اور تیر کا ایک نشان تھا۔ نشان کے اوپر انگریزی کا حرف N تحریر تھا۔ مثلث کے دوسری طرف کاسہ سر سے بائیں آنکھ کے اوپر تک آڑی ترچھی لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ یوں گویا وہ کسی آبشار کی نمائندگی کر رہی ہوں۔ مثلث کی چوٹی اور آڑی ترچھی لکیر کے درمیان نرگس کے درخت سے مشابہ کوئی تحریر تھی اور اس کے پہلو میں ایک اور تیر کا نشان تھا جس کا رخ آڑی ترچھی لکیر کی طرف تھا اور اس لکیر کے دوسری طرف ایک واضح نقطہ تھا۔

”یقیناً کوئی پلان ہے۔“ پروفیسر نے یقین سے کہا۔ ”اس پورے نقشے میں صرف ایک ہی چیز واضح ہے۔ قطب نما جیسی علامت، یہ تیر اور N۔“ وہ بولا۔ ”لیکن مثلث کے اوپر کیا بنا ہوا ہے، یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ نرگس کے درخت جیسی کوئی چیز بھی ناقابل فہم ہے۔“

”مجھے تو نرگس کے درخت سے زیادہ گھنگس لگ رہا ہے۔“ میجر نے خیال آرائی کی۔

”ہاں۔ گھنگس ہی ہے۔“ پروفیسر نے تائید کی اور کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

اس علاقے میں جہاں کھنڈرات تھے، گھنگس کی بہتات تھی۔ دونوں دوست ایک گھنٹے تک اس عجیب و غریب نقشے میں سر کھپاتے رہے لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ معما کم از کم میکسیکو سٹی میں تو حل نہیں ہو سکتا تھا۔ اب دونوں کو نیند بھی ستانے لگی تھی چنانچہ وہ اٹھ کر سونے کے لیے اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ پروفیسر پہلے ہی بہت تھکا ہوا تھا۔ وہ بستر پر دراز ہو گیا اور بجلی بند کرتے ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب اس نے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن لاحاصل۔ کسی نے اسے جکڑ رکھا تھا اور پھر کلوروفارم سے چند ہی سیکنڈ میں وہ بیہوش ہو چکا تھا۔

☆☆☆

دوسری بار جب اس کی آنکھ کھلی تو سورج طلوع ہو چکا تھا۔ وہ اب بھی اپنے بیڈ پر تھا لیکن اس کے ہاتھ پیر کسی رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کا خون کھول اٹھا۔ ڈیوس کہاں تھا؟ وہ اس کی مدد کو کیوں نہیں آیا؟ اس کا غصہ تشویش میں بدل گیا۔ اس نے سر موڑ کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی چھ نہیں بجے تھے۔ وہ اپنی کلائیوں کو جھٹکے دے کر رسیوں کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش میں اس کی کھال چھل گئی لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور بالآخر اپنی کلائیاں آزاد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد کا مرحلہ آسان تھا۔

آزاد ہوتے ہی وہ پیروں میں چپل ڈال کر اپنے دوست کے کمرے کی طرف بھاگا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میجر بھی اپنے بیڈ پر بندھا ہوا پڑا تھا اور اس کا منہ بھی کپڑے سے باندھ دیا گیا تھا۔ پروفیسر نے جلدی جلدی اس کی بندشیں کھول کر اسے آزاد کیا۔

”وہ کھوپڑی۔۔۔“ میجر چیخا۔ ”وہ لوگ اس کھوپڑی کے لیے آئے تھے۔“

یہ کہنے کے ساتھ ہی وہ نچلی منزل پر واقع اپنی اسٹڈی کی طرف بھاگا۔ پروفیسر اس کے پیچھے تھا۔ میجر دہلیز پر ٹھٹک گیا۔ ان کی نظریں میز پر جم گئیں جہاں انہوں نے پچھلی رات وہ کھوپڑی رکھی تھی۔ اب وہ غائب تھی۔ پروفیسر کی نظریں غیر شعوری طور پر میز کے نیچے چلی گئیں۔ وہ مطمئنا

پروفیسر جلدی سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔
"کیا؟" میجر چونک کر چیخا۔
"قتل؟" پروفیسر نے دہرایا۔ "قتل...... خدا کی پناہ! قتل ہے!"
سامنے کسی کی لاش پڑی ہوئی تھی...... کسی اجنبی کی لاش۔ پروفیسر جلدی سے آگے بڑھا اور لاش پر جھک گیا۔ اس شخص کو چھرا گھونپا گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا، اسے مرے ہوئے چند ہی گھنٹے ہوئے تھے۔ وہ کوئی میکسیکن لگتا تھا اور اس نے اپنے خون سے فرش پر کچھ لکھنے کی کوشش کی تھی۔ تحریر واضح تھی۔ لکھا تھا...... BA7......

"اور کھوپڑی غائب ہوگئی۔" میجر نے مہر سکوت توڑا۔

"ہاں۔" پروفیسر نے جواب دیا۔ "کھوپڑی غائب ہوگئی اور ہم ایک اور معاملے کے لیے رہ گئے۔ ایک مردہ شخص اور خون سے لکھا ہوا ایک پیغام...... یہ مرتے ہوئے کوئی سراغ چھوڑنا چاہتا تھا۔ BA7...... آخر اس کا کیا مطلب ہوا؟"

میجر نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ کھڑکی کے پردے صبح کی ہوا میں لہرا رہے تھے۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور ایک جگہ ایک سوراخ نظر آرہا تھا۔ "معلوم ہوتا ہے، دو پارٹیاں اس کھوپڑی کو حاصل کرنا چاہتی تھیں۔" پروفیسر نے خیال آرائی کی۔ "یہ مردہ شخص ان میں سے ایک پارٹی کی نمائندگی کرتا ہے۔ بہتر ہے کہ تم پولیس کو طلب کرو۔ ممکن ہے، وہ اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔"

☆☆☆

میجر نے پولیس کو فون کردیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہیڈ کوارٹر سے ایک ذمے دار پولیس آفیسر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے جیسے ہی فرش پر لکھی ہوئی خونی تحریر دیکھی، اپنے چیف ڈیکن کو بلا لیا۔ چیف ڈیکن فوراً ہی پہنچ گیا۔ وہ چھوٹے سے قد کا ایک چاق و چوبند افسر تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ فرش پر لکھے ہوئے خونی پیغام کو پڑھتے ہی اس کے تاثرات سے یہ اندازہ ہوگیا کہ وہ اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"کیا تم اس کی وضاحت کرسکتے ہو؟" پروفیسر نے اس سے پوچھا۔

"ہاں، سنیور...... مرنے والے نے BAZA لکھنے

مئی 2026ء کا شمارہ ایک نظر میں

تریاق
الجھے معمے سلجھانے والے ایک پرعزم نوجوان کی داستان فرح بخاری کے قلم کی روانی

کالا طوفان
ماضی کا آئینہ، بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات اے آر راجپوت کے قلم سے

جانباز
ظلم کے خلاف سینہ سپر نوجوان کی داستان...... اسما قادری کی اچھوتی تحریر

جانگلی
ایک ایسے نوجوان کی کہانی جو اپنی صلاحیتوں کو آزمانا چاہتا تھا...... ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم کی جادوگری

ان کے علاوہ
جاوید بسام، عبرق بخاری، صائمہ دانش، طیب سنگھانوی، مظہر سلیم ہاشمی، محمد عثمان ذوالفقار و دیگر کی خوب صورت تحریریں

کی کوشش کی تھی۔" وہ بولا۔ "آپ جسے 7 سمجھ رہے ہیں، وہ دراصل مکمل Z ہے۔ اگر مرنے والے میں کچھ قوت باقی رہتی تو وہ Z کو نہ صرف مکمل کرتا بلکہ اس سے آگے A کا بھی اضافہ کرتا۔ وہ BAZA لکھنا چاہتا تھا لیکن موت نے اسے اتنی مہلت نہیں دی۔ آپ نے شاید مائیکل بازا کا نام سنا ہوگا۔"

"تمہاری مراد اس خطرناک ڈاکو سے ہے؟" میجر پوچھ بیٹھا۔

"ہاں۔ سنیور۔" چیف نے جواب دیا۔ "میں اس گروہ کو شخصی طور پر نہیں جانتا لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ بازا کو اپنے بعض پیروکاروں سے سخت مخالفتوں کا سامنا تھا۔ ابھی حال ہی میں ایک بہت بڑی ڈکیتی کے نتیجے میں اس کے گروہ میں زبردست بغاوت ہوگئی تھی۔ ہمارے آدمیوں کو اس خونی بغاوت کے شواہد ملے تھے۔ ڈاکوؤں نے آپس میں ایک دوسرے کو اڑا دیا تھا۔ اب ایسا لگتا ہے کہ ان میں باہمی منافرت کا سلسلہ چل رہا ہے جس کے اثرات یہاں میکسیکو میں بھی پڑ رہے ہیں۔"

"تب پھر اگر "بازا" اس قتل کا ذمّے دار ہے اور اگر وہ اس کھوپڑی کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ مجھ پر ہونے والے حملے کا بھی ذمّے دار ہوگا۔" پروفیسر نے خیال آرائی کی۔

"حملے..... کھوپڑی..... سنیور، میں سمجھا نہیں۔ آپ مجھے ذرا تفصیل سے بتائیں۔" ڈیکمن حیرت سے بولا۔

پروفیسر نے اسے شروع سے آخر تک ساری بات بتادی اور پھر ایک کاغذ پر وہ نقشہ بھی بنادیا جو اس کھوپڑی پر موجود تھا۔ پولیس چیف نے اس نقشے کا معائنہ کیا لیکن وہ بھی کچھ سمجھنے سے قاصر رہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کسی مقام کی نشاندہی کرتا ہے۔" وہ بولا۔ "ہوسکتا ہے، یہ خود بازا کا گڑھ ہو لیکن یہ معاملہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ میں ایک سال سے اس بدنام زمانہ ڈاکو کو پکڑنے کے لیے پورے میکسیکو میں خاک چھانتا پھر رہا ہوں لیکن وہ ہر بار مجھے دھوکا دے کر نکل جاتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ کبھی قانون کی گرفت میں نہیں آسکتا لیکن میں ایک دن یہ ثابت کردوں گا کہ اس کا دعویٰ غلط تھا۔"

اس کے بعد وہ اپنے نائب ڈیلین جن کو وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ دوسرے پولیس افسران بھی آتے جاتے رہے۔ پروفیسر کو بھی شامل تفتیش کرلیا گیا۔ پھر لاش وہاں سے اٹھالی گئی اور سہ پہر تک کچھ سکون ہوگیا۔ ان مصروفیات سے فرصت ملی تو میجر اپنے دوستوں سے ملنے نارتھ ویسٹرن کمپنی چلا گیا۔ وہاں سے وہ شام میں لوٹا تو اس کے پاس دلچسپ معلومات تھیں۔

"یہ بڑی عجیب بات ہے کہ تم بازا سے جا ٹکرائے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "اس نے چند ہفتے قبل نارتھ ویسٹرن کمپنی کی ایک ٹرین پر ڈاکا ڈالا تھا جس میں چاندی لدی ہوئی تھی۔ اس کے گروہ نے محافظوں کو مار ڈالا اور ساری چاندی لے کر فرار ہوگئے۔ بعد میں خود ان میں پھوٹ پڑ گئی اور وہ ایک دوسرے کا صفایا کرنے لگے۔ آج صبح چیف ڈیکمن اسی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ وہ خونی معرکہ آرائی ایزٹیک قلعے کے کھنڈرات کے قریب ہوئی تھی۔"

"آہا......" بے اختیار پروفیسر کے منہ سے نکلا۔ "میرا خیال ہے، میں ایک بار پھر ان کھنڈرات کو دیکھ آؤں۔ صبح تقریباً نو بجے ایک ٹرین روانہ ہوتی ہے۔ ہم کل رات تک سانتا فیریا پہنچ جائیں گے۔"

"ہرگز نہیں۔ نہ تو میں یہاں سے ہلوں گا اور نہ ہی تمہیں ہلنے دوں گا۔" میجر مستحکم لہجے میں بولا۔

لیکن پروفیسر نے اس کی ایک نہ سنی۔ چاروناچار میجر کو اس کا ساتھ دینا پڑا۔ اگلے دن سہ پہر میں وہ گریناڈیلا پہنچ گئے۔ وہاں سے انہیں سانتا فیریا کی ٹرین پکڑنی تھی لیکن اس میں ابھی چند گھنٹے رہتے تھے چنانچہ دونوں شہر کی سیر کو نکل گئے۔ میجر ڈیوس شہر سے کچھ فاصلے پر واقع پہاڑیوں کا جائزہ لینے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ ان پہاڑیوں میں چاندی کے ذخائر تھے۔ گریناڈیلا، ایک انتہائی بے کیف اور بے لطف جگہ تھی۔ یہ میکسیکو سٹی اور سانتا فیریا کے درمیان محض ایک پڑاؤ تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ پروفیسر کے چہرے پر اکتاہٹ تھی۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا، آگے بڑھ رہا تھا۔ واقعی، بڑی بے رونق جگہ تھی۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا اور اچانک ہی اس کی اکتاہٹ دفع ہوگئی۔ وہی کانا بدمعاش ان کا تعاقب کر رہا تھا۔

پروفیسر نے آہستہ سے میجر کا بازو پکڑ لیا۔ "پلٹ کر مت دیکھنا۔" وہ سرگوشیوں میں بولا۔ "میرا پرانا کانا دوست ایک بار پھر نہایت سرشاری کے عالم میں ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ بڑا ہی پُرکشش ہے۔ جیل کی رونق بڑھ جائے گی۔ وہ اس کے لیے بے حد موزوں ہے۔"

"چلو، آگے کے نکڑ تک چلیں۔" میجر نے کہا۔

urdunovels.com

دونوں قدم بڑھاتے ہوئے کھوہ پر پہنچ گئے اور ایک
... کرانے کا انتظار کرنے لگے۔ کانے نے
وہاں سے چیک کر کے اپنی جھلک دکھائی۔ میجر نے اچھل کر اسے
دبوچ لیا اور پروفیسر نے چیخ چیخ کر لوگوں کو اکٹھا کر لیا۔ "یہ
ڈاکو ہے، ڈاکو ہے، چور ہے۔ پولیس کو بلاؤ، پولیس کو
بلاؤ۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" کانا حلق پھاڑ کر چیخا۔ "مجھے جانے
دو، مجھے جانے دو۔"

اسی وقت ایک پولیس آفیسر مجمع کو چیرتا ہوا ان کے
پاس آیا۔ "تم اسے اسی وقت گرفتار کر لو۔ یہ ہمارا پیچھا کر رہا
تھا۔" "آخر کیوں؟" پروفیسر نے کہا۔

آفیسر نے کانے بدمعاش سے دو چار سوالات کیے
لیکن وہ اس کے کسی بھی سوال کا تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔
اس کے تاثرات بھی ظاہر کر رہے تھے کہ اس کی نیت اچھی
نہیں تھی۔ آفیسر نے اسے حراست میں لے لیا اور وہ لوگ
وہاں سے چل دیے۔ مجمع ان کے پیچھے تھا۔ اس بدمعاش نے
اپنا نام گومیز بتایا تھا۔ آفیسر نے اسے لاک اپ میں بند
کر دیا۔

پروفیسر نے وہاں ایک ذمے دار آفیسر کو مختصر لفظوں
میں صورت حال سے آگاہ کیا اور اس سے مطالبہ کیا کہ جب
تک ڈیکن نہ کہے، اس بدمعاش کو رہا نہ کیا جائے۔ ڈیکن
کے نام میں جادوئی اثر تھا۔ پروفیسر نے پولیس اسٹیشن سے
میکسیکو سٹی میں پولیس چیف ڈیکن سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا
اور اسے یہ واقعہ سنایا۔ ڈیکن نے وعدہ کیا کہ وہ اس معاملے پر
توجہ دے گا۔

"میں آپ دونوں سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ
گرینالاڈا میں رہیں۔ میں ولیمز ٹن کو آپ کے پاس بھیج
رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" پروفیسر نے
جواب دیا۔ "ہم سانتا ایمریا جا رہے ہیں اور کل گرینا ڈیلا
لوٹیں گے۔"

"سنیور آپ وہاں نہ جائیں تو بہتر ہے۔" چیف
ڈیکن نے تشویش سے کہا۔

لیکن پروفیسر نے اس کی نہیں سنی اور ریسیور مقامی
پولیس آفیسر کی طرف بڑھا دیا۔ وہ پولیس آفیسر کچھ دیر تک
ڈیکن سے باتیں کرتا رہا اور پھر اس نے ان دونوں کو جانے
کی اجازت دے دی۔

☆☆☆

ٹرین کی روانگی میں ابھی بہت وقت تھا اور چونکہ
دونوں نہ صرف اس واقعے سے بدمزہ ہو گئے تھے بلکہ انہیں
پیاس بھی لگ رہی تھی۔ لہٰذا وہ امریکن ہوٹل لوٹ گئے۔
دوپہر کا وقت تھا اور شدید گرمی تھی۔ ہوٹل کے لاؤنج میں چند
مقامی اور غیر مقامی نظر آ رہے تھے۔ ایک امریکی اور چند
مقامی باشندوں میں بحث ہو رہی تھی۔ بحث کا موضوع
مائیکل بازا تھا۔ وہ امریکی بہت پرجوش نظر آ رہا تھا اور پولیس
کو تنقید کا نشانہ بنا رہا تھا۔

"یہ اتنے نااہل ہیں کہ محض ایک مسلح شخص کو گرفتار نہیں
کر سکتے۔" وہ بولا۔

"لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں۔" اس کے سامنے بیٹھے
ہوئے میکسیکن نے کہا۔ "نہایت خبیث شخص ہے۔ وہ آپ کا
گلا کاٹتا جاتا ہے ساتھ ہی معذرت کرتا جاتا ہے۔"

"اور تم اسے اپنا گلا کاٹنے دیتے ہو۔" امریکی چیخا۔
"مجھے دس آدمی دو، اپنی پولیس یا فوج کے دس آدمی......
نہیں، صرف دس آدمی دو، میں اسے رسیوں سے باندھ کر
لے آؤں گا۔ پھر تم اسے پھانسی پر لٹکا دینا۔"

"سنیور بہت بہادر ہیں۔" میکسیکن نے اپنے
ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا اور مسکرا دیا۔

"پولیس۔" امریکن نفرت سے پھنکارا۔ "ہمارے
صرف دو فوجی پورے ملک کا صفایا کر سکتے ہیں۔"

"اگر وہ زندہ بچ گئے تو۔ سنیور، بازا کے معاملے میں
سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ اس کا صفایا کرتے کرتے آپ
کا صفایا بھی ہو سکتا ہے۔"

امریکن نے پروفیسر اور میجر کی طرف یوں دیکھا گویا
ان کی حمایت مطلوب ہو لیکن انہوں نے اس بحث میں حصہ
لینے سے معذرت کر لی۔ ٹرین کی آمد کا وقت ہو چکا تھا، لہٰذا
وہ ہوٹل سے اپنا سامان لے کر ریلوے اسٹیشن کو چل دیے۔

☆☆☆

سانتا ایمریا پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ وہ اتنے تھکے
ہوئے تھے کہ کھانا کھا کر سو گئے۔ اگلی صبح وہ سرائے کے مالک
کی طرف سے فراہم کردہ گھوڑوں پر سوار ہو کر کھنڈرات کی
طرف روانہ ہو گئے۔ پروفیسر نے کسی گائیڈ کی خدمات
حاصل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ دونوں دوست خاموشی
سے سفر کرنے لگے۔ گھوڑے تربیت یافتہ تھے۔ ناہموار
راستوں اور نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے، جب وہ ایک

urdunovels.com

پہاڑوں کا چکر کاٹ کر دوسری طرف سوار ہوئے تو پروفیسر نے تنگ وادی کی طرف اشارہ کیا جو یہاں پتھروں کا ایک بہت بڑا ڈھیر تھا۔ صنوبری پہاڑیاں، کیکٹس سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ گھوڑوں کو نشیب میں جانے کا راستہ مل گیا اور وہ نشیب کا سفر کرنے لگے۔ سورج آگ برسا رہا تھا۔ وہ دونوں وادی میں پہنچ کر گھوڑوں سے اتر گئے اور پروفیسر کھنڈرات کے درمیان آگے بڑھتا ہوا، میجر کی رہنمائی کرنے لگا اور پھر وہ اس جگہ رک گیا جہاں اسے وہ کھوپڑی ملی تھی۔ اس نے ایک انگلی سے کنویں کی طرف اشارہ کیا جو شکستہ اینٹوں سے بھرا ہوا تھا۔

میجر ڈیوس، ایک لکڑی کی مدد سے آس پاس کی جگہ کریدنے لگا گویا اسے کچھ ملنے کی امید ہو۔ پروفیسر، قلعہ کی شرقی دیوار پر چڑھ گیا اور اپنی دوربین آنکھوں سے لگا کر اس طرف کی پہاڑی سلسلے کا جائزہ لینے لگا۔ پہاڑیوں میں جگہ جگہ درے تھے اور گھاٹیاں تھیں۔ پروفیسر کو یہ منظر بہت دلچسپ لگا اور گنگنانے لگا۔ چند لمحوں کے بعد ڈیوس بھی اس کے پاس پہنچ گیا۔ اسے بھی پہاڑیوں کا وہ سلسلہ بہت بھلا لگا۔ پھر اس نے پہاڑی راستے پر نگاہ ڈالی۔ وہاں دھول اڑتی نظر آرہی تھی۔ اس نے پروفیسر کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تو وہ اپنی دوربین اس طرف گھما کر دیکھنے لگا۔

"یہ وہی پرجوش امریکی سیاح ہے۔" وہ بولا۔

"چلو، ہم نیچے چل کر اس سے ملتے ہیں۔ ویسے بھی ہم خود کو اس سے چھپا نہیں سکتے۔" میجر نے کہا۔

وہ نیچے اتر کر قلعے کی بیرونی دیوار کے باہر آگئے۔ وہ امریکی، ایک گائیڈ کی معیت میں ان کے قریب آگیا اور اس نے فوراً انہیں پہچان لیا۔ اس کے گول چہرے پر بچوں کی سی مسکراہٹ آگئی۔ "اچھا، اچھا، یہ تم لوگ ہو۔" وہ بلند آواز میں مخاطب ہوا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم لوگ بھی ادھر آرہے ہو تو میں تمہیں اپنے ساتھ لے آتا۔"

پروفیسر مسکرانے لگا۔ "غالباً ابھی تک بازا سے تمہاری مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔"

"بازا۔" امریکی نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور گھوڑے کی پیٹھ پر سے پھسل کر اتر گیا۔ وہ بھاری بھرکم اور قد آور شخص تھا۔ "مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ مکار کبھی بھی دن کی روشنی میں خود کو ظاہر نہیں کرتا۔"

اس کا گائیڈ بھی اپنے گھوڑے سے اتر پڑا اور اس نے اس امریکی کے گھوڑے کی لگام تھام لی۔ امریکی بانہیں پھیلائے ان کی طرف بڑھا۔ "میرے گائیڈ نے مجھے بتایا تھا کہ یہاں مجھے کوئی پروفیسر مل جائے گا۔" اس نے کہا اور ایک بار پھر ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ "میرے خیال میں، تم ہی وہ پروفیسر ہو۔" اس نے پروفیسر کو مخاطب کیا۔ "میں اصلی کھنڈرات دیکھنے کے لیے دوسرے مقامات پر گیا تھا۔ یہ کھنڈرات تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ شاید تم ان کھنڈرات کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو۔ ہے نا؟"

"مجھے افسوس ہے، میں زیادہ نہیں جانتا۔" پروفیسر نے جواب دیا۔

"کیا واقعی؟" امریکی بولا۔ "پھر اس کھوپڑی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

فرط حیرت سے پروفیسر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ میجر ڈیوس کو بھی گویا سکتہ لگ گیا۔ پھر اس نے ایک جھٹکے سے اپنی جیب سے ریوالور نکالنا چاہا لیکن اسے دیر ہوگئی۔ وہ موٹا امریکی ان دونوں پر ریوالور تان چکا تھا۔

"ہوں......" وہ چیخا۔

اس کے جواب میں جھاڑیوں اور کیکٹس کے پیچھے چھپے ہوئے، چھ سات مسلح میکسیکن اچھل کر سامنے آگئے۔ انہوں نے دو منٹ میں پروفیسر اور میجر کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے۔ ایک تنے ہوئے چہرے والے ڈاکو نے پہلے پروفیسر اور پھر میجر کی جیبوں کی تلاشی لی اور پھر میجر کا ریوالور اپنے قبضے میں کرلیا۔

"سینور، بس یہی کچھ ہے۔" وہ اس قیم شحیم امریکی سے بولا جس کا نام آل تھا۔

سینور آل، اپنے قیدیوں کی طرف مڑا جو ابھی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھے۔ "اچھا، بچو۔" وہ تمسخر سے بولا۔ "بازا بہت جلد تم سے ملاقات کرے گا۔"

ایک گھاٹی کے خفیہ مقام سے مزید گھوڑے لائے گئے۔ پروفیسر اور میجر کو دو گھوڑوں پر سوار کرا دیا گیا اور پھر گھڑ سواروں کا یہ جلوس سینور آل کی رہنمائی میں روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

وہ سانتا میریا کی مخالف سمت میں سفر کر رہے تھے۔ اونچے نیچے ناہموار راستوں پر یہ تکلیف دہ سفر دو گھنٹے تک جاری رہا۔ پھر وہ دم لینے کو رک گئے۔ ان

دونوں کو پانی پینے اور زمین پر آرام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کے بعد لیڈر، سنیورآل کے اشارے پر ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئیں اور انہیں دوبارہ گھوڑوں پر بٹھا دیا گیا۔ سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ میجر ذہنی، وقت کا سراغ کھو بیٹھا تھا۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہونے کی وجہ سے دن اور رات کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کہیں رکے بغیر مسلسل کئی دن تک سفر کرتے رہے ہوں۔ پھر ایک مقام پر وہ سب رک گئے اور ان دونوں کی آنکھوں پر سے پٹیاں کھول دی گئیں۔ پٹیاں کھلتے ہی انہوں نے خود کو ایک پیالہ نما مقام پر پایا۔ ان کے چاروں طرف پچاس ساٹھ فٹ بلند پہاڑ تھے اور اس جگہ کا حدود اربعہ تین سو گز سے زیادہ نہیں تھا اور کہیں کوئی راستہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ جہاں وہ کھڑے تھے، وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک غار تھا۔ اس غار میں سے کئی لوگ نکل کر مہمانوں کو دیکھنے کے لیے آئے اور پھر ان دونوں کو غار کے اندر لے جایا گیا۔ ان پر ایک محافظ متعین کر دیا گیا اور انہیں انتظار کرنے کے لیے کہا گیا۔

☆☆☆

اس انتظار میں پورا دن گزر گیا۔ رات کو انہیں پانی اور صاف تولیے فراہم کیے گئے۔ ان کی بندش کھول دی گئیں اور انہیں ہاتھ منہ دھونے کے لیے کہا گیا۔ معلوم ہوتا تھا، وہ مانگیل بازا کے دسترخوان پر اس کے ساتھ ڈنر میں شریک ہونے والے تھے۔ بازا، ایک چھوٹے کمرے میں ان کا منتظر تھا جہاں ایک میز پر چاندی کے ظروف سجے ہوئے تھے۔ بازا، اپنی وضع قطع سے کوئی مہذب جاگیردار لگ رہا تھا۔ اس کے جسم پر عمدہ تراش کا کوٹ اور گھڑسواری کی مخصوص چست پتلون تھی۔ پیروں میں چمڑے کے جوتے تھے جن پر پالش کی گئی تھی۔ بظاہر وہ بہت نفیس نظر آرہا تھا۔ پروفیسر اور میجر کی نگاہیں اس کے چہرے پر ٹک گئیں۔ وہ تانبے کی رنگت کا ایک خوبرو شخص تھا۔ وہ کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ جینٹلمین کی سی شائستگی سے سامنے کی طرف جھک گیا اور مخاطب ہوا۔

"معزز حضرات، مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ کو ایک بہت ہی کٹھن سفر کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ آپ مجھے اس کی تلافی کی اجازت دیں۔ اگر آپ میرے ساتھ ڈنر میں شریک ہوں گے تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔"

میجر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ صدائے احتجاج بلند کرتا، پروفیسر نے اشارے سے منع کر دیا۔ اس ڈاکو کے ان تمسخرانہ جملوں کو فی الحال برداشت کیا جا سکتا تھا کیونکہ وہ اس کے اسیر تھے۔ ویسے بھی، پروفیسر کو بہت بھوک لگ رہی تھی۔ اگر میجر اس ڈاکو سے الجھنے کی کوشش کرتا تو وہ فاقے سے مر جاتے۔ گرما گرم اور لذیذ چیٹ سے میکسیکن کھانے کی بڑی اشتہا انگیز بو آرہی تھی۔ پروفیسر نے میجر کے پہلو میں کہنی ماری۔

"آپ کی اس عزت افزائی کے لیے آپ کے مشکور ہیں۔" اس نے ڈاکو سے کہا اور وہ تینوں کھانے بیٹھ گئے۔ کھانا بلاشبہ نہایت لذیذ تھا۔ میجر کی بھوک بھی خوب چمک اٹھی تھی۔

تینوں نے خاموشی سے کھانا ختم کیا۔ اس کے بعد کافی پیش کی گئی اور بازا ان سے باتیں کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے اپنے اس آدمی کو جو کھانا سرو کر رہا تھا، کھوپڑی لانے کا اشارہ کیا اور وہ شخص کھوپڑی لے کر آ گیا جو میجر کی قیام گاہ سے چرائی گئی تھی۔

"معزز حضرات۔" بازا، ان سے مخاطب ہوا۔ "آپ یقیناً یہ جاننے کے خواہش مند ہوں گے کہ آپ کو یہاں کیوں لایا گیا ہے؟" تو یہ ہے اس کا سبب...... یہ کھوپڑی جس سے آپ دونوں ہی مانوس ہیں۔ اس کھوپڑی پر کچھ نقشے بنے ہوئے ہیں، جنہیں میں سمجھنا چاہتا ہوں۔ آپ کی حالیہ سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ یقین ہو چلا ہے کہ آپ اس معمے کو حل کر سکتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ آپ اسے حل کر چکے ہیں، لہٰذا آپ کو اس لیے یہاں لایا گیا ہے کہ آپ مجھے اس معمے کا حل بتا دیں۔"

"بازا، مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اس سلسلے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔" پروفیسر نے جواب دیا۔

"میں یہ یقین نہیں کر سکتا۔" بازا نے کہا۔ "میں آپ کو آرام پہنچانے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔ ہم سیدھے سادے پہاڑی ہیں۔ سادگی ہمارا شعار ہے۔ ہم اپنے بہت سے مسائل اکھڑپن سے حل کرتے ہیں۔ تاوان یا موت۔ میرے آدمیوں نے یہ متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ اگر آپ ہمیں اس معمے کا حل بتا دیں تو ہم اسی حل کو تاوان کی صورت میں قبول کر لیں گے۔ یہ لوگ آپ کو صبح تک کی مہلت دینے پر تیار ہیں۔ یہ ان لوگوں کی دلچسپ

روایت ہے اور ان کا لیڈر ہونے کی حیثیت سے میں ان کی روایت کا امین ہوں۔ آپ لوگوں کو صحیح سلامت سانتا بربرا پہنچانا میری خواہش ہے اور مجھے اُمید ہے کہ آپ ہماری اس تک پہنچنے میں رخنہ نہیں ڈالیں گے۔"

"تم ہم سے تاوان وصول نہیں کر سکتے۔" میجر غرایا۔ "ہمارے پاس تاوان ادا کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔"

"آپ رہنے بھی دو میجر۔ تم ایک انجینئر ہو۔ اس کھوپڑی پر بنے ہوئے مثلث کا کیا مطلب ہے؟"

"مجھے کیا معلوم۔"

"تمہیں معلوم نہیں ہے پھر بھی تم میکسیکو سٹی میں اس کھوپڑی کا معائنہ کرتے ہی بھاگے بھاگے وہاں پہنچ گئے جہاں سے یہ ملی تھی۔ سنیور پروفیسر، آپ اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں؟"

"یہی کہ اس بارے میں تمہیں ہم سے زیادہ معلوم ہے۔" پروفیسر نے جواب دیا۔ "ورنہ تم اس کھوپڑی کے لیے اتنے پریشان کیوں تھے؟ ہمارے گھر میں ایک آدمی کا قتل کیوں کر دیا گیا؟ اس نے مرتے وقت اپنے خون سے تمہارا نام کیوں لکھا؟"

"میرا نام؟" بازا حیرت زدہ رہ گیا۔ پھر اس کی چمک میں اضافہ ہو گیا۔ "اچھا، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جولس کو مرتے وقت میرا خیال آیا تھا؟ یہی اصل تعریف ہے۔ میں بہت متاثر ہوا۔ بہر کیف، میں آپ کو اس معمے کے ساتھ چھوڑتا ہوں۔ آپ کے پاس صبح تک کی مہلت ہے۔"

لگتا تھا، اسے یقین تھا کہ انہوں نے وہ معما حل کر لیا تھا اور ساتھ ہی اسے اپنی اذیت رسانی پر یقین تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ موت کی دھمکی کارگر ثابت ہوگی اور دونوں اسے اس معمے کا حل بتا دیں گے لیکن سوال یہ تھا کہ اگر وہ لوگ اسے اس معمے کا حل بتا بھی دیتے تو کیا وہ انہیں رہا کر دیتا؟ پروفیسر کو اس میں شک تھا۔

☆☆☆

انہیں صبح تک کے لیے واپس وہیں لے جایا گیا جہاں وہ قید تھے اور ان کی مشکیں کس دی گئیں۔ غار کے دہانے پر ایک لالٹین لٹکا دی گئی اور مسلح پہرے دار متعین کر دیا گیا۔ وہ اپنی رائفل رانوں پر رکھ کر آرام سے وہاں بیٹھ گیا۔ میجر نے اس نئی صورت حال پر غور کیا۔ پروفیسر نے بہت احتیاط سے کھوپڑی کا جائزہ لیا تھا اور ایسے میں میجر کو اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی نظر آئی تھی۔ اب وہ ان نیم تاریک غار میں آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا، پروفیسر کے پاس پہنچ گیا۔

"کیا اس کھوپڑی کا نقشہ کچھ سمجھ میں آیا؟" اس نے سرگوشیوں میں پوچھا۔

پروفیسر نے ایک جھٹکے سے اس کی طرف کروٹ لی۔ "وہ آڑی ترچھی لکیریں ان پہاڑیوں کی نشاندہی کرتی ہیں جنہیں ہم آج دوربین سے دیکھ رہے تھے۔"

اس نے بھی سرگوشیوں میں جواب دیا۔ "پہلے مجھے اس کے بارے میں اتنا یقین نہیں تھا لیکن جب بازا نے مجھے وہ کھوپڑی معائنہ کرنے کے لیے دی تو مجھے اس کا یقین ہو گیا۔"

گویا وہ راز اس وادی میں پوشیدہ تھا جہاں سے انہیں اغوا کیا گیا تھا۔ اتنا اندازہ تو خود بازا نے بھی لگایا ہوگا لیکن اب یہ حقیقت طے ہو جانے کے بعد وہ بازا سے سودا کر سکتے تھے۔ پروفیسر کا بھی یہی خیال تھا۔ انہیں مہلت چاہیے تھی اور یہ بے حد اہم تھی۔ جب ڈیکن کو ان کی گمشدگی کی اطلاع ملتی تو وہ یقیناً کچھ کرتا۔ اس شخص گومیز کے پاس اہم معلومات ہوں گی اور اس بات کا امکان تھا کہ ویلنٹن یا ڈیکن ان کا سراغ لگاتے ہوئے بازا کے گڑھ تک پہنچ جائیں۔

پروفیسر نے اپنے خیالات میجر کو منتقل کرنے کے لیے اپنی جگہ سے حرکت کی ہی تھی کہ اس نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا کہ میجر نے اپنے ہاتھوں کو آزاد کر دیا تھا۔ پہرے دار غار کی داخلی گزرگاہ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میجر نے آہستگی سے پروفیسر کی بندشیں بھی کھول دیں اور وہ دونوں دبے پاؤں پہرے دار کی طرف بڑھنے لگے۔ قریب پہنچ کر میجر نے اچانک اچھل کر اسے دبوچ لیا اور اپنا ایک ہاتھ سختی سے اس کے منہ پر جما دیا۔ پروفیسر نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر انہی رسیوں سے اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے جن سے وہ خود تھوڑی دیر پہلے بندھے ہوئے تھے۔ پھر میجر نے اس کے منہ میں اپنا رومال ٹھونس دیا۔

"اب کیا کریں؟" پروفیسر نے پوچھا۔

میجر ڈیوس، ڈاکو کی رائفل اپنے قبضے میں لے چکا تھا اور گولیوں کے لیے اس کی جیبیں ٹٹول رہا تھا۔ "اب ہم فرار ہونے کی کوشش کریں گے۔" میجر نے جواب دیا۔ "سارے ڈاکو خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہوں گے۔ ہمیں باہر نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ مل ہی جائے گا۔"

اچانک پروفیسر کے منہ سے گھبراہٹ میں نکلا۔ "یہ

"کیا؟" اس کا جملہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ غار کی بھاری فضا گولیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی ہر طرف سے بلند ہونے والی چیخ و پکار کی آوازوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ نیم تاریک غار میں زبردست کھلبلی مچ گئی۔ انسانی سائے گر رہے تھے اور ایک دوسرے پر گرتے پڑتے ہوئے، جدھر جس کا سینگ سما رہا تھا بھاگ رہے تھے۔ گولیوں کی گڑگڑاہٹ اور ان کی کراہوں سے فضا گونج رہی تھی۔

"پولیس یا ڈیکن ہوگا۔" پروفیسر نے خیال آرائی کی۔

اور حقیقت میں وہ دونوں ہی تھے۔ ان کے ہمراہ پولیس کی بہت بھاری نفری تھی اور گومیز بھی تھا جس نے اپنے سابق سربراہ سے بغاوت کر دی تھی۔ اس نے ڈاکوؤں کے گروہ تک پولیس کی رہنمائی کی تھی۔ پولیس اور ڈاکوؤں کے درمیان زبردست جھڑپ ہوئی۔ جس کے بعد پولیس نے باقی ماندہ ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیا۔ پولیس چیف ڈیکن نے پروفیسر اور میجر کو غار میں اس جگہ موجود پایا جہاں وہ اپنے تحفظ کے لیے الٹے قدموں واپس جا کر بیٹھ گئے تھے۔

☆☆☆

صبح نمودار ہوتے ہوتے پروفیسر اور میجر ایک بار پھر اسی وادی میں پہنچ چکے تھے۔ ڈیکن اور ولیمسن ان کے ہمراہ تھے۔ کانا گومیز بھی پولیس کی حراست میں ان کے ساتھ تھا۔ وہ کھوپڑی ڈیکن کے ہاتھ میں تھی۔ "اب بتاؤ، اس کھوپڑی کا راز کیا ہے؟" اس نے کانے گومیز سے پوچھا۔

"سنیور، میں نے آپ لوگوں کے ساتھ بہت تعاون کیا ہے اور اس کے صلے میں آزادی حاصل کی ہے۔ باقی آپ جانیں اور آپ کا کام جانے۔"

"لیکن تم یہ تو جانتے ہو گے کہ اس مثلث کا کیا مطلب ہے؟" ڈیکن نے کھوپڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے یہ کھوپڑی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ پھر جب یہ میری دسترس میں آئی تھی تو بازا حملہ آور ہو گیا۔ اس کے آدمی نے اس سنکی سے آدمی کے گھر میں جولس کو قتل کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے بازا تک آپ لوگوں کی رہنمائی کی۔"

میجر نے ڈیکن کے بازو کو چھوا۔ "ہم اس شخص سے کچھ بھی نہیں اگلوا سکتے۔" وہ غرایا۔ "بہتر ہے کہ اس سلسلے میں پروفیسر سے رجوع کرو۔ اگر یہ آڑی ترچھی لکیریں ان پہاڑوں کی نشاندہی کرتی ہیں تو مثلث کے بنیادی اضلاع وادی کی سنگلاخ گھاٹی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ہم اس کے بنیادی اضلاع کی پیمائش کر کے اس کی چوٹی کا پتا چلا سکتے ہیں۔ ہم اس کا آغاز کھنڈرات سے کریں گے۔ یہ کھنڈرات ہی اصل میں اس مستطیل کی نشاندہی کرتے ہیں۔"

وہ اپنے قدموں کو گنتا ہوا، وادی میں آگے بڑھنے لگا۔ سب لوگ اس کے پیچھے چلنے لگے۔ جب وہ گھاٹی کو عبور کر کے مخالف سمت میں ایک مقام تک پہنچا تو اس نے اندازہ لگایا کہ اس مثلث کے بنیادی اضلاع نو سو قدم تھے۔ باقی کی پیمائش آسان تھی۔ اب اس نے اپنی جیب سے ایک قطب نما نکالا اور اس کی مدد سے مثلث کی راس کی طرف بڑھنے لگا۔ کبھی کبھی وہ رک کر تیر کے نشان اور نقشے کی اصل شکل کو دیکھنے لگتا جس پر اسے کیلکس کا گمان ہوا تھا۔ کچھ دور آگے جانے پر اسے ایک بہت بڑا کیلکس نظر آیا۔ اس نے ایک بار پھر تیر کے نشان سے رجوع کیا اور اسی سمت میں آگے بڑھنے لگا۔

اب وہ لوگ بلندی پر پہنچ گئے تھے۔ ان کے خیال میں وہاں کوئی غار ضرور ہونا چاہیے تھا۔

اس موقع پر کانے کی آنکھ میں غیظ غضب سے چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں اور جب اسے آگے دھکیلا گیا تو وہ منہ ہی منہ میں گالیاں بکنے لگا۔ اس کا اضطراب قابل دید تھا۔ وہ لوگ جلد ہی غار تک پہنچ گئے۔ غار کے اندر گھپ اندھیرا تھا لیکن ماچس کی چند تیلیاں اس کے راز کو اجاگر کرنے کے لیے کافی ثابت ہوئیں۔ فرش پر ایک کے اوپر ایک لکڑی کے بڑے بڑے بکس رکھے ہوئے تھے جن پر لوہے کی پتریاں چڑھی ہوئی تھیں اور ان پر گورنمنٹ کی مہریں بھی تھیں۔ پروفیسر نے ایک بکس کو اس کی جگہ سے کھسکانے کی کوشش کی لیکن وہ بے حد وزنی تھا۔

"خدا کی پناہ۔" بے اختیار ڈیکن کے منہ سے نکلا۔ "یہ تو نارتھ ویسٹرن کمپنی کی ٹرین سے لوٹی ہوئی چاندی کی پٹیاں ہیں۔ یہ پٹیاں بازا نے لوٹی تھیں۔ انہی پٹیوں کی وجہ سے ان میں پھوٹ پڑ گئی تھی اور وہ ایک دوسرے کو ہلاک کرنے لگے تھے۔"

urdunovelist.com

سفرِ مرگ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

جہاز تباہ ہوا تو وہ سب لائف بوٹ میں آگئے۔ ایک معمولی سا بوٹ اور اس میں سوار مختلف قومیتوں کے حامل افراد جن کے تعاقب میں موت تھی جو ان سب پر گزری وہ دل دہلا دینے کو کافی ہے۔

موت و زندگی کے درمیان جھولتے افراد کا قصہ

نو ہزار ٹن وزنی مسافر بردار جہاز برطانیہ مارچ 41ء کے پہلے ہفتے میں لور پول کی بندرگاہ سے چل کر بحر اوقیانوس میں داخل ہوا تو نئے دن کا سورج پوری آب و تاب اور تمام رعنائیوں کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا۔

برطانوی بحریہ کے جنگی جہازوں کا ایک دستہ جو برطانیہ کو اپنی حفاظت میں لے کر بحر اوقیانوس تک آیا تھا، آدھی رات کے وقت واپس اپنے وطن کو جا چکا تھا اور اب یہ عظیم مسافر بردار جہاز سمندر کے پُرسکون پانی میں ہلکے ہلکے جھٹکے کھاتا، پوری رفتار سے اپنی آخری منزل بمبئی کی جانب رواں دواں تھا۔

اکثر مسافر عرشے پر کھڑے طلوع ہوتے سورج کا نظارہ کر رہے تھے اور بہت سے اپنے اپنے کیبنوں کے اندر بستروں میں دبکے خواب خرگوش کا مزہ لے رہے تھے کہ یکایک جہاز پر لگے ہوئے سائرن بھیانک آواز میں چلّانے لگے۔

جنگ کے دور میں سائرنوں کی چیخ و پکار کچھ ایسی خلاف معمول اور باعث تشویش بات نہ تھی، اس لیے مسافروں نے خطرے کے اس اعلان پر توجہ نہ دی اور سونے والے بہت سے مسافروں نے جن کی آنکھ سائرنوں کی مکروہ آواز سے کھل گئی تھی، دل ہی دل میں عملے کو برا بھلا کہا اور کروٹ بدل کر دوبارہ نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

جہاز کے اوّل درجے میں ڈیڑھ سو مسافر سفر کر رہے تھے، جن میں سے بیشتر سرکاری اہلکار تھے اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں متعین برطانوی بحریہ اور بری افواج کے یونٹوں میں اپنی اپنی ڈیوٹی پر جا رہے تھے۔

تیسرے درجے میں مسافروں کی زیادہ تعداد ہندوستان کے باشندوں پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ انگلستان میں کئی کئی برس ملازمت کرنے اور خاصی دولت جمع کر لینے کے بعد اپنے وطن لوٹ رہے تھے۔

ہندوستانی مسافر تقریباً سب کے سب سکھ تھے۔ لمبی اور گھنی داڑھیاں اور کرخت لب و لہجہ رکھنے والے سکھ جن کی ہر ادا نرالی تھی اور جہاز کے دوسرے مسافروں کے لیے مضحکہ خیز اور دلچسپ بھی۔

سفر کے دوران میں وہ ہارمونیم اور طبلے پر ہر رات دیر تک اپنی بھدی اور پھٹے بانس سے نکلنے والی آوازوں میں نہ جانے کیا کیا گاتے رہتے۔ شرابیں پی کر ایک دوسرے کو فحش انداز میں گالیاں دیتے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے۔ یہ روز کا قصہ تھا۔

ابتدا میں برطانیہ کے عملے نے سکھوں کو سمجھانے اور ان کی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کی لیکن انہوں نے ایک نہ سنی، بلکہ دنگے فساد اور دھینگا مشتی کی مشقوں میں اضافہ کر دیا۔

تنگ آ کر عملے نے ان سے باز پرس کرنا چھوڑ دی کہ کون ان اجڈ لوگوں کے منہ لگے۔ البتہ دن کے وقت یہ سکھ نہایت شرافت و متانت سے رہتے اور ان سے کوئی بدتمیزی سرزد نہ ہوتی۔ انہیں جب بھی موقع ملتا، درجہ اوّل کے مسافروں کے ہاتھ گھٹیا ریشم اور ہندوستان کی گھریلو دستکاریوں کے نمونے فروخت کرنے کی کوشش کرتے اور کسی نہ کسی گاہک کو پھانس کر اچھی خاصی رقم اینٹھ لینے میں کامیاب ہو جاتے۔

رام سنگھ نامی ایک بڈھا اور گرگ باراں دیدہ سکھ اپنی جماعت کا سرغنہ تھا اور ہر شخص اس کی بات ماننے میں کسی لیت و لعل سے کام نہ لیتا۔ انگریزوں کو بے وقوف بنانے میں رام سنگھ کا کوئی ثانی نہ تھا۔

رام سنگھ نے اپنے آپ کو کالے علم کا ماہر اور خاندانی جوتشی مشہور کر رکھا تھا۔ روزانہ نقد رقمیں لے لے کر مسافروں کا ہاتھ دیکھتا اور الٹی سیدھی باتیں بتا کر انہیں حیران کر دیتا تھا۔

رام سنگھ کا دعویٰ تھا کہ برطانیہ کسی حادثے کے بغیر اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائے گا، کیونکہ اس نے آنے والی مصیبتوں کا پہلے ہی سے "اُپائے" کر لیا ہے۔ سمندر میں سفر کرنے والے اتحادی جہازوں سے جرمنوں کا جو سلوک تھا اور انہوں نے اب تک جتنے اتحادی جہاز تباہ کیے تھے، ان کی تعداد پیش نظر رکھتے ہوئے بہت سے مسافروں کو برطانیہ کے بخیر و عافیت بمبئی پہنچ جانے میں شبہ تھا لیکن جب جہاز بحر اوقیانوس میں داخل ہو گیا اور اسے راستے میں ذرہ برابر گزند نہ پہنچی تو سبھی رام سنگھ کے کالے علم پر ایمان لے آئے، حتیٰ کہ کپتان بھی جو سخت مزاج اور روشن خیال آدمی تھا، اس ہندوستانی بڈھے جادوگر کے کمالات کا قائل ہو گیا۔

غالباً یہی وجہ تھی کہ 2 مارچ 1941ء کو صبح سات بجے جب خطرے کے سائرن چیخ رہے تھے تو کسی مسافر نے ان کی آواز پر کان نہ دھرا اور بے پروائی سے اپنے اپنے معمولات میں مشغول رہے۔ ابھی سائرن خاموش بھی نہیں ہوئے تھے کہ جرمن بمبار طیارے نہایت ہولناک انداز میں گرجتے اور نیچی پرواز کرتے ہوئے برطانیہ کے اوپر سے گزر گئے۔

اس کے بعد جرمن طیاروں نے ایک مختصر سا چکر لگایا، دوبارہ جہاز کی طرف جھپٹے اور بم پھینک دیے۔ پہلے چند بم جہاز پر گرنے کے بجائے سمندر میں گرے تھے، لیکن ان کے دھماکوں نے نہ صرف جہاز کا سارا سکون درہم برہم کر دیا بلکہ مسافروں پر بھی خوف و ہراس طاری ہو گیا اور ہر طرف افراتفری کے آثار نمودار ہونے لگے۔

جہاز پر ایک ہی بم گرا۔ میں اس وقت اپنے کیبن میں تھا۔ دھماکا ہوتے ہی جہاز خشک پتے کی مانند لرزنے لگا اور

نکل کر اپنے مرکز کی طرف دوڑا۔ میں ان
ہی حفاظتی کشتیوں کے مرکز نمبر سات کا انچارج تھا
جو جہاز کے جس حصے میں واقع تھا اس کا چارج تھرڈ
آفیسر ولیم کے پاس تھا۔
مجھے یقین تھا کہ اس ہنگامی حالت سے نمٹنے کے لیے
اس نے فوری طور پر عمل شروع کر دیا ہوگا لیکن جب میں
اپنے مرکز پہنچا تو لاشوں اور زخموں سے چور سسکتے، کراہتے اور
چیختے ہوئے آدمیوں کو دیکھ کر میرا دل بیٹھنے لگا۔
خدا کی پناہ، عجب قیامت خیز منظر تھا۔ کسی کو کسی کا ہوش
نہ تھا اور ہر شخص صرف اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا دوڑا
پھر رہا تھا۔
عرشے پر مرنے والوں کی لاشوں اور خون میں لت
پت زخمیوں کے علاوہ کٹے ہوئے انسانی اعضا یوں
بکھرے پڑے تھے جیسے کسی بڑے مذبح خانے میں
جانوروں کے دھڑ، گردنیں اور ٹانگیں علیحدہ علیحدہ ڈھیر کر دی
جاتی ہیں۔
حفاظتی کشتیوں کے مرکز نمبر سات میں میرے علاوہ
ایک سات افسر اور جہاز کے دو اہلکار موجود تھے لیکن
قیامت کے اس عالم میں ہم کر ہی کیا سکتے تھے۔ حواس گم،
عقل حیران اور اعصاب شل۔ چند لمحوں بعد ہم حرکت میں
آئے اور زخمیوں کو محفوظ جگہ لے جانے اور گھبرائے ہوئے
ہندوستانی ملاحوں اور حواس باختہ سکھوں کو ایک جگہ کھڑے
رہنے کی تلقین کرنے لگے۔ مگر ہماری آوازیں اور ڈانٹ
ڈپٹ بے اثر ثابت ہو رہی تھیں۔
سکھوں کی حالت سب سے زیادہ قابل رحم تھی۔ عام
حالت میں وہ جس قدر مضبوط، بہادر اور باہمت نظر آیا
کرتے تھے اس کڑے وقت میں اتنے ہی کمزور اور کم حوصلہ
تھے۔ انہوں نے یورپی اور ہندوستانی لباسوں کی آمیزش
سے عجیب و غریب قسم کے کپڑے پہن رکھے تھے۔
لندن سے خریدے ہوئے سوٹ، پگڑیوں کی مدد
سے ... پر لگا رکھے تھے اور تجارتی اشیا سے بھرے ہوئے
بڑے سوٹ کیس اور نہ جانے کن کن چیزوں سے
بھرے ہوئے تھیلے ان کی بغلوں میں دبے ہوئے تھے۔ سالہا
سال کی محنت سے کمائی ہوئی دولت انہیں بڑی عزیز تھی، جسے
انہوں نے بے ڈھنگے طور پر مگر کمال ہوشیاری سے اپنے لباس
کے مختلف حصوں میں محفوظ کر لیا تھا۔
جہاز کے چاروں طرف دھوئیں کی اتنی دبیز چادر تن گئی
کہ دشمن کے لیے اب صحیح نشانہ لینا بھی ممکن نہ تھا۔ چنانچہ
ہمارے کپتان نے اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے
بھاگ نکلنے کی کوشش کی اور جہاز کے انجن پوری رفتار سے
چلا دیے۔ مگر جہاز بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی کی مانند تیزی
سے چکر کھا رہا تھا۔ آناً فاناً اس کا عقبی حصہ سمندر کی جانب جھکا
اور اگلا حصہ آسمان کی طرف اٹھ گیا۔ اب جہاز کے ڈوبنے
میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی۔ عین اسی وقت حفاظتی کشتی نمبر سات
سمندر میں اتارنے کا حکم ملا۔
کشتی میں اگرچہ پچاس مسافروں کے لیے گنجائش
رکھی گئی تھی تاہم اس کی ظاہری حالت کچھ زیادہ تسلی بخش نہ
تھی۔ میں نے یہ حکم ملتے ہی گھبرا کر تھرڈ آفیسر ولیم کی طرف
دیکھا اور حیران رہ گیا کہ وہ ان نازک حالات میں بھی جب
کہ ہر لحظہ موت ہم سے قریب ہو رہی تھی۔ نہایت پُرسکون
اور ہشاش بشاش تھا۔ خدا جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ گھبرانا یا
خوف زدہ ہونا جانتا ہی نہ تھا۔
ولیم اس وقت نہایت اطمینان سے ان سوراخوں کو بند
کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو پیندے میں موجود تھے۔ اس کی
دیکھا دیکھی میرے علاوہ اور کئی لوگ بھی اس کام میں جت
گئے اور جوں توں کر کے تمام سوراخ بند کرنے کے بعد
ملاحوں کی مدد سے کشتی سمندر میں اتار دی گئی۔
کشتی کا جہاز کے پانی میں اترنا تھا کہ ہر مسافر جائز
ناجائز طریقے سے اس میں کودنے کی جدوجہد کرنے لگا اور
یقیناً ہم آدمیوں کے اس بپھرے ہوئے سیلاب کو روکنے میں
ناکام ہو جاتے، اگر میکوش پستول نکال کر کھڑا نہ ہو جاتا۔ وہ
آسٹریلیا کا رہنے والا ایک نہایت خوب صورت، تنومند اور
لمبا تڑنگا جوان ملاح تھا اور اس موقعے پر اس کی دوراندیشی
اور حاضر دماغی دیکھ کر ہم اش اش کر اٹھے۔ وہ اپنا پستول اوپر
اٹھا کر چلایا۔
"خبردار...... اگر کوئی شخص بغیر اجازت آگے نہ بڑھے،
ورنہ بھیجا اڑا دوں گا۔ سب لوگ باری باری کشتی میں بیٹھیں
گے۔ اگر کسی نے خلاف ورزی کی تو اسے اٹھا کر سمندر میں
پھینک دیا جائے گا۔"
دھکم پیل کرتے ہوئے لوگ پرے پرے ہٹ گئے
اور میکوش کی طرف نفرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔
ہم نے جلدی جلدی رسوں کی بنی ہوئی سیڑھی کشتی تک لٹکائی
اور مسافروں کو باری باری کشتی میں اترنے کی اجازت دی
لیکن برا ہو دولت کے لالچ کا۔

urdusoftbooks.com

انہیں اپنی جان بچانے کے بجائے اس سامان اور دولت کی فکر زیادہ تھی جو وہ انگلستان سے ساتھ لا رہے تھے۔ انہوں نے بڑے بڑے سوٹ کیس، اٹیچی کیس، چھوٹی گٹھڑیاں اور تھیلیاں کشتی میں پھینکیں اور پھر خود بھی پکے ہوئے پھلوں کی مانند کشتی میں گرنے لگے۔

یہ طریقہ زیادہ مہلک اور خطرناک تھا۔ اس سے نہ صرف عورتوں، مریضوں اور زخمیوں کے جہاز پر رہ جانے کا خدشہ تھا بلکہ اور سامان کے بوجھ کی وجہ سے کشتی بھی غرق ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ہم تین چار آدمیوں نے مشورہ کیا اور اجازت کے بغیر بیچ کے سامان اور اسی طرح کودنے والے دو تین بے تکے آدمیوں کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا۔

اس ترکیب کا نتیجہ بہت اچھا نکلا اور میدان حشر کی سی افراتفری اور آپا دھاپی کسی حد تک کم ہو گئی۔ اب ہم نہایت منظم طریقے سے مسافروں کو کشتی پر اتارنے لگے۔ درجہ اول کے مسافروں میں بارہ نرسیں بھی شامل تھیں۔ ہم نے سب سے پہلے انہیں اور ان کے بعد درجہ بدرجہ بیمار، زخمی، بوڑھے اور کمزور مسافروں کو کشتی میں بٹھایا۔

دوسری، تیسری پھر چوتھی کشتی بھی اتار دی۔ مسافروں سے نمٹ کر ملاحوں نے آخر میں اپنے لیے کشتی اتاری، اسی میں سکھوں کو بھی بٹھا لیا۔

سب سے آخر میں سکھوں کے گروہ کو بھی اتار دیا لیکن ضرورت سے زیادہ افراد کے جمع ہو جانے کے سبب کشتی میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی تھی۔ اس کے علاوہ چند اور چھوٹی کشتیاں بھی سمندر میں اتاری جا چکی تھیں اور ان میں ضرورت سے زیادہ لوگ بھرے ہوئے تھے۔

بہرکیف، اپنی کشتی کی حالت دیکھ کر ہم نے کپتان کی اجازت کے بغیر اسے جہاز سے دور ہٹا لیا کیوں کہ چندے کے ایک دو سوراخ کھل چکے تھے اور ان میں پانی بھرنا شروع ہو گیا تھا۔ جہاز ڈوبتا تو بھنور پیدا ہوتا۔ جو کشتی کے لیے خطرناک ثابت ہوتا۔

چند منٹ بعد جہاز کا پچھلا حصہ تیزی سے آسمان کی طرف اٹھا اور آہستہ آہستہ سمندر کی اتھاہ گہرائی میں غائب ہو گیا۔ سطح آب پر پانی کے بڑے بڑے بھنور گردش کرنے لگے اور ان کے ارد گرد تباہ شدہ جہاز کی بہت سی چیزیں تیرتی نظر آنے لگیں۔

ہماری نظروں کے سامنے چار مختلف حفاظتی کشتیاں موجود تھیں اور ان سب میں گنجائش سے زیادہ مسافر لدے ہوئے تھے۔ بہت سے بدقسمت زخمی افراد جہاز کے ساتھ غرق ہو گئے اور اب ان کے رشتے دار یا دوست آنسو بہانے کے لیے باقی رہ گئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد جب ہم ایک کشتی کے نزدیک سے گزرے تو ہم نے دیکھا اس میں تیزی سے پانی بھر رہا ہے اور مسافر پانی میں گر کر کمر تک ڈوبے ہوئے بے چارگی کے عالم میں مدد کے لیے چلا رہے ہیں لیکن ہم ان کی کمزوری اور بے بسی کے لیے دعا کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

ابھی ہم اس بدنصیب کشتی سے ایک فرلانگ دور ہی نکلے ہوں گے کہ وہ ڈوب گئی اور مسافر چند لمحے تک پانی میں غوطے کھاتے رہے پھر ایک ایک کر کے غائب ہونے لگے اور ان کا وہ سامان تیرتا رہ گیا جسے کلیجے سے لگا کر اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ اس وقت ہمیں انسان کے فانی اور بے بس ہونے کا صحیح صحیح اندازہ ہوا۔

اس کشتی کا یہ دردناک انجام دیکھ کر ہماری کشتی کے لوگوں پر ازحد سراسیمگی اور ہیبت طاری ہو گئی تھی۔ ہر شخص اپنے اپنے مذہب اور زبان کی مدد سے اونچی آواز میں دعائیں مانگ رہا تھا۔ سکھ تمام خرمستیاں اور دھما چوکڑی بھول کر اپنے مذہبی گیت اور شبد پرسوز آوازوں میں گا رہے تھے۔

تبھی میری نظر اپنی کشتی کے اس حصے پر پڑی جہاں پانی جمع ہو رہا تھا۔ یہ پانی کسی سوراخ سے نہیں آ رہا تھا۔ ادھر کا حصہ وزن کی وجہ سے زیادہ جھک گیا تھا اس لیے بڑی لہروں سے پانی اچھل اچھل کر اندر آ گیا تھا۔ میں نے چیخ کر کہا۔ فی الحال یہ گانا بجانا ملتوی کریں اور کشتی سے پانی نکالنے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ چنانچہ انہوں نے فوراً اس تدبیر پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ ہم نے چپو رکھ دیے اور اپنی ٹوپیوں اور ٹین کے ڈبوں کی مدد سے کشتی میں بھر رہا پانی نکالنے لگے۔

ایک گھنٹے کی جان توڑ کوشش کے بعد صورت حال قدرے بہتر ہوئی۔ یوں اب ہم سر جوڑ کر بیٹھے اور تھرڈ آفیسر ولیم کو اپنا کپتان منتخب کر لیا۔ باہمی مشورے سے کشتی کا نظم و نسق میرے سپرد کیا گیا اور لیفٹیننٹ اسٹیوارٹ کو چپو چلانے والے دستے کی نگرانی سونپی گئی۔

کشتی میں موجود سامان کا جائزہ لیا۔ ایک گھڑی اور ایک ناکارہ قطب نما ملا لیکن کوئی نقشہ ہاتھ نہ آیا۔ اس کام کے لیے ولیم اور اسٹیوارٹ کی ذہانت اور جہاز رانی کی

UrduNovels.com

ہمارے کام آئی۔ ان دونوں نے پنسل کی مدد سے سفید کاغذ پر ضرورت کے مطابق سیدھا سادہ نقشہ تیار کیا جس کے ذریعے اندازہ ہوا کہ جس جگہ ہمارا جہاز غرق ہوا، وہاں سے مشرق کی طرف افریقی ساحل چھ سو میل اور مغرب کی جانب برازیل کا ساحل بارہ سو میل دور ہے۔

چونکہ اب اس سفر کا دار و مدار ہوا کے مخالف یا موافق ہونے پر تھا اور سال کے اس حصے میں عموماً ہوا کا رخ بھی مشرق اور کبھی مغرب کی جانب رہتا ہے، اس لیے افریقہ کے بجائے برازیل کی طرف سفر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

تجربہ کار ملاحوں کے اندازے کے مطابق ہماری کشتی بارہ سو میل کا یہ طویل سفر کم از کم چوبیس دن میں طے کر سکتی تھی، لہٰذا راشن کا حساب لگایا گیا۔ اس کے مطابق بیاسی مسافروں کے لیے دودھ کا ایک ڈبا صبح اور ایک شام کو خرچ کیا جانا ضروری تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ ہر مسافر کے حصے میں ایک وقت تقریباً ایک چھوٹا چمچہ بھر دودھ آتا تھا۔

یہی حالت راشن میں ملنے والے بسکٹوں اور پانی کی تھی۔ ہر آدمی کو دن بھر میں ایک خشک بسکٹ اور گھونٹ بھر پانی بمشکل مل سکتا تھا۔ یہ صورت حال نہایت مایوس کن تھی، لیکن زندگی کسے پیاری نہیں ہوتی۔ موت کے چنگل میں پھنسے ہوئے انسان کو زندگی پانے کے لیے راشن کے بغیر ایک ہفتہ کاٹنے کو کہا جائے تو بہ خوبی آمادہ ہو جائے گا۔

مجبوری کا دوسرا نام صبر ہے۔ لہٰذا ہم سب ساحل تک زندہ سلامت پہنچنے کی دھن میں ہر قسم کی تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کرنے کے لیے اچھی طرح آمادہ اور مستعد تھے۔

☆☆☆

یوں سفر کی ابتداء میں ہی تمام مسافر خود بخود تین مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے۔ ایک ٹولی سکھوں کی تھی جسے کشتی کے درمیانی حصے میں جگہ ملی، دوسرا گروہ ہندوستانی ملاحوں کا تھا جسے کشتی کے اگلے حصے میں متعین کیا گیا۔ خیال تھا کہ تجربے کار اور جفاکش لوگ ہیں، کشتی کے بادبانوں کو اتارنے چڑھانے اور بہ وقت ضرورت ان کی مرمت کرنے کا کام احسن طریقے سے انجام دے سکیں گے، مگر ان کے گستاخانہ رویے سے بہت جلد پتا چل گیا کہ ان سے کسی مدد کی توقع رکھنا عبث ہے، وہ الٹا تباہی اور بربادی کا سبب بن سکتے ہیں۔

راشن کی کمی پر وہ نہ صرف گالیاں بکتے، بلکہ دنگا فساد کرنے کی دھمکیاں بھی دیتے رہتے تھے۔ خوش قسمتی سے ہمارے ساتھ سوئیکل نامی ایک اینگلو انڈین بھی تھا جو نہایت نیک، پارسا اور صابر آدمی تھا لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہندوستانی لوگوں سے کام لینے کا ڈھنگ بہ خوبی جانتا تھا۔ یوں ہم نے اسے ہندوستانیوں کا انچارج بنا دیا۔ ہمیں ان سے جو کچھ کہنا سننا ہوتا سوئیکل کی معرفت ہی کہتے سنتے تھے۔

تیسری ٹولی یورپ کے سفید فام پر مشتمل تھی اور اسے عقبی حصے میں رکھا گیا تھا۔ ان لوگوں کے سپرد راشن کی تقسیم کا کام بھی سونپا گیا۔ ہوا کی پیشی کے مطابق بادبانوں کی ادلا بدلی اور بار بار پھٹ جانے والے بادبانوں کی بروقت مرمت آسان تھی۔ ان فرائض کی ادائگی کے سلسلے میں ہمیں دن میں کئی بار کشتی کے ایک سرے سے دوسرے تک بھاگ دوڑ کرنی پڑتی۔

ابتداء میں تین چار روز ہم نے پانی کے چند گھونٹ پی کر کاٹ دیے۔ کیوں کہ ہماری زبان لکڑی کی مانند سخت ہو چکی تھی۔ خشک بسکٹ چبانے اور معدہ انہیں ہضم کرنے کو تیار نہ تھا، لیکن جسمانی توانائی بحال رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ کھانا ضروری ہے۔ لہٰذا وہی بے ہودہ بسکٹ نہایت شوق اور رغبت سے کھانے شروع کر دیے۔

حادثے کے تیسرے دن علی الصباح کچھ فاصلے پر ایک بحری جہاز دکھائی دیا جو مخالف سمت میں سفر کر رہا تھا۔ ہم اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی تدبیریں سوچ ہی رہے تھے کہ اسٹیوارٹ نے جس کا ذہن ہر قسم کی ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے پہلے ہی سے مستعد رہتا تھا۔ کچھ پرانے چیتھڑے بانس کے ایک ٹکڑے سے باندھا اور دیا سلائی دکھا کر فضا میں بلند کر دیا، لیکن وائے افسوس، صد افسوس، جہاز والوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ جہاز جو نہ جانے کس ملک کا تھا، نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

یوں تو ہماری کشتی میں موجود بہت کم لوگوں کو کبھی خدا یاد آیا ہوگا، لیکن آزمائش کی اس گھڑی میں بڑے سے بڑے گناہ گار کو بھی اعمال نامے کی سیاہی ستانے لگتی ہے۔ بیشتر لوگ ہر وقت خدا سے سلامتی کی دعائیں مانگتے نظر آتے تھے اور بلاشبہ سب سے زیادہ سوئیکل کی حالت قابل رشک تھی۔ وہ تو ویسے بھی ہر وقت خدا کے نام کی تسبیح کرتا تھا مگر ہم نے اسے اپنی ذات کے لیے کبھی دعائیں مانگتے نہیں دیکھا۔ ہر وقت وہ اپنے شگفتہ چہرے اور دل پذیر باتوں سے ایک ایک

عملے کی اعانت کے معاملے میں انکار کر دیا اور اپنے ملازمین اور
انکار ہوا اس کام کو کرنا اسے پورا کرنا ہے جو ہر کسی کا کام تھا کہ
کہ وہ ایک ... نے ... معمولی سا احساس بھی نہ ہو۔
واضح ہو کہ وہ ایک خدا ترس اور انسان دوست آدمی تھا۔
اس کی نظر میں گورے کالے اور پھر ہر سال سب کی
عزت اور حرمت یکساں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ تمام لوگوں کا
احترام کرتے تھے۔ ضرورت کے وقت وہ چاول اور
دوسری اشیا اور دیگر ملاحوں کو بھی دام کر لیتا تھا اس
کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

کپتان نے آپ اس طرح سے اندازہ کر لیں کہ میں
منصب کا آدمی ہوں اور ہم وطن ملاحوں اور سکھوں کو موجود
احترام کرتا ہوں۔ مجھے اپنے ہم قوم اور ہم رنگ لوگوں میں
کوئی برتری نظر نہیں آتی لیکن خدا کے لیے یہ اندازہ کر لے
میں جلد بازی سے کام نہ لوں گا۔ میں بہت جلد ان لوگوں کی
طرف سے اطمینان کر لوں گا کی طرف سے آ رہا ہوں۔

جہاں تک ڈوبنے والے جہاز اور جہاز کے چند
افسروں کا تعلق ہے وہ نہ صرف اس کشتی کو سالم ساحل تک
پہنچانا اپنا فرض سمجھتے تھے بلکہ اس کی حفاظت اور بھلائی کے لیے
ہر ممکن قربانی دینے کے لیے بھی تیار تھے۔

اس کے برعکس یورپی مسافروں کا رویہ یہ تھا کہ انہیں
اپنی ذات کے علاوہ کسی دوسرے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔
اگرچہ انہوں نے زبان سے تو کبھی کچھ نہ کہا مگر ان کی یہ خواہش
ضرور تھی کہ راشن کی تقسیم کے معاملے میں کالوں پر گوروں کو
ترجیح دی جانی چاہیے، کیونکہ وہ بہرحال حاکم قوم کے افراد
ہیں مگر اس مصیبت کے وقت میں حاکم اور محکوم کا فرق مٹ
چکا تھا۔

اب تو ہم بھی ایک کشتی میں سوار تھے، اس لیے گوروں کو
کالوں پر ترجیح دینے کا کوئی سوال نہ تھا۔ لہٰذا ان کی یہ
خواہش پوری نہ ہوئی تو انہوں نے ہمارے ساتھ عدم تعاون
شروع کر دیا۔ اب کشتی میں امن و سکون کی فضا قائم رکھنے
کے لیے جو ہدایات جاری کی جاتی تھیں، یہ لوگ نہ صرف
جان بوجھ کر انہیں نظر انداز کرتے، بلکہ ان کی خلاف ورزی
بھی کرنے لگے تھے۔

میرے لیے ان کا یہ رویہ نہ صرف غیر مستحسن، بلکہ
ناقابل قبول بھی تھا۔ آخر تنگ آ کر میں نے ایک روز اپنے
ساتھیوں سے مشورہ کیا اور مسافروں سے خطاب کرتے
ہوئے کہا۔

"ظلم و جبر اور استحصال کی موجودگی میں ...
سے لے کر بڑی سے بڑی مصیبت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے
لیکن ہم سب شتر بے مہار بن جائیں گے تو ہمارا ...
خود ہی خواہ مخواہ ان کیوں نہ ہوں۔ ہم ...
کنارے نہیں لگ سکتے۔"

پھر میں نے اپنی جیب سے پستول نکال لیا اور
لہجے میں کہا۔ "کان کھول کر سن لیجیے۔ ہم یہ تو برداشت
کر سکتے ہیں کہ کوئی آدمی کام میں ہمارا ہاتھ بٹانا ...
لیکن برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص ...
... کرنے کی جرأت کرے۔ ایسے شخص ...
... عملی طور پر سمندر کی پوری وسعت رکھتے ہیں۔ ہم
سمندر میں سفر کر رہے ہیں اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے
کہ سمندر میں قانون اور ضابطے کے باغیوں سے نمٹنے کے
لیے ہمیں پستول کی گولی بھی ضائع نہیں کرنی پڑے گی۔ بس
دو آدمیوں کے ہاتھ ڈالنے کی دیر ہے، خونخوار شارک مچھلیاں
ایسے باغیوں کی منتظر ہوں گی۔"

میری تقریر سے ان لوگوں کے کان کھڑے ہو گئے۔
انہوں نے آئندہ کسی شکایت کا موقع نہ دیا اور راشن کے
بارے میں جو لڑائی جھگڑے اور سازشیں ہو رہی تھیں رک گئیں۔

سفر کے چھٹے روز کشتی میں پہلی موت واقع ہوئی۔
میوئل نامی ایک شخص جو ہمارے جہاز میں ہیڈ باورچی تھا۔
نہایت محنتی اور خدمت گزار۔ کشتی میں بھی اس کا رویہ مثالی
اور قابل تعریف رہا۔ راشن کے پانی کی قلت کے سبب جب
وہ پیاس برداشت نہ کر سکا تو منع کرنے کے باوجود سمندر کا
کھارا پانی پینے لگا۔ یہی بے احتیاطی بالآخر اس کی موت کا
بہانہ بن گئی۔ یوں تو ہر وقت ایک ہنگامہ بپا رہتا، کوئی رو رہا
ہے، کسی کے لبوں پر دعائیں ہیں تو کوئی ہذیان بک رہا ہے،
لیکن شام کو راشن کی تقسیم کے وقت ایسا قتل عام بپا ہوتا کہ
خدا کی پناہ۔

ہر آدمی اس کوشش میں رہتا کہ اسے دوسرے سے کچھ
زیادہ وہ گھونٹ پانی مل جائے۔ سکھوں کا ٹولہ ہر وقت کسی
کے لیے مصیبت بنا ہوا تھا۔ انہیں ایک وقت بھی اپنے ذاتی
اور خاندانی جھگڑوں کو سلجھانے کی فکر تھی اور باہمی تو تکار اور
ہاتھا پائی مسلسل جاری رہتی۔ ... یہ ہوئی کہ اگر ہم
ایک مرتبہ تو ان میں ایسی ...
انہیں الگ نہ کرتے تو کشتی ڈوب جاتی۔ ان کے علاوہ
جہاز کا ایک ملازم مسٹر بیک، جسے ہری اور لڑائی اوڑھانے

پیش ہو، فقط قرار دیتے ہوئے نکال دیا گیا تھا اور جو خدا جانے کیونکر کمرشل بحریہ میں ملازمت حاصل کرسکا، ہر وقت خوفزدہ بدحواسی طاری کیے رکھتا۔ اس کی اچھل پھاند سے جب کسی مچھلی نے کھانے کی کوشش کی تو لوگوں کی خوف کے مارے چیخیں نکل جاتیں۔

بہرکیف مینوئل کی حسرت ناک موت اگرچہ بے وقت تھی، مگر اس کا ایک فائدہ بھی ہوا۔ شارک مچھلیاں سفر کے آغاز ہی میں کشتی کا پیچھا کررہی تھیں۔ جب ہم نے خون کے آنسو روتے ہوئے باورچی کی لاش سمندر میں اتاری تو ریزر بلیڈ کی مانند تیز دانت رکھنے والی ان مچھلیوں نے چند لمحوں کے اندر اندر اس کا تیا پانچا کردیا۔

منظر اس قدر ڈراؤنا اور دل دہلا دینے والا تھا کہ بہت سے لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ مینوئل کی موت اور اس کی لاش کے حشر نے تمام مسافروں کے دل خوف اور دہشت سے بھر دیے اور سکھ جو ہمارے لیے مصیبت اور پریشانی کا باعث بنا تھا کئی روز تک منہ لپیٹے پڑا رہا اور پہلی مرتبہ امن وامان اور سکون کی فضا کشتی میں قائم ہوئی۔

پانی کی قلت اور پیاس کی شدت نے لوگوں کا برا حال کردیا تھا۔ بارش کی دعا مانگتے مانگتے سب تھک گئے، مگر آسمان پر دور دور تک بادل کا کوئی سیاہ ٹکڑا نظر نہ آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت ہمیں آزمائش میں پورا اترتے دیکھنا چاہتی ہے، چنانچہ ایک روز سیاہ بادل مست ہاتھی کی طرح جھومتے ہوئے آئے، سب لوگ انہیں دیکھ کر خوش ہوئے، مگر تھوڑی دیر بعد ہی یہ خوشی جاتی رہی۔ بادلوں کو تیز ہوا اپنے ساتھ اڑا لے گئی۔

یوں دن بھر سورج چمکتا لیکن دھوپ سے محفوظ رہنے کی کوئی شکل نہ تھی۔ نتیجہ یہ کہ سیاہ فام اور سفید فام آہستہ آہستہ ایک ہی رنگ میں رنگے جانے لگے۔ چند ساتھی مچھلیاں پکڑنے کے لیے دن کا بیشتر حصہ پانی میں کیس ڈال کر بیٹھے رہتے، مگر یہاں مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا، بلکہ اکثر ایسا ہوتا کہ مچھلیاں کیس یا جو کپڑا ڈالا جاتا اسے ہی چھین کر لے جاتیں۔

سب لوگ رفتہ رفتہ جسمانی قوت سے عاری ہوتے جارہے تھے۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر رہی تھیں۔ آنکھیں اندر کو دھنسنے لگی تھیں اور داڑھی مونچھ کے بال ایک ہو رہے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ڈر لگنے لگتا۔ ہندوستانی ملاحوں اور سکھوں نے چند روز تو باورچی کا سوگ منایا لیکن اس کی موت سے سبق سیکھنے کی بجائے خود بھی سمندری پانی سے پیاس بجھانی شروع کردی۔

آخر ایک دن ان میں سے چھ آدمی چلتے چلتے معذور ہوگئے جیسے فالج گر گیا ہو۔ ان کو اپنی موت کا یقین ہوگیا اور وہ رو رو کر التجا کرنے لگے کہ انہیں شارک مچھلیوں کی غذا نہ بننے دیا جائے۔ ان کی خستہ حالت دیکھ کر ہندوستانی ملاحوں نے سوئیل کو زیادہ راشن دینے کے لیے دھمکانا چاہا۔ یہ صورت حال سخت خطرناک تھی۔ اس طرح ایک ہفتے کا راشن دو ہی دن میں ختم ہو جاتا۔ لہٰذا...... میں نے پستول نکال کر بغاوت پر آمادہ لوگوں کو انتباہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آیندہ اگر کسی شخص نے کوئی غیر قانونی حرکت کی تو میں اس کا بھیجا اڑا دوں گا۔“

میری اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وقتی طور پر کشتی میں امن وامان کی فضا بحال ہوگئی۔ میرا سخت رویہ دیکھتے ہوئے سکھوں نے نیا پینترا بدلا اور پانی کے چند قطروں کے عوض معقول رقم دینے کی پیش کش کرنے لگے، لیکن میں نے یہ پیشکش ٹھکرا دی اور ان سے کہا کہ وہ خدا سے بارش کی دعا کریں۔

اس دوران میں تین آدمی چل بسے۔ ہم نے اپنی رسومات کے مطابق جنازے تیار کیے، ان کی بخشش کے لیے دعائیں پڑھیں اور لاشیں شارک مچھلیوں کے حوالے کردیں۔ ابھی ہم یہ سنگ دلانہ فرض ادا کرکے فارغ ہی ہوئے تھے کہ ایک طرف سے چھوٹی سی سیاہ بدلی اٹھی اور پورے آسمان پر چھا گئی۔ قدرت کو شاید ہماری حالت پر ترس آگیا تھا۔

بارش کی ابتدا معمولی بوندا باندی سے ہوئی اور پھر آسمان سے جھڑی سی لگ گئی۔ سب نے نہ صرف جی بھر کر پانی پیا، خاصہ ذخیرہ بھی کرلیا۔ ایک روز پہلے کے مرجھائے ہوئے چہرے اور سوکھے ہوئے لب دوبارہ تازہ اور جاندار نظر آنے لگے۔

چونکہ بارش کی وجہ سے کپڑے پانی میں تر ہوگئے تھے ان کی خوشگواری کا احساس رات کے ابتدائی حصے تک رہا۔ اس کے بعد نہایت تکلیف دہ سردی نے آن گھیرا۔ دانت بجنے لگے۔ پوری رات عذاب میں کٹی اور صبح جب مشرق کی جانب سے سورج نے اپنا سرخ سرخ چہرہ اٹھا کر ہم بدقسمتوں کا جائزہ لیا تب ہماری جان میں جان آئی۔

سفر کے چودھویں دن ہم نے گھڑی، قطب نما اور خود ساختہ نقشے کی مدد سے اپنی پوزیشن کا جائزہ لیا اور یہ جان کر

خوشی ہوئی کہ نہ صرف ہماری رفتار بہت اچھی رہی بلکہ ہم بھیگنے بھی نہیں پائے تھے۔ چند دن بعد روز ہم کو راستے سے دوبارہ باران رحمت سے نوازا۔ اب ہم ہر شخص کو ضرورت کے مطابق پانی فراہم کرسکتے تھے۔ مگر اس کی ضرورت دو روز قدرت نے ہمارے ساتھ ایک مذاق بھی کیا۔

دوپہر کے وقت ایک جہاز نظر آیا۔ ہم نے جہاز والوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ایک بار پھر چیتھڑوں کو بانس پر لٹکایا اور انہیں آگ دکھا کر زور زور سے حرکت دی۔ پوری قوت سے چیخے چلائے، لیکن کوئی پیش رفت نہ ہوئی، حالانکہ کشتی اور جہاز کا درمیانی فاصلہ اس قدر رہا تھا کہ ہم جہاز کے عرشے کی چھوٹی چھوٹی تفصیل اپنی آنکھ سے دیکھ رہے تھے۔

عرشے پر مسافر بھی چلتے پھرتے دکھائی دیے، مگر خدا جانے کیا بھید تھا کہ ہم انہیں اپنی جانب متوجہ نہ کرسکے۔ اس واقعے نے میرے ذہن پر بہت برا اثر ڈالا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ قدرت کو ہمارا زندہ رہنا منظور نہیں۔ یوں میرے اعصاب مفلوج ہوگئے اور میں حرکت کرنے سے بھی معذور ہوگیا۔

اس وقت جب کہ میرا دل و دماغ بددلی اور مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بھٹک رہا تھا، ڈیوس نامی ایک دوست میرے بہت کام آیا۔ یہ شخص ایسی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کا مالک تھا کہ برے سے برے حالات میں بھی اُمید کی کرن ڈھونڈ نکالتا۔ اس نے فرسٹ ایڈ باکس سے آیوڈین شیشی نکال کر ہتھیلی پر چند قطرے ڈال کر میرے جسم کی مالش کی اور کچھ اس انداز میں حوصلہ بڑھانے کی باتیں کیں کہ میری زائل شدہ قوت و ہمت عود کر آئی اور میں نئے جذبے اور تازہ ولولے کے ساتھ اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہوگیا۔

سولہویں دن آدھی رات کو ہمیں پہلی بار باد و باراں کے جھکڑوں اور طوفان کے تھپیڑوں سے سابقہ پڑا۔ کشتی کا پیندا تو پہلے ہی زخم خوردہ تھا۔ پھر موسلا دھار بارش اور دیو پیکر سمندری لہروں نے کشتی کو فٹ بال کی طرح ادھر سے ادھر پھینکنا اور پٹخنا شروع کردیا۔

اس نازک اور تشویش ناک صورت حال سے مقابلہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ سب ہی جان سے کشتی کو بچانے کی کوشش کرتے اور پانی جس رفتار سے بھر رہا تھا اس سے دگنی رفتار کے ساتھ پانی نکالنے میں لگ جاتے۔ صورت حال کے بے قابو ہوجانے کا مطلب صرف ایک تھا اور وہ تھا، ہم سب کی یقینی موت۔

لیکن مجھے انتہائی رنج اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ چند سفید فام باشندوں، سکھوں اور ہندوستانی ملاحوں کو موقع کی نزاکت کا احساس دلانے کے لیے مجھے پہلی مرتبہ تشدد کا سہارا لینا پڑا۔

صبح کاذب تک طوفان یکساں شدت سے جاری رہا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ ہوا کی تندی و تیزی میں فرق آتا گیا اور جب سورج نکلا تو نہ صرف مطلع صاف ہوچکا تھا، بلکہ سمندر کی سطح پرسکون اور فضا خوش گوار ہورہی تھی۔

بیشتر ساتھیوں کی ذہنی اور جسمانی حالت تو پہلے ہی خستہ ہوچکی تھی، رات بھر طوفان کا مقابلہ کرنے اور کئی گھنٹے پانی میں بھیگے رہنے کے باعث ایک نوجوان انجینئر لینڈل، معمر اور تجربے کار جہاز راں اسمتھ اور رام سنگھ ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔

سب سے پہلے سکھوں نے مذہبی رسوم ادا کرنے کے بعد رام سنگھ کو سمندر کی نذر کیا اور ان کے بعد ہم نے اپنے دو کارآمد دوستوں کو انسانی گوشت کی بھوکی شارک مچھلیوں کا لقمہ بننے کے لیے سمندر میں پھینک دیا۔

سکھوں کی طرف سے مذہبی رسوم ادا کرنے کا یہ پہلا اور آخری مظاہرہ تھا۔ اس کے بعد اگر ان کا کوئی ساتھی مرتا، تو باقی سکھ بے تعلقی سے منہ دوسری طرف پھیر کر تختوں پر لیٹے رہتے اور لاش ٹھکانے لگانے کا فرض ہمیں انجام دینا پڑتا۔

گڈ فرائڈے اور ایسٹر کا تہوار ہم نے سمندر کے پانی پر منایا۔

اس سے اگلے روز سوئیکل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہوگیا۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو اس خادم انسانیت اور مساوات واخوت کے پتلے نے نہایت شکستہ دلی کے عالم میں دم توڑا۔ مجھے یاد ہے اس نے آخری وقت تک ہندوستانی ملاحوں اور سکھوں کی پُرخلوص خدمت کرنے کی کوشش کی مگر جواب میں ان کی طرف سے گالی گلوچ اور قتل کی دھمکیاں ہی ملیں۔

ہم نے اس کی لاش بھی شارک مچھلیوں کے سپرد کردی۔ مرنے کے بعد بھی یہ شخص خدا کی مخلوق کا پیٹ بھرنے کے کام آیا۔

ایسٹر ہی کے دنوں میں ہمارے سب سے زیادہ محنتی، باعمل، تجربے کار اور قابل جہاز راں لیون پر ٹیریا اور ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی، لیکن اس شخص کے احساس ذمے داری

اور خوف جانی کی وہ اداکاری بھی پڑتی ہے کہ اس قابل رحم حالت میں بھی اپنی ایمانی یقین سمت یقین سے الگ ہونے کے لیے تیار نہ تھا۔

یہی وہ شخص تھا جس کی ہمت اور کوششوں سے ہم زمین تک پہنچنے کے قابل بنے تھے لیکن اب وہ ہمیں منزل مقصود کا راستہ بتا کر راہ میں بچھڑ رہا تھا۔ قطب نما اور ستاروں کی مدد سے قائم کردہ اندازوں کے مطابق اب ہم زمین سے کچھ زیادہ دور نہ تھے اور اس وقت جب ہمارے نتھنوں سے زمین کی خوشبو پہلی مرتبہ ٹکرائی تو لیون کی حالت اس درجہ خراب ہو چکی تھی کہ وہ ہذیان کے عالم میں الٹے سیدھے احکام صادر کر رہا تھا۔

دن چڑھا تو ہم سمندر کی سطح پر تیرتا ہوا گھاس پھوس اور جھاڑ جھنکار بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ سمندری نباتات کی موجودگی نے ہمارے حوصلے دوچند کر دیے۔ رات آئی تو ہم بدستور بیکراں سمندر میں کھلے آسمان کے نیچے محو سفر تھے۔ پھر دور بہت دور روشنی کے مینار کی جھلملاتی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔

ایک طرف سے کسی جہاز کی سیٹی کی آواز سنائی دی اور تھوڑی دور آگے بڑھے تو اس کی بتیاں بھی نظر آ گئیں۔ یہ جہاز کسی بندرگاہ کے آس پاس لنگر ڈالے کھڑا تھا۔

عجب اتفاق تھا کہ ساری رات سمندر میں سفر کرنے کے بعد جب پو پھٹی تو زمین بدستور ہماری نظروں سے اوجھل رہی۔ لیون کی حالت دیکھتے ہوئے زمین کی یہ دوری ہم سب کو بری طرح کھل رہی تھی۔ ہماری خواہش تھی کہ شیر دل لیون مرنے سے پہلے ایک بار زمین کی جھلک ضرور دیکھ لے۔ ایک مرتبہ وہ زمین پر زندہ ضرور پہنچ جائے۔ پھر ہم اسے خوشی سے مرنے کی اجازت دے دیں گے۔

صبح کا اجالا نمودار ہوا تو میں نے لیون کے دل کی دھڑکن اور سانس کی آمد و رفت کا جائزہ لیا اور یہ محسوس کر کے میرا دل ڈوبنے لگا کہ اس کے چہرے پر موت کی پرچھائیاں آہستہ آہستہ گہری ہو رہی ہیں۔ آٹھ بجے کے قریب اس نے دو تین ہچکیاں لیں اور پھر اس کی روح جسم کی قید سے آزاد ہو گئی۔

لیون کی موت سب کے لیے ناقابل برداشت صدمہ تھا۔ ہر شخص کی آنکھوں میں آنسو نظر آئے۔ بارہ بجے جب اس کی لاش سمندر میں پھینکی گئی تو لوگوں کی چیخیں نکل گئیں اور سب ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر رونے لگے۔

مجھے یقین ہے اگر قدرت کی طرف سے مطالبہ کیا جاتا کہ جان کے بدلے جان دے کر لیون کو بچایا جا سکتا تو کشتی کے کئی شخص بخوشی اس کے لیے تیار ہو جاتے۔ لیون کی موت کے تین گھنٹے بعد ہماری آنکھوں نے زمین کا نظارہ کیا۔ اب ہم خاموش ساحل کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کو آسمان کی طرف سر اٹھائے دیکھ رہے تھے۔

زمین پر قدم رکھتے ہی ہم نے آگ کا بہت بڑا الاؤ روشن کیا اور اس کے چاروں طرف ٹانگیں پسار کر لیٹ گئے۔ 23 دن کے اس ناقابل فراموش اور مصائب سے بھرپور سفر کے بعد آگ کے سامنے اکڑی ہوئی ٹانگوں کو پھیلا کر گرم ریت پر لیٹنا اس وقت ہماری زندگی کی سب سے بڑی عیاشی تھی۔

23 دن پہلے 82 مسافروں نے اس کشتی میں سفر کا آغاز کیا تھا۔ ان میں سے 38 خوش قسمت ساحل مراد یعنی خشکی تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اس عرصے میں ہم نے پندرہ سو چونتیس میل کا فاصلہ طے کیا۔

جس مقام پر کشتی نے ساحل کو چھوا، وہ برازیل کا ایک غیر آباد جزیرہ تھا۔ ان دنوں جنگ پورے عروج پر تھی۔ خفیہ طور پر نازی جاسوسوں اور دہشت پسندوں کے مختلف ممالک کے ساحلوں پر اترنے کی کہانیاں عام تھیں۔ اسی لیے برازیلی مچھیروں نے جو اس وقت جزیرے پر عارضی پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے، ہماری سرگزشت پر یقین کرنے سے انکار کر دیا، لیکن جب ہم نے انہیں بخوشی پولیس یا فوج کے افسروں کو بلانے یا ہمیں ان کے پاس لے جانے کی دعوت دی تو وہ قدرے نرم پڑے۔ دراصل وہ ہمیں اٹلی کے باشندے اور نازیوں کا جاسوس سمجھ رہے تھے۔

ہمیں ساؤ لیوس کے اسپتال میں پہنچایا گیا جہاں ہم آٹھ ہفتے تک پڑے رہے۔ اس اثناء میں ڈاکٹروں نے ہم پر یلغار کر دی۔ وہ ہمارے ہیبت ناک تجربے کے اثرات کا جائزہ لینے اور اتنا طویل سفر راشن پانی کے بغیر طے کرنے والوں کے جسموں کا معائنہ کر کے نئے طبی طریقے قائم کرنا چاہتے تھے۔

ہمارے اس ناقابل فراموش سفر سے طبی سائنس کو جو فائدہ ہوا، سو ہوا، مگر بحری مسافروں کی حفاظت کے لیے مختلف حکومتوں کی طرف سے نئے حفاظتی انتظامات کیے گئے اور ایسی سہولتیں حاصل ہونے لگیں کہ اگر جہاز غرق ہو جائے تو مسافر کسی پریشانی کے بغیر مضبوط اور آرام دہ کشتیوں میں آسانی سے ہزارہا میل کا فاصلہ طے کر سکیں۔ ☆☆

ولی ہند

ڈاکٹر ساجد امجد

اس ہستی کا ذکر جو زمین سے کنکر پتھر اٹھا کر منہ میں بھرتا اور وہ سنگریزے شکر بن کر پیٹ میں اتر جاتے۔ جو ولی عصر کہلاتا۔ جسے خواجہ معین الدین چشتیؒ نے شہباز سدرۃ المنتہیٰ کا خطاب عطا کیا تھا۔ جس کی ہمت کرکے نظام الدین اولیا نے اوج پائی۔ ایسے ولی کامل جو اب بھی مرجع خلائق ہیں۔

اللہ کی راہ میں خود کو نچھاور کرنے والے کا ذکرِ خاص

بابا فرید الدین شکر گنج بخش کی دوسری شادی کو ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ آپ حضرت معین الدین چشتیؒ کے مزار کی زیارت کے لیے اجمیر تشریف لے گئے۔ آپ نے اس زینے کے پاس جو صاحبِ مزار کی قبر مبارک کی طرف جاتا تھا چلہ کھینچا۔

عرفہ کی رات تھی۔ آپ قرآن پاک میں مشغول تھے۔ جب پندرہ پارے ختم کر لیے تو قبر مبارک سے آواز آئی کہ فلاں لفظ پڑھنے سے رہ گیا ہے۔

آپ کی روح سرشار ہو گئی۔ حضرت معین الدینؒ اس توجہ سے تجھے سن رہے ہیں۔ حضوری قبول ہو گئی۔ بدن

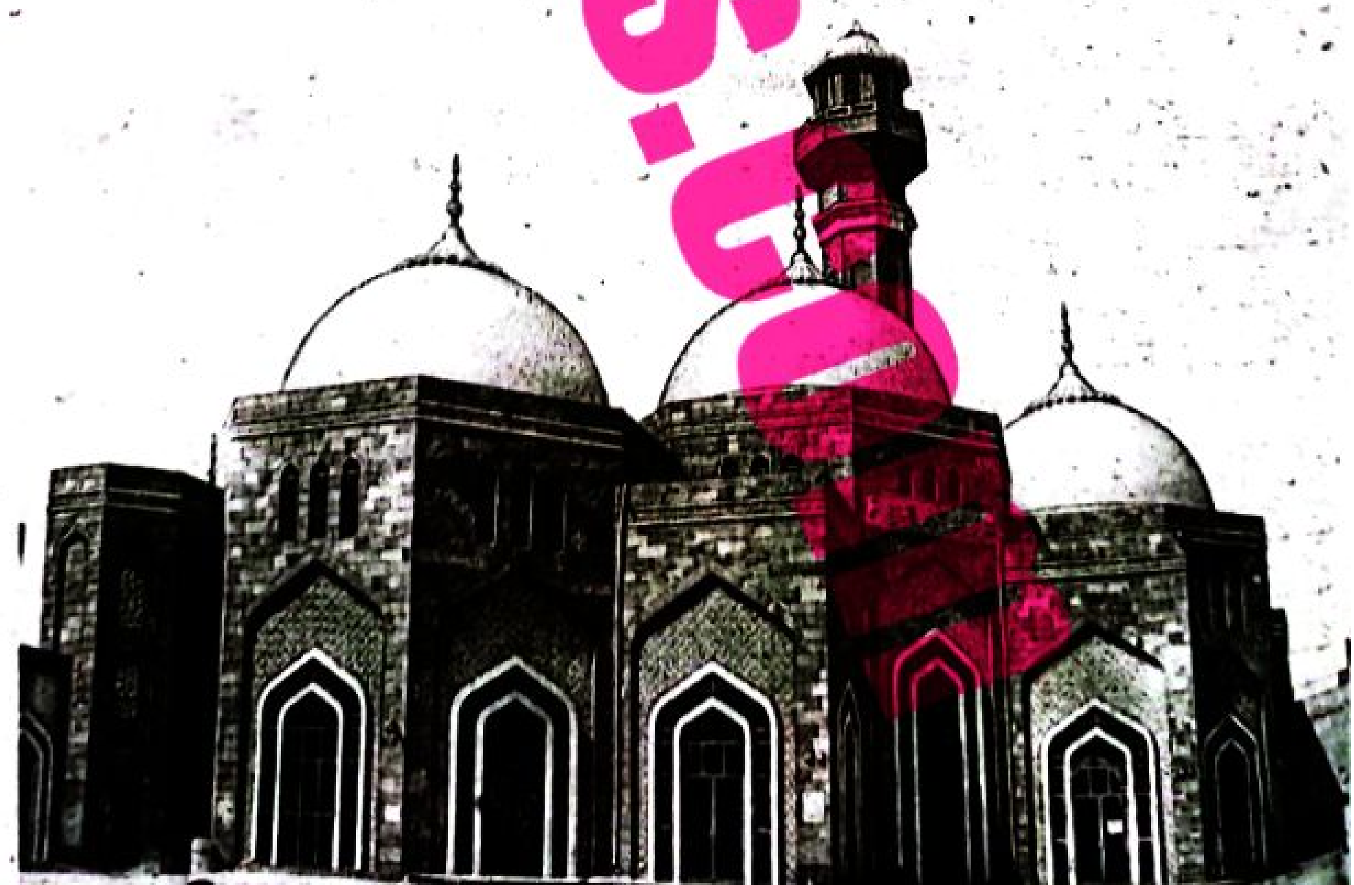

پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ اسی سرشاری کے عالم میں اس جگہ سے قرآن کو دہرایا جہاں سے ٹوکا گیا تھا۔ جب یہ غلطی دور ہو گئی تو آواز پھر آئی۔ ''ہاں اب ٹھیک ہے۔''

مزار شریف پر جس کرم نوازی کا مظاہرہ ہوا تھا اس کا خیال کر کے اپنے مرشد حضرت قطب الدین بختیار کاکی کو یاد کرنے لگے جو اس تعلق کا واسطہ بنے تھے۔ اسی عالم دیوانگی میں آپ ہانسی جانے کے بجائے دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ دہلی پہنچتے ہی آپ مرشد کے مرقد پر تشریف لے گئے۔ دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ نہ قبر ہے نہ کوئی نشان۔ باہر سے آنے والوں کو کیا علم ہوگا کہ اس خاک تلے کون سا آفتاب معرفت محوخواب ہے۔ کچھ زمانہ گزرے گا کہ اس ہموار سطح سے واقفیت رکھنے والے تک دنیا میں نہیں رہیں گے۔

مسئلہ یہ تھا کہ حضرت قطب الدین نے وصیت کی تھی کہ ان کی قبر زمین کی سطح کے برابر رکھی جائے۔ اس صورت حال سے آپ بہت بے چین ہوئے۔ گریہ وزاری کے ساتھ مرشد سے درخواست کی کہ وہ قبر کو بلند کرنے کی اجازت مرحمت فرما دیں۔ بالآخر خواب میں انہیں اشارہ مل گیا کہ مرقد پر مٹی ڈال کر اسے بلند کر دیں۔

دوسرے دن لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ باباجی اپنی کمر پر مٹی ڈھو ڈھو کر لا رہے ہیں اور مرقد پر ڈال رہے ہیں۔ دوسرے لوگوں نے آپ کا ہاتھ بٹانا چاہا لیکن آپ نے انہیں منع فرما دیا۔ دن بھر وہ اکیلے مٹی لا لا کر ڈالتے رہے۔ شام کے قریب کہیں جا کر یہ کام مکمل ہوا۔ آپ نے سوچا اگلے روز آ کر اس مٹی کو برابر کر کے کوہان نما قبر کی شکل دے دیں گے جیسے کہ قبریں بنتی ہیں۔

دوسرا دن ہوا تو اس کی نوبت ہی نہیں آئی کیونکہ اسی رات خواب میں دیکھا کہ تاکید کی جا رہی ہے۔ ''قبر کا نشان تو بن گیا ہے اب اسے اسی طرح ہموار رہنے دیں۔''

آپ مجبور ہو گئے اور مرقد کو اسی طرح چھوڑنا پڑا۔ بعد ازاں بزرگان چشت نے اس پر ایک سائبان تعمیر کرا دیا تاکہ باد و باراں سے متاثر نہ ہو۔

اس کام کی تکمیل کے بعد آپ نے چند روز دہلی میں قیام کیا اور پھر ہانسی کی طرف روانہ ہو گئے۔ سرہنگا مجذوب فراق کی آگ میں جل رہا تھا۔ آپ کو دیکھتے ہی قدموں سے لپٹ گیا۔

''اب اگر آپ کہیں گئے تو اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا ہوگا۔'' مجذوب نے کہا۔

''دیکھو سرہنگا! تقدیر کیا دکھاتی ہے۔''

''وہ تو دکھائے گی۔ اسے تو دکھانا ہے۔ ہمیں تو ساتھ جانا ہے۔'' مجذوب نے کہا اور اپنے مخصوص انداز میں رقص کرنے لگا۔

☆☆☆

ہانسی کے آسمان پر گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ رات آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ بابا فرید الدین وظائف سے فارغ ہو کر کچھ دیر کے لیے زمین پر بچھے بستر پر لیٹے ہی تھے کہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ کئی دن سے وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کے منتظر تھے۔ فقیر کا تو ہر کام اللہ کی رضا سے ہوتا ہے۔ عالم کشف میں انہوں نے اپنے آپ کو ایک ویران مقام پر موجود دیکھا تھا۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا تھا کہ وہ جس مقصد سے ہانسی میں قیام پذیر ہوئے تھے اس کی تکمیل ہو چکی اور اب انہیں کسی اور مقام پر روانہ کیا جا رہا ہے۔ یہ مقام دہلی بھی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ ویرانہ نہیں تھا۔ ملتان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں تبلیغ کرنے والے پہلے سے موجود تھے۔ حضرت مرشد کے وصال کے بعد دہلی کی کشش بھی ختم ہو گئی تھی۔ وہاں کئی چراغ پہلے ہی روشن تھے۔

آپ سر جھکا کر بیٹھ گئے اور پھر کچھ سوچ کر فرحاں و شاداں ہو گئے۔ ہانسی میں تبلیغ کا کام مکمل ہو گیا۔ حضرت جمال ہانسوی کی صورت میں ایک ایسا خلیفہ بھی میسر آ گیا ہے جو میرے بعد میرے سلسلے پر کاربند رہے گا۔ ایک اور خلیفہ منتخب الدین زری بخش کو دکن بھیج چکا ہوں۔ وہ وہاں اپنے کام میں مصروف ہیں۔ اب اگر میں ہانسی سے چلا بھی جاؤں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

یہ خیال آتے ہی آپ نے اطمینان کا سانس لیا اور تہجد کی نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت آپ کا پورا گھر جاگ رہا تھا۔ آپ کی دونوں ازواج اور کم سن بچے تہجد کے لیے اٹھ گئے تھے۔ آپ کے بھانجے حضرت علی احمد صابر اپنے حجرے میں نماز ادا کر رہے تھے۔

نماز فجر تک اس مقدس گھرانے میں درود و سلام کی آوازیں گونجتی رہیں۔ نماز فجر کے بعد آپ نے اپنے خلیفہ خاص حضرت جمال کو طلب کر لیا۔

''ہم نے حکم خداوندی سے ہانسی میں بارہ سال گزارے اور اب اسی حکم سے یہاں سے جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔''

''یا مرشد! حکم خداوندی سے کون سرتابی کر سکتا

ہے۔ آپ کی جدائی میرے لیے رنج کا باعث ہوگی لیکن آپ کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم ہے۔"

"یہ تم سے بھی اچھی طرح کی۔ اب میری مسند پر تم بیٹھو گے۔ خلافت کا اندراج بھی تمہارے پاس ہوگا۔ میں نے خلافت دوں گا، وہ تمہارے پاس آکر اندراج کرائے گا تاکہ نام تاریخ میں محفوظ ہو جائیں اور تمہاری جو اہمیت میری نظروں میں ہے دوسرے بھی اسے محسوس کرتے رہیں۔"

"غلام اس حکم کے بجالانے کا پابند ہے۔" حضرت جمال نے کہا۔ پھر کچھ دیر کے توقف کے بعد پوچھا۔ "آپ کے قدموں سے اب کون سا علاقہ جگمگانے والا ہے۔ کیا دہلی کا ارادہ ہے؟"

"دہلی دارالحکومت ہے۔ لشکر کشیوں کے دور رہتے ہیں۔ فقیروں کو بادشاہوں سے ملنا پڑتا ہے۔ ہم سکون کی تلاش میں گھر سے نکل رہے ہیں۔"

حضرت جمال کو اس سے آگے پوچھنے کی جرات نہ ہوئی۔ بس اتنا معلوم ہوا کہ ارادہ دہلی کا نہیں ہے۔ حضرت کے قدم جہاں ٹھہریں گے خود بخود معلوم ہو جائے گا۔

دن نکلنے کے ساتھ ہی یہ روح فرسا خبر پورے شہر میں پھیل گئی۔ جو سنتا تھا کف افسوس ملتا تھا۔ شہر کی رونق، شہر کی برکت رخصت ہو رہی تھی۔ خانقاہ کے سامنے ہجوم جمع تھا۔ آہوں اور سسکیوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ عقیدت مندوں نے آپ کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن آپ کا فیصلہ تقدیر کی طرح اٹل تھا۔

جب حضرت بابا فریدالدینؒ سفر کے لیے گامزن ہوئے تو ان کے قافلے میں کم سن بچوں کے علاوہ چھوٹے بھائی نجیب الدین متوکل، بھانجے علی احمد صابر، دونوں بیویاں اور چند عقیدت مند تھے۔ سرہنگا مجذوب تو آپ کا عاشق زار تھا اس سفر میں کیوں پیچھے رہتا۔ سامان اٹھائے سب سے آگے تھا۔ سامان ہی کیا۔ ایک ٹرنک ایک بستر۔ دنیاوی ضرورتیں کرپیٹ رہی تھیں کہ ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں خریدا نہیں جاسکتا۔ ابلی ہوئی ترکاری جن کی غذا، پیوند لگی گدڑیاں جن کا لباس، گھاٹیاں اور جنگل جن کی شاہراہیں۔ نہ سواری نہ منزل، نماز کا وقت ہوا، جنگل میں نماز ہوگئی۔ رات پڑی ضرور مگر شب بیداری میں گزر گئی۔ کسی درخت کے سائے تلے کچھ دیر آرام کرلیا پھر آگے بڑھ گئے۔

سب صبر و رضا کے پیکر تھے۔ راضی بہ رضا تھے۔ سختیاں جھیلتے رہے سفر کٹتا رہا۔ راستے کی سمت کو دیکھتے ہوئے سب کو

سوانحی خاکہ

نام: فریدالدین مسعود
لقب: گنج شکر
والد: حضرت جمال الدین سلیمان
والدہ: قرسم خاتون (عرف کے لحاظ سے مریم خاتون)
پیدائش: 569ھ بمقام کھتوال
وفات: 5 محرم 664ھ بعمر پچانوے سال
مزار مبارک: اجودھن حالیہ پاکپتن شریف

☆☆☆

ازواج کے اسمائے گرامی

1: حضرت نجیب النسا
2: حضرت خاتون بیگم
3: حضرت بی بی ام کلثوم

☆☆☆

صاحبزادگان

1: حضرت شہاب الدینؒ
2: حضرت نظام الدین شہیدؒ
3: حضرت بدرالدین سلیمانؒ
4: حضرت شیخ محمد یعقوب
5: شیخ عبداللہ بیابانی
6: محمد نعیم الدینؒ
7: محمد سلطان الدینؒ
8: عزیز الدینؒ
9: محمد فرید بخش

☆☆☆

صاحبزادیاں

1: حضرت بی بی فاطمہؒ
2: حضرت بی بی شریفہؒ
3: بی بی مستورہ
4: بی بی ہاجرہؒ
5: بی بی زینب
6: حضرت خدیجہ
7: حضرت اصغری
8: حضرت کبریٰ

یہ خیال ہو رہا تھا کہ شاید آپ کا ارادہ کوٹھوال جانے کا ہے جہاں آپ پیدا ہوئے تھے، جہاں آپ کا بچپن گزرا تھا لیکن جو اللہ کی محبت میں سرشار ہوا سے وطن کی محبت سے کیا سروکار۔ ابھی کوٹھوال دور تھا کہ ایک فصیل نظر آئی۔ دن کا وقت تھا۔ شہر کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ قافلہ شہر میں داخل ہوا تو شہر کی آبادی پر نظر پڑی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں مسلمان بھی ہیں مگر ہندوؤں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔

"یہ کون سا شہر ہے؟"

"اس کا نام مقامی زبان میں اجودھن ہے۔"

"نام سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہندوؤں کا شہر ہے لیکن حاکم مسلمان ہے۔"

"مسلمان بھی وہ بس برائے نام ہے۔ ہندو آبادی کا غلبہ ہے اس لیے رسم و رواج ہندوانہ ہیں۔"

یہ سب باتیں شہر میں چل پھر کر معلوم ہو گئیں۔ تبلیغ دین کے لیے اس سے اچھا موقع نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ نے اجودھن میں رہنے کا ارادہ کر لیا۔

"ہم یہیں قیام کریں گے۔"

"یہاں تو ہر طرف آبادی ہے۔ ہم ٹھہریں گے کہاں۔"

"آبادی سے دور۔ ایک ایسے ویرانے میں جہاں میں کشف کی حالت میں پہنچا تھا۔"

آپ اپنے ساتھیوں کو لے کر شہر سے باہر نکل آئے۔ درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ قریب ہی ایک شکستہ اور غیر آباد مسجد تھی۔

برسوں بعد اس مسجد میں اذان کی آواز گونجی اور نماز باجماعت ادا کی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مٹی اور گارے کی چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بن گئیں۔

پانچوں وقت اذان کی آواز گونجنے لگی تو آبادی سے کچھ لوگ اس انقلاب کو دیکھنے بھی آئے۔ دیکھا کہ فقیروں کی ایک جماعت کھلے آسمان تلے بے یارومددگار موجود ہے۔ کچھ لوگ ان فقیروں کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ کچھ لوگوں نے آپ کا نام سنا ہوا بھی تھا۔ وہ یہاں سے اٹھ کر گئے اور شہر میں جا کر ذکر کیا۔ مسلمان آبادی نے اسے برکت تصور کیا جبکہ ہندو آبادی میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ آبادی میں کچھ مسلمان ایسے بھی تھے جن پر آپ کی تبلیغ کا بہت جلد اثر ہوا اور وہ اس ویران مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے آنے لگے۔ شہر جا کر بھی وہ بابا جی کی تعریفیں کرتے پھرتے تھے۔ یہ خبریں حاکم اجودھن تک بھی پہنچ رہی تھیں لیکن وہ ابھی تک آپ کی موجودگی کو خطرہ نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ رستے چلتے جوگی ہیں۔ کچھ دن ٹھہریں گے پھر آگے بڑھ جائیں گے اور جب وہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا رہے ہیں تو ہم انہیں کیوں چھیڑیں۔

جب آپ کا چرچا بڑھا تو کچھ اہل ثروت حضرات آپ کی طرف متوجہ ہوئے اور جب ان کی مفلسی اور درویشی کا حال دیکھا تو آپ کی مدد کرنی چاہی۔ ان لوگوں کی درخواست آپ نے قبول تو کر لی لیکن صرف اس حد تک کہ درویشوں کی سانسوں کا تسلسل برقرار رہے۔ اس امداد کو آپ نے غیب کی امداد تصور کی اور بے نیازی سے عبادت میں معروف ہو گئے۔

ایک روز آپ ایک درخت کے نیچے بیٹھے اپنی گدڑی گونتھ رہے تھے کہ ایک ہندو گوالن کا گزر ہوا۔ وہ آپ کو دیکھ کر رک گئی اور غور سے آپ کو گدڑی سیتے ہوئے دیکھنے لگی۔

"کھڑی کھڑی تھک جاؤ گی۔ میں اگر کوئی ایسا انوکھا کام کر رہا ہوں جس میں تمہیں دلچسپی ہے تو بیٹھ کر آرام سے دیکھو۔"

"آپ کون ہیں؟" گوالن نے پوچھا۔

"اللہ کا بندہ ہوں۔"

"وہ تو ہم سب ہی ہیں۔ میرا مطلب ہے آپ یہاں کیوں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"یہی سوال میں تم سے کر سکتا ہوں۔ تم روز اس طرف سے کیوں گزرتی ہو۔"

"میں تو دودھ بیچنے جاتی ہوں۔ دودھ نہ بیچوں تو کھاؤں کہاں سے۔"

"جب دودھ بیچ لیتی ہو پھر کیا کرتی ہو؟"

"پھر کیا کرنا ہے۔ بھگوان کا شکر ادا کرتی ہوں۔ گھر میں بیٹھتی ہوں۔"

"جس نے اپنے آپ ہی کو بیچ دیا ہو وہ کیا بیچنے گھر سے نکلے۔ میں یہاں بیٹھ کر اللہ کا شکر ادا کرتا رہتا ہوں۔"

"آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے کھانے پینے کا کیا ہوتا ہے؟"

"جس نے ہمیں خرید لیا وہ پالتا بھی ہے۔"

"میں ایک پیالہ دودھ روزانہ آپ کو دے جایا کروں گی۔" گوالن نے کہا اور اپنا برتن اٹھا کر چل دی۔

وہ آپ کے اخلاق سے اتنی متاثر ہوئی کہ آپ کے پاس آ کر بیٹھنے لگی۔ ایک پیالہ دودھ آپ کے لیے لاتی۔ کچھ دیر بیٹھتی، آپ کی باتیں سنتی اور پھر اپنی راہ ہو لیتی۔ آپ کی باتوں سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ بابا جی کوئی

urdunovels.com

...نیک آدمی ہیں۔ اللہ کے لیے گھر بار چھوڑ کر جنگل میں بیٹھے ہیں۔ اللہ ان کی ضرور سنتا ہوگا۔ یہ میرے لیے دعا کریں گے یا کوئی مشورہ دیں گے۔ ایک روز وہ بڑی پریشانی میں آگئی اور اپنے حالات بیان کرنے لگی۔

"باباجی میں بہت پریشان ہوں۔ آپ میرے لیے دعا کریں یا کوئی مشورہ دیں۔"

"خیریت تو ہے کیا بات ہے۔ تم آج پریشان بھی دکھائی دے رہی ہو۔"

"یہاں سے کچھ فاصلے پر جوگی آکر ٹھہرے ہیں۔" اس گوالن نے اپنی کہانی سنانی شروع کی "وہ مجھ سے دودھ خرید لیتے ہیں اور قیمت نہیں دیتے۔ منع کرتی ہوں تو کہتے ہیں ہمیں دودھ نہیں دوگی تو تم سے کوئی دودھ نہیں خریدے گا۔ میں غریب عورت ہوں۔ بڑا گھاٹا اٹھانا پڑ رہا ہے۔"

"تم کسی اور راستے سے چلی جایا کرو۔ ان کے سامنے سے گزرتی ہی کیوں ہو۔"

"یہ بھی کر کے دیکھ لیا۔ میں نے جوگیوں سے بچنے کے لیے دوسرا راستہ پکڑ لیا تھا۔ انہوں نے ایسی بددعا دی کہ میرا جتنا دودھ تھا اس میں کیڑے ہی کیڑے بھر گئے۔ اس کے بعد سے میں ڈر گئی۔ اب میں پہلے جوگیوں کو دودھ دیتی ہوں پھر بیچنے کے لیے نکلتی ہوں۔ وہ جوگی مجھ سے کہتے ہیں کہ اگر میں انہیں دودھ نہیں دوں گی تو میرے سارے مویشی مر جائیں گے۔"

"تم میرے کام تو۔ اللہ نے چاہا تو وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ ضروری ہوا تو ہم انہیں سمجھا بھی دیں گے۔"

"باباجی ہوشیاری سے سمجھانا۔ وہ لوگ پکے جادوگر ہیں۔ میری وجہ سے کہیں آپ کو نقصان نہ اٹھانا پڑے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ جب تک اللہ نہ چاہے کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ جوگی اس عورت کو ڈھونڈتے ہوئے آنکلے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ وہ کسی مسلمان فقیر کے پاس بیٹھی ہے تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"تم ابھی تک دودھ کیوں نہیں پہنچا۔" گرو سخت غصے میں تھا۔ "ان میں سے ایک جوگی نے کہا۔

عورت گھبرا کر اٹھنے لگی لیکن بابا فرید الدین نے اشارے سے اسے بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے بیٹھ گئی لیکن اتنی خوف زدہ تھی کہ کبھی جوگیوں کی طرف دیکھتی تھی کبھی بابا کی طرف دیکھ لیتی تھی۔

"اس عورت کو آج میں نے یہیں بٹھالیا ہے۔ تم بھی بیٹھ جاؤ۔" آپ نے نہایت نرمی سے فرمایا لیکن آپ کے الفاظ میں ایسی تاثیر تھی کہ وہ جوگی صابن کے جھاگ کی طرح زمین پر بیٹھ گئے۔ اس طرح خاموش بیٹھے تھے کہ جیسے میدان جنگ میں قید ہو کر آئے ہوں۔

بابا فرید الدین انہیں زمین پر بٹھا کر غافل ہو گئے جیسے وہ جوگی وہاں موجود ہی نہ ہوں۔ وہ جوگی بھی گونگے بہروں کی طرح آپ کی صورت تک رہے تھے۔ یہ تک کہنے کی ہمت نہیں تھی کہ ہمیں کیوں بٹھایا ہے۔

جب یہ جوگی بہت دیر تک اپنے ڈیرے پر نہیں پہنچے تو ان کا گرو ڈھونڈنے کے لیے نکلا اور یہ دیکھ کر وہ غصے سے پاگل ہو گیا کہ اس کے چیلے کسی مسلمان کے پاس اس طرح ساکت بیٹھے ہیں جیسے پتھر کے ہوں۔

"تم یہاں بیٹھے ہو اور میں تمہیں تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ اٹھو میرے ساتھ چلو۔"

"یہ ہمارے پاس بیٹھ گئے ہیں اب کہیں نہیں جائیں گے۔"

"تم کیا اجودھن کے حاکم ہو جو تمہارا حکم چلے گا۔"

"لے جاسکتے ہو تو انہیں یہاں سے لے جاؤ۔"

"تم نے اپنے جادو سے انہیں پتھر کا بنادیا ہے لیکن تمہیں میری طاقت کا ابھی اندازہ نہیں۔" اس جوگی نے کہا اور بابا فرید الدین کو نقصان پہنچانے کے لیے کوئی منتر پڑھنے لگا۔

اس کا ہر منتر بے کار جارہا تھا۔ وہ پریشان تھا کہ اس مسلمان فقیر میں ایسی کون سی طاقت ہے جو اس کے منتروں کو ناکارہ بنارہی ہے۔ یقیناً یہ کوئی مجھ سے بڑا جادوگر ہے۔

"میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔ اعتراف کرتا ہوں کہ تم مجھ سے بڑے جادوگر ہو۔ اب تو میرے آدمیوں کو چھوڑ دو۔"

"میں جادوگر نہیں ہوں۔ میں نے اللہ کے حکم سے تمہارے آدمیوں کو یہاں بٹھایا ہے۔ میرا مشورہ ہے اب تم بھی اس جادوگری سے باز آجاؤ۔ اللہ نے تمہارے لیے روشنی اتاری ہے اور تم اندھیرے میں بھٹک رہے ہو۔"

اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ آپ کے قدموں

urdunovels.com

میں کر کے اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے التجا کرے۔

"میرے ساتھیوں کو چھوڑ دو وہ زندگی بھر یہیں بیٹھے رہیں گے۔"

"تم جوگی ہو۔ تمہارا شہروں میں کیا کام۔ کیوں لوگوں کو ناحق پریشان کرتے ہو۔ اب میں دو ہی باتیں تمہارے سامنے رکھتا ہوں۔ اسلام قبول کر لو اور ہمارے ساتھ رہو یا پھر اس شہر سے دور چلے جاؤ۔ میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔"

حضرت بابا فرید الدین کی زبان سے جیسے ہی یہ الفاظ ادا ہوئے تمام جوگیوں کو جیسے ہوش آگیا۔ گرو سمیت سب نے معافی طلب کی۔ انہوں نے اسلام تو قبول نہیں کیا لیکن اپنے وعدے کے مطابق اجودھن سے کوچ کر گئے۔

گرو اس تمام کارروائی کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ جب آپ کے پاس سے اٹھ کر گئی تو اس واقعے کے سوا اس کی زبان پر کوئی اور بات تھی ہی نہیں۔ لوگوں نے خود اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا کہ جوگی اجودھن چھوڑ کر جا رہے ہیں۔

اس واقعے کا ایسا چرچا ہوا کہ ہندوؤں کی توجہ آپ کی طرف مبذول ہونے لگی۔ بے شمار ہندو آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے لگے۔

اب تک آپ کو بے ضرر سمجھا جا رہا تھا لیکن جب ہندوؤں نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تو ہندو آبادی میں کھلبلی مچ گئی۔ حاکم کے پاس شکایتیں پہنچنے لگیں۔ اسے یہ خطرہ ہوا کہ کہیں اس کے خلاف بغاوت نہ ہو جائے۔ کوئی حاکم یہ نہیں چاہے گا کہ اس کی سرزمین پر اس سے زیادہ مقبولیت کسی اور کو حاصل ہو جائے۔ اسے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس فقیر کی مقبولیت اگر اسی طرح بڑھتی رہی تو خود اس کی حیثیت کم ہو جائے گی۔ بعض لوگوں نے یہ کہہ کر بھی اس کے کان بھرنے شروع کر دیے کہ بابا صاحب اجودھن کے حاکم بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

اخلاق کی شگفتگی اور اوصاف حمیدہ میں ایسی قوت پنہاں ہے جس سے پتھروں کو موم کیا جا سکتا ہے۔ اجودھن کی آبادی تو پھر گوشت پوست کے انسانوں پر مشتمل تھی۔ بابا فرید الدین حسن اخلاق کا ایسا نمونہ تھے کہ آپ کا دشمن بھی انگشت نمائی نہیں کر سکتا تھا۔ جو آپ سے ایک بار مل لیتا، آپ کی نرم گفتاری کا عاشق ہو کر آپ کے پاس سے اٹھتا۔ آپ جب اجودھن میں تشریف لائے تھے لوگ آپ کی طرف سے سہمے ہوئے تھے لیکن جیسے جیسے آپ کے احوال سے واقف ہوتے گئے آپ کے گرویدہ ہو گئے۔ ابتدا میں آپ اور آپ کے ساتھیوں نے درختوں کی چھال اور پتے کھا کھا کر گزارہ کیا لیکن آپ کے حسن اخلاق نے اہل ثروت کو آپ کا مطیع کر دیا۔ ان کی امداد نے اتنی برکت دی کہ آنے والوں کے لیے لنگر جاری ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے انہوں نے اجودھن فتح کر لیا ہے۔

اب انہوں نے اپنی خودی کو ظاہر کرنا شروع کر دیا تھا۔ بعض ایسی کرامات آپ سے ظہور میں آئیں کہ لوگ آپ کے گرویدہ ہو گئے۔ آپ کی گرم بازاری دیکھ کر حاکم اجودھن حسد کی آگ میں جلنے لگا۔ اس نے کئی مرتبہ پیغام بھیجا کہ وہ اجودھن سے چلے جائیں۔ آپ اس کے جواب میں یہی کہتے رہے کہ میں اسلام کی روشنی پھیلانے آیا ہوں۔ اقتدار مجھے یہاں لے کر نہیں آئی ہے لہٰذا حاکم مجھ سے خوف زدہ کیوں ہے۔

یہ جواب سن کر وہ آپ کو اجودھن سے نکالنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ جب کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تو اس نے قاضی شہر کو طلب کر لیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ قاضی بھی بابا فرید سے خوش نہیں ہے۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ فرید کا فتنہ اب بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس کا سدباب ضروری ہو گیا ہے۔"

"میں تو خود اس سے تنگ ہوں۔" قاضی نے کہا۔ "وہی لوگ جو کل تک اپنے فیصلوں کے لیے میرے پاس آتے تھے اس فقیر کے پاس جانے لگے ہیں۔ اس کی اتنی ہمت ہو گئی ہے کہ جمعے کی نماز پڑھنے جامع مسجد میں آنے لگا۔ اس کے ساتھیوں کا گدڑی پوش لشکر اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ لوگ اس کی حمایت کی وجہ سے حکومت کی طرف سے بے خوف ہوتے جا رہے ہیں۔"

"یہ سب تو میں بھی جانتا ہوں۔ مجھے تو یہ بتاؤ کہ اس فتنے کا علاج کیسے کروں۔"

"میں یہی تو عرض کر رہا ہوں کہ ہم اس پر کھلم کھلا ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ ہندو مسلمان سب اس کے حق میں ہو چکے ہیں۔"

"کوئی ایسی ترکیب سوچو کہ وہ خود بخود اجودھن چھوڑ کر چلا جائے۔"

قاضی نے کچھ دیر سرگوشی میں باتیں کیں اور اٹھ کر چلا گیا۔ حاکم کچھ دیر بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلتا رہا اور پھر کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔

urdunovels.com

دوسرے دن حضرت بابا فرید کے کم سن بیٹے عبداللہ کی لاش ملی۔ ان صاحبزادے کی عمر بارہ سال تھی۔ کس نے قتل کیا کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ حاکم اجودھن چونکہ آپ سے پرخاش رکھتا تھا اس لیے مشہور ہو گیا کہ اس قتل میں حاکم کا ہاتھ ہے۔

آپ کے فرزند کو دفن کیا جاچکا تھا۔ غم واندوہ کی فضا تھی۔ ارادت مند آپ کے گرد حلقہ بنائے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد حاکم اجودھن کا تذکرہ نکل آیا۔

"اس نے بزدل دشمن کا کردار ادا کیا ہے۔"

"اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ حضرت اس کے مظالم سے تنگ آکر یہ جگہ چھوڑ جائیں۔"

"اب تو شاید یہ جگہ چھوڑنی ہی پڑے۔"

ارادت مند اپنی رائے پیش کر رہے تھے۔ حضرت بابا فرید الدینؒ سب کی باتیں سن رہے تھے اور صبر واستقامت کا پیکر بنے بیٹھے تھے۔ کبھی کبھی آسمان کی طرف دیکھ لیتے تھے۔

چند ارادت مندوں نے آپ سے درخواست کی۔ "یا حضرت! حاکم اجودھن کے حق میں بددعا فرمایئے تاکہ وہ کیفر کردار کو پہنچے۔"

آپ نے غضب ناک نظروں سے ارادت مندوں کی طرف دیکھا۔ "مسلمان کسی کو بددعا نہیں دیتا۔ پھر جس کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہی دوسروں کو دیتا ہے۔ میں بھی وہی دوں گا جو میرے پاس ہے۔"

حاکم اجودھن آپ کی استقامت پر پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ پل پل کی خبریں اس تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ تو یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ درویش اپنی متاع عزیز کے چھن جانے کے بعد اس کے پاس گڑگڑاتا ہوا آئے گا یا پھر ایک صبح اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں سے رفوچکر ہوجائے گا لیکن وہ اسی طرح ڈٹا ہوا تھا۔

بابا فرید الدینؒ اسی طرح دل وجان سے عبادت میں مصروف تھے۔ مریدوں کی تربیت کر رہے تھے۔ آپ کے بھانجے حضرت علی احمد صابر کی تعلیم مکمل ہوگئی تھی۔ آپ مجذوب تھے۔ جو آپ سے آنکھ ملانا تاب نہ لاسکتا تھا۔

حضرت بابا فرید الدینؒ ان کی مجذوبیت کے باوجود انہیں خلافت دینے کے حق میں تھے۔ اب سوال یہ تھا کہ انہیں تبلیغ کے لیے کس علاقے میں بھیجا جائے۔ کلیر کے علاقے میں تبلیغی کام رکا ہوا تھا۔ بہت پہلے حضرت خواجہ معین الدین

ارشادات

☆ عقل مند وہ ہے جو اللہ تعالیٰ پر توکل کرے اور کسی سے اُمید نہ رکھے۔

☆ زحمت خیریت کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ تکلیف سے گناہ دھل جاتے ہیں۔

☆ اپنے ظاہر سے زیادہ باطن سے واقفیت رکھو۔

☆ دشمن سے بے خوف نہ رہو خواہ وہ شیریں سخن ہی کیوں نہ ہو۔

☆ جو تم سے ڈرتا ہے اس سے تم بھی ڈرو۔

☆ تم جیسے ہو ویسا ہی ظاہر کرو ورنہ تمہاری اصلیت لوگ ظاہر کردیں گے۔

☆ اگر بزرگی چاہتے ہو تو بندگان شاہی سے التفات نہ کرو۔

☆ وہ چیز فروخت نہ کرو جو خریدی نہ جاسکے۔

☆ مہمان سے تکلف کی ضرورت نہیں، مغرور وسرکش سے تکبر کرو۔

چشتیؒ نے اپنے خلیفہ حضرت امام الدین دمشقی کو تبلیغ کے لیے وہاں بھیجا تھا۔ ان کی شہادت کے بعد یہ علاقہ تبلیغ کی روشنی سے محروم چلا آرہا تھا۔ آپ نے حضرت علی احمد صابر کو کلیر کی خلافت کا پروانہ دے کر اجودھن سے رخصت کیا۔

"کلیر جانے سے پہلے ہانسی میں حضرت جمال ہانسوی کے پاس جانا۔ وہ اس خلافت پر مہر لگائیں گے اور اپنے پاس اندراج کریں گے۔ یہی ہمارا ان سے وعدہ تھا۔" آپ نے انہیں رخصت کرتے وقت تلقین کی۔

حضرت علی احمد صابر اجودھن سے نکلے اور کئی روز کے سفر کے بعد حضرت جمال ہانسوی کی خدمت میں پہنچے۔ وہ اتنے دن بعد اچانک انہیں اپنے سامنے دیکھ کر حیران ہوگئے۔ ان کی مجذوبیت کا آپ کو علم تھا۔ یہی سمجھے ہوں گے کہ عالم دیوانگی میں چلے آئے ہیں لیکن جب آپ نے خلافت کا اجازت نامہ ان کے سامنے رکھا تو ان کی حیرانی مزید بڑھ گئی۔ انہوں نے آپ کی طرف دیکھا اور سکتے میں آگئے۔ دل میں خیال گزرا کہ خدا خیر کرے ایسے دیوانے کے ہاتھ میں سند خلافت۔ پھر یہ خیال آیا کہ یہ سوچنا بھی گستاخی ہے کہ مرشد کا انتخاب غلط ہوگا۔ انہوں نے سند خلافت آپ کے ہاتھ سے لے لی اور مہر ثبت کردی۔

"اب چند روز مجھے خدمت کا موقع دیجئے۔ یہاں قیام فرمایئے۔"

"نہیں ہم رک نہیں سکتے۔ ہمیں کلیر پہنچنا ہے۔"

وہ ہانسی سے کلیر کی طرف روانہ ہوئے اور حضرت جمال ہانسوی اپنے مرشد حضرت فرید الدینؒ کی خدمت میں خط لکھنے بیٹھ گئے۔ "شاہد عزت و جبروت کو خلافت دینے کی مسرت ہوئی۔ یہ حضور کا کمال ہے، اور ہماری عزت افزائی ہے۔"

یہ رقعہ حضرت کی خدمت میں پہنچا تو آپ خوشی سے جھوم اٹھے۔ "جی چاہتا ہے جمال پر قربان ہو جاؤں۔ انہوں نے رازِ مشاہکی کو سمجھ لیا۔"

مشاہکی کا پہلو یہ تھا کہ حضرت جمال ہانسوی کی آزمائش کی گئی تھی اور وہ اس آزمائش میں پورے اترے۔ حضرت علی احمد صابر پہلے خلیفہ تھے جن کو خلافت عطا کرنے کے بعد ان کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔

حضرت علی احمد صابر کو کلیر بھیجنے سے پہلے سماع کی محفل منعقد کی گئی۔ حاکم کے جاسوس بھی اس محفل میں موجود تھے۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ بعض اشعار پر آپ وجد میں آ جاتے ہیں اور کھڑے ہو کر جھومنے لگتے ہیں۔

ان جاسوسوں نے یہ پوری کارروائی حاکم کے گوش گزار کر دی۔ حاکم کو ایک اور موقع ہاتھ لگ گیا۔ ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا۔ اس نے ایک خط علمائے ملتان کے نام لکھا تاکہ ان کے فتوے کے بعد اسے حضرت بابا فرید الدین کو اپنے علاقے سے نکالنے کا جواز مل جائے۔

اس خط میں اس نے لکھا تھا کہ اجودھن میں ایک شخص ہے جس کا قیام مسجد میں ہے اور وہ وہاں گانا سنتا ہے اور پھر رقص کرتا ہے۔

اس نے سماع کو گانا اور وجد کو رقص سے تعبیر کر کے علمائے ملتان کو گمراہ کرنا چاہا تھا۔ اس کا خیال تھا یہ علما بغیر سوچے سمجھے آپ کے خلاف فتویٰ دے دیں گے۔

حاکم یہ خط لے کر بذاتِ خود ملتان کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ ہاتھ کے ہاتھ فتویٰ لے کر آ جائے۔ اس نے ملتان کے علما کو جمع کیا اور تحریر ان کے سامنے رکھ دی۔

"اس تحریر کو پڑھ لیں اور اسی کاغذ پر آپ حضرات فتویٰ لکھ دیں۔ پھر میرا کام ہے کہ میں ایسے شخص کو اپنے علاقے سے نکال دوں۔"

علما نے خط کی عبارت کو پڑھا اور پوچھا۔ "اس شخص کا نام کیا ہے جو اس طرح کی حرکتوں میں مبتلا ہے؟"

"آپ کو نام سے کیا غرض ہے؟ آپ تو اس کی حرکتوں کو مدِنظر رکھیں۔" حاکم نے کہا۔

"فتویٰ لکھا جائے گا تو اس میں نام کی ضرورت ہوگی۔"

"آپ صرف اتنا لکھ دیں کہ جو بھی شخص اس قسم کی حرکتیں کرے وہ سزا کا مستحق ہے۔"

"آپ کو نام بتانے میں تکلیف کیوں ہے؟"

حاکم کو یہ خوف تھا کہ کہیں نام سن کر یہ علما فتویٰ دینے سے انکار نہ کر دیں۔ مگر اسے نام بتانا پڑا۔ "وہ شخص اپنا نام فرید الدین بتاتا ہے۔"

"فرید الدین گنج شکرؒ؟" کئی علما نے ایک ساتھ پوچھا۔

آپ کا نامِ نامی سنتے ہی علما کی کیفیت بدل گئی۔ انہوں نے حاکم کو جھڑک دیا۔ "آئندہ ان کا نام ادب سے لینا۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کوئی کام خلافِ شرع نہیں کر سکتے۔"

علما نے حاکم کی تحریر کو پرزے پرزے کر کے ہوا میں اچھال دیا اور شکر بھیجا کہ انہوں نے جلد بازی میں کوئی ایسا فتویٰ نہیں لکھ دیا جس سے آپ کو کوئی نقصان پہنچتا۔

☆☆☆

محمد بن احمد (جو بعد میں نظام الدین اولیاؒ کے لقب سے مشہور ہوئے) بدایوں میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے لہٰذا پرورش کی ساری ذمے داری والدہ محترمہ پر آ گئی تھی۔ ان کی والدہ نے انہیں پڑھنے کے لیے محلے کی مسجد میں بٹھا دیا۔

ان دنوں حضرت بابا فرید الدینؒ کے ایک بھائی بدایوں میں مقیم تھے اور اس مسجد میں اکثر آیا کرتے تھے جہاں نظام الدین اولیا بچپن میں تعلیم کے لیے بٹھائے گئے تھے۔ بابا فرید کے ایک بھائی نجیب الدین متوکل دہلی میں رہتے تھے اور اپنے بھائی سے ملنے بدایوں آتے رہتے تھے۔ یہ دونوں بھائی جب بھی اس مسجد میں جمع ہو جاتے تھے بابا فرید کا تذکرہ نکل آتا تھا۔ گھنٹوں ان کی ریاضت اور کرامات کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیا کی آنکھیں کتاب پر ہوتی تھیں کان گفتگو پر لگے رہتے۔ آپ کے دل پر یہ باتیں اثر انداز ہوتی رہیں۔ آپ چپکے چپکے حضرت بابا فرید الدینؒ کی محبت میں گرفتار ہوتے گئے۔ گھر پہنچ کر والدہ اور ہمشیرہ کے سامنے

UrduPDFs.com

بھی اس گفتگو کا خلاصہ بیان کرتے۔ محبت کی اس چنگاری نے ایسا اثر دکھایا کہ اٹھتے بیٹھتے بابا فرید الدینؒ کا خیال رہنے لگا۔ ذہن خیال میں ہر وقت آپ کا چہرہ مہرہ گردش کرنے لگا حالانکہ انہوں نے بابا صاحب کو کہیں نہیں دیکھا تھا۔ اجودھن کا نام بھی آپ نے اسی گفتگو میں سنا تھا لیکن عمر اتنی چھوٹی تھی کہ آپ وہاں جا نہیں سکتے تھے۔

محبت کی اس آگ میں جلتے ہوئے کئی سال بیت گئے۔ بدایوں میں جتنی تعلیم حاصل کر سکتے تھے حاصل کر لی تھی۔ والدہ نے مزید تعلیم کے لیے آپ کو دہلی بھیج دیا۔ یہاں بابا فرید الدینؒ کے بھائی نجیب الدین متوکل بذات خود موجود تھے۔ آپ فوراً ان کے قدموں میں پہنچ گئے۔ ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اس قربت نے بابا فرید الدینؒ کی محبت کو مزید پروان چڑھایا۔ دہلی میں حضرت بابا فرید الدینؒ نے دس سال کا عرصہ گزارا تھا۔ ان کی یادیں ہر محفل میں آباد تھیں۔ ہر خانقاہ میں ان کا تذکرہ جاری تھا۔ مشائخ کی سانسوں میں ان کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ نظام الدین اولیاؒ جس طرف تشریف لے جاتے بابا صاحب کی ریاضت وعبادت کے قصے سننے کو ملتے۔ آپ کے دل میں غائبانہ محبت کی چنگاری شعلہ بن کر بھڑک گئی لیکن اجودھن جانے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی تھی۔ پھر وہ بھی سوچتے ہوں گے کہ اجودھن جانے سے پہلے رسمی تعلیم مکمل کر لیں۔ ظاہری تعلیم کے بعد ہی باطنی سفر پر روانہ ہوا جائے تو کامیابی ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم تھا کہ حضرت بابا فرید الدینؒ کے مرشد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے انہیں تعلیم وسیاحت کا درس دیا تھا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد ہی آپ کے مراتب میں اضافہ ہوا تھا۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ اپنے وقت کے بہترین علما سے حصول تعلیم میں مشغول تھے۔ دہلی میں علماء ومشائخ کی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے ہر خوشۂ علم سے شراب کشید کی۔

دیدار کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا اور ایک روز ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے۔ آپ بے اختیار ہو گئے۔ دیدار شیخ کے لیے اجودھن پہنچ کر دم لیا۔ حضرت فرید الدینؒ اس وقت مسجد میں تشریف فرما تھے کہ آپ کو بتایا گیا۔ "دہلی سے کوئی طالب علم محمد بن احمد ملاقات کا خواستگار ہے۔"

دہلی کا نام سنتے ہی آپ کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔ مرشد کی یاد آ گئی تھی۔ اس وقت بھی یہی کیفیت ہوئی۔ "میرے مرشد کے شہر سے کوئی آیا ہے۔" آپ نے نعرہ مستانہ بلند کیا۔

ایک نوجوان آپ کے سامنے کھڑا تھا۔ پھر وہ قدموں کی طرف جھکا۔ "محمد بن احمد! تمہاری جگہ قدموں میں نہیں ہے۔ تم تو حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہو۔ آؤ ہم تمہیں سینے سے لگا لیں۔" حضرت فرید الدینؒ نے کہا اور انہیں سینے سے لگا لیا۔ نوجوان کو معلوم ہوا جیسے ان کا سینہ نور سے بھر گیا ہو۔ جیسے وہ اندھیروں سے روشنی میں آ گئے ہوں۔ جیسے جو کچھ پڑھا تھا سب فراموش ہو گیا ہو کسی اور ہی تعلیم کے دروازے کھل گئے ہیں۔

"ہم تو کب سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ بہت دیر لگا دی تم نے۔" حضرت بابا فرید الدینؒ نے فرمایا۔

"تعلیم بھی تو ضروری تھی۔"

"لیکن علم تو یہاں سے ملنے والا ہے۔"

"اسی لیے تو حاضر ہوا ہوں۔"

"حاضر ہوتے رہنا۔"

"حضرت اب میں یہاں سے جانے والا کب ہوں۔"

"نہیں۔ تمہیں جانا ہوگا۔ مشیت ایزدی یہی ہے۔"

"حضور میری تربیت کا کیا ہوگا۔"

"بعد مکانی کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ ہم یہیں بیٹھے بیٹھے تمہاری نگرانی کریں گے۔ ہماری توجہ تمہارے ساتھ رہے گی۔"

آپ نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کا ہاتھ پکڑا اور خانقاہ میں لے گئے۔

اسی دن رسم بیعت ادا ہوئی۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کو حکم ہوا کہ وہ خانقاہ شریف سے باہر نہ نکلیں۔ آپ یکسوئی سے عبادت میں مصروف ہو گئے۔ گویا اب آپ کو تربیت کی ابتدائی منزلوں سے گزارنا مقصود تھا۔ مرشد انہیں مجاہدوں کے مراحل سے گزار رہا تھا۔

دس شب و روز آپ اجودھن میں مقیم رہے۔ پھر حکم ہوا کہ علم کا حصول بھی تو مجاہدہ ہے۔ دہلی جا کر اپنی تعلیم مکمل کریں اور جو وظیفے بتائے گئے ہیں انہیں پڑھتے رہیں۔

آپ اجودھن سے نکلے تو دنیا ہی بدلی ہوئی نظر آئی۔ خالی ہاتھ آئے تھے دامن بھر کر واپس جا رہے تھے۔

صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

آپ مرشد کے حکم سے دہلی آ تو گئے تھے لیکن دل اجودھن میں چھوڑ آئے تھے۔ آتے ہی "وہیں چلیے" کا شور

urdunovels.com

ہونے لگا لیکن مرشد کا حکم یہی تو تھا کہ تعلیم مکمل کرو۔ آپ ایک مرتبہ پھر کتابوں کی ورق گردانی میں مشغول ہو گئے لیکن اب وہ محض طالب علم نہیں تھے راہِ سلوک کے مسافر بھی تھے۔ دن بھر کتابوں سے الجھے رہتے، راتوں کو عبادت کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ مرشد کے بتائے ہوئے وظائف وردِ زباں بنے ہوئے تھے۔

مرشد نے غائبانہ رہنمائی کی اور آپ تیزی سے روحانی منازل طے کرنے لگے۔ دنیا آپ کے حال سے بے خبر تھی۔ یہ ایسی منزلیں تھیں جہاں سے مرشد و مرید کے سوا کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔

بے تابیِ دل ایک مرتبہ پھر بڑھی اور آپ اجودھن پہنچ گئے۔ دل کو قرار آیا۔ آنکھوں کو سکون ملا۔ مرشد سے کچھ اور مشورے ہوئے۔ منزلیں کچھ اور قریب آ گئیں لیکن ایک مرتبہ پھر دور ہونا تھا۔ آپ کو پھر واپس دہلی بھیجا گیا۔ شاید فراق کی لذت سے بھی آشنا کرنا مقصود تھا۔ شمع اجودھن میں روشن، پروانہ دہلی آ گیا۔

بیس سال کی عمر تھی کہ آپ نے اپنی تعلیم مکمل کر لی۔ اب اس ویرانے میں دیوانے کا دل نہیں لگ سکتا تھا۔ کوئی زنجیر پاؤں میں نہیں تھی۔ کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ ایک خیال آیا کہ والدہ کے پاس چلے جائیں۔ پھر خیال آیا طالب علم اپنی تعلیم مکمل کر کے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ میری تعلیم ابھی مکمل ہی کہاں ہوئی۔ تعلیم تو اب شروع ہوئی۔ آپ طویل قیام کے ارادے سے بدایوں کے بجائے اجودھن کی طرف چل دیے۔

استقبال کے لیے بازو کشادہ تھے۔ خانقاہ کا دروازہ کھل گیا۔ حضرت بابا فرید الدینؒ نے آپ کی استطاعت اور شوق کو دیکھتے ہوئے آپ کو تیزی سے روحانی سفر پر گامزن کرنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

حاکمِ اجودھن کی دشمنی مسلسل سفر میں تھی۔ وہ کئی حربے آزما چکا تھا لیکن ہر مرتبہ اسے منہ کی کھانی پڑی تھی۔ وہ ان ناکامیوں سے سبق سیکھنے کے بجائے اور زیادہ دشمنی پر اتر آیا۔ واقعہ ملتان کے بعد تو وہ سانپ کی طرح بل کھانے لگا تھا۔ اب تک وہ صرف آپ کو اجودھن سے نکالنے پر کمربستہ تھا لیکن اب وہ آپ کی جان لینے کے درپے ہو گیا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک ملنگ خرید لیا۔ اس ملنگ کو بھی اس نے یہ بتایا تھا کہ ایک سخت خدا دشمن اجودھن میں موجود ہے۔ اس زمین کو اس کے وجود سے پاک کر دو۔ اس مقصد کے لیے حاکم نے ملنگ کی آنکھوں پر لالچ کی پٹیاں باندھ کر ایک خنجر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

وہ ملنگ ننگا خنجر ہاتھ میں لے کر سیدھا اس جگہ پہنچا جہاں حضرت بابا فرید الدین ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس نے آپ کی خانقاہ کا پتا پوچھا اور خانقاہ میں گھس گیا۔

حضرت بابا فرید الدینؒ نماز ادا کرنے کے بعد دعا کے لیے سجدے کی حالت میں تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ آپ کی خدمت میں حاضر تھے اور ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ نے دیکھا کہ ایک ملنگ چمڑے کے لباس میں ملبوس، کانوں میں بالے ڈالے خانقاہ میں داخل ہوا ہے اور حضرت فرید الدین کی طرف بڑھ رہا ہے۔

اس سے پہلے کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ اس ملنگ سے کچھ پوچھتے یا اس کی نیت بھانپتے، حضرت بابا فرید الدینؒ نے سجدے سے سر اٹھائے بغیر پوچھا۔ ”کیا یہاں کوئی ہے۔“

”یا حضرت! خادم حاضر ہے اور ابھی ایک ملنگ اندر داخل ہوا ہے۔“

حضرت بابا فرید الدینؒ کی آواز پھر آئی۔ ”مولانا! اس ملنگ کے پاس چھری ہے اور یہ درویش کو قتل کرنے کے ارادے سے آیا ہے۔“

یہ سنتے ہی ملنگ لرز اٹھا۔ کسی ان دیکھی طاقت نے اس کی طاقت سلب کر لی تھی۔ وہ نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ جہاں تھا وہیں جم کر رہ گیا تھا۔ اسی عالم میں اسے حضرت بابا فرید الدینؒ کی آواز پھر آئی۔

”مولانا! اسے کہہ دیں کہ یہ درویش کو قتل نہیں کر سکتا۔ میں اسے معاف کرتا ہوں۔ یہ فوراً یہاں سے چلا جائے۔“

کسی کے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ملنگ خود اپنے کانوں سے ساری باتیں سن رہا تھا۔ معافی ملتے ہی جیسے اس کے حواس واپس آ گئے۔ تیزی سے پلٹا اور خانقاہ سے باہر نکل گیا۔

”حضرت! یہ کون تھا اور آپ کو قتل کیوں کرنا چاہتا تھا؟“ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے دریافت کیا۔

”اسے حاکمِ اجودھن نے بھیجا تھا۔ میری موت ابھی مقرر نہیں تھی ورنہ اس غریب ملنگ کو بہت کچھ انعام میں مل جاتا۔ اسی لیے میں نے اسے معاف کر دیا۔“

urdunovels.com

"آپ نے اسے تو معاف کر دیا لیکن آپ حاکم اجودھن کے حق میں بددعا کیوں نہیں کرتے۔ وہ پھر کوئی داؤ چلے گا۔"

"ہمارا شیوہ یہ نہیں کہ کسی کے حق میں بددعا کریں اور وہ بھی اپنی ذات کے لیے۔ خدا خود اس کا بندوبست کر دے گا۔"

آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے اور مقبول ہو گئے۔ کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ حاکم اجودھن آپ کو نقصان پہنچانے کی حسرت لے کر اس دنیا سے اٹھ گیا۔

اب صرف قاضی شہر تھا جو آپ کی دشمنی پر کمربستہ رہتا تھا۔ آپ جب بھی نماز جمعہ کے لیے جامع مسجد تشریف لے جاتے اور لوگ آپ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے تو وہ حسد کی آگ میں جلنے لگتا۔ اس کا زرق برق لباس آپ کی گدڑی کے سامنے شرمندہ ہو جاتا۔ آپ اس سے مصافحے کے لیے آگے بڑھتے اور وہ نفرت سے منہ پھیر لیتا۔ آپ کے چہرے پر تبسم پھیل جاتا۔

ایک بار امام نے نماز پڑھائی تو دوران نماز اس سے غلطی ہو گئی۔ حضرت بابا فرید الدینؒ نے فرمایا نماز دوبارہ ادا کی جائے۔ امام دوبارہ نماز پڑھانا نہیں چاہتا تھا مگر لوگوں کے اصرار پر اسے نماز دہرانی پڑی۔

نماز کے بعد قاضی نے امام کے حق میں بولتے ہوئے بابا فرید الدینؒ کے خلاف بھی زہر اگلا۔ یہ تک کہہ دیا کہ پتا نہیں یہ بے کار قسم کے لوگ کدھر کدھر سے آ کر اجودھن میں جمع ہو گئے ہیں۔ آپ کے ارادت مندوں نے بولنا چاہا تو حضرت نے انہیں خاموش کرا دیا۔ آپ کا صبر و تحمل ضرب المثل بن چکا تھا۔ اس واقعے کے بعد تو ہر شخص کی زبان پر اسی کا ذکر تھا۔ تمام نمازی آپ کے ساتھ تھے۔ دشمن سامنے تھا لیکن آپ نے اس کے خلاف کسی کو بھی ایک لفظ بولنے کی اجازت نہیں دی۔

آپ مسجد سے نکلے اور اپنی خانقاہ میں تشریف لے گئے۔ تمام مرید خاموش اور مؤدب بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک قلندر وہاں آیا۔ وہ کچھ دیر اس سکوت کو ملاحظہ کرتا رہا۔ پھر اس نے آپ کو مخاطب کیا۔

"فرید! یہ تماشا کیسا ہے۔"

"آپ کس تماشے کی بات کر رہے ہیں۔" بابا فرید الدینؒ نے فرمایا۔

"کیا یہ تماشا نہیں ہے کہ خود دیوتا بنے بیٹھے ہو اور لوگوں سے اپنی پرستش کراتے ہو۔"

"میری کیا مجال کہ میں اپنی ذات کو کچھ بناؤں۔ جو کچھ بھی ہوں اللہ نے بنایا ہے۔" آپ نے متانت سے جواب دیا۔

"نہیں تم نے خود اپنی ذات کو بت بنا لیا ہے۔" قلندر زور سے گرجا۔

اس گستاخی کے باوجود آپ کی پیشانی پر ایک بل تک نہیں آیا بلکہ مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ "بالکل نہیں! کوئی انسان اپنے آپ کو کچھ نہیں بنا سکتا۔ ہاں اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنے بندوں میں سرفراز فرما دے۔"

اب قلندر کا مصنوعی غصہ غائب ہو گیا۔ اس نے مسکرا کر آپ کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ "اس صبر و تحمل پر آفرین ہے۔ میں تو دراصل تمہارا امتحان لے رہا تھا۔ مسجد میں میں بھی موجود تھا۔ وہاں میں نے تمہارا صبر و تحمل دیکھا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تمہارا صبر و تحمل قاضی کے خوف سے تھا یا اللہ کے خوف سے۔ یہاں کوئی قاضی نہیں تھا تم چاہتے تو مجھے دھکے دے کر نکلوا سکتے تھے لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ اللہ کرے یہ صبر و تحمل ہمیشہ قائم رہے۔"

آپ نے اس قلندر کو تکریم کے ساتھ اپنے قریب جگہ دی اور مریدوں نے اس کی تواضع کی۔ اسی وقت خبر آئی کہ قاضی پر فالج گرا ہے اور اب اس کا چہرہ بگڑ گیا ہے۔ پھر چند یوم کے بعد یہ خبر آ گئی کہ قاضی کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی ہے۔

نیا حاکم آپ کا پرستار تھا۔ قاضی کی دشمنی سے بھی نجات مل گئی تھی۔ بظاہر سکون ہی سکون تھا۔ آپ کے مریدوں کی تعداد روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔ آپ کی کرامات سے ایک دنیا فیض یاب ہو رہی تھی۔ ارد گرد کے علاقوں سے آ کر لوگ آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو رہے تھے۔ پرانے حاکم کے خوف سے جو اہلِ ثروت آپ کے پاس آتے ہوئے ڈرتے تھے اب بے جھجک آپ کے حلقے میں آنے لگے تھے۔ فتوحات کی کثرت ہوئی تو لنگر بھی شان و شوکت سے جاری ہو گیا۔

☆☆☆

حضرت فرید الدین گنج شکرؒ علیل تھے۔ کسی صورت صحت یابی نہیں ملتی تھی۔ یہاں دواؤں کا تو گزر ہی نہیں تھا۔ یہ سب تو دعاؤں کے لوگ تھے لیکن کوئی دعا دربار قبولیت میں حاضر نہیں ہو رہی تھی۔

urdunovels.com

...ری کے باوجود آپ کے معمولات میں فرق نہیں آیا۔ ...دن جب بدن میں درد شروع ہو گیا تو نماز کے لیے کھڑا ہونا محال ہو گیا۔ آپ نے چند مریدوں کو طلب فرمایا۔ حضرت جمال ہانسوی بھی ہانسی سے اجودھن آئے ہوئے تھے وہ بھی طلب ہوئے۔ آپ نے ان سب کو ہدایت کی کہ فلاں قبرستان میں جائیں اور ان کے لیے دعا کریں۔

مرشد پر جان لٹانے والے یہ پاکیزہ نفوس آپ کی صحت یابی کے لیے کیا نہیں کر سکتے تھے۔ قبرستان کی خاموشی دعاؤں کی آوازوں سے گونجنے لگی۔

اگلی صبح جب یہ حضرات آپ کی خدمت میں پہنچے تو حالت بدستور وہی تھی۔ ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ آپ ان تمام ارادت مندوں سے شاکی تھے۔

"تم لوگوں کی دعاؤں نے اثر نہیں کیا۔ میرے درد کی کیفیت میں تبدیلی نہیں آئی۔"

"حضور، ہم لوگ تو ناقص ہیں۔ ناقص کی دعا کامل کے حق میں مستجاب کب ٹھہرتی ہے۔"

"شاید یہی وجہ ہو۔ اب مجھے ناقصوں کو کامل بنانا ہوگا۔" آپ نے فرمایا اور حضرت نظام الدین اولیا کو اپنے قریب بلا کر وہ عصا عنایت فرمایا جو انہیں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے تبرکات میں ملا تھا۔

"مولانا نظام! میں نے بارگاہ ایزدی میں تمہارے لیے دعا کی ہے کہ تم جو دعا مانگو گے قبول ہوگی۔"

یہ اتنی بڑی خوش خبری تھی کہ شکر گزاری کے طور پر حضرت نظام الدین کی آنکھیں آنسوؤں کے نذرانے پیش کرنے لگیں۔ آپ نے حضرت کے قدم تھام لیے لیکن اس دعا کا اشارہ نہ سمجھ سکے۔

رات ہوئی اور حضرت نظام الدین اولیا مصروف عبادت ہوئے تو اس نعمت کا خیال آیا جو آپ کو عطا کی گئی تھی۔ آپ کو خیال آیا کہ بابا فرید نے ان کے حق میں دعا فرمائی ہے کہ وہ جو دعا کریں گے قبول ہوگی تو کیوں نا آپ کی صحت یابی کے لیے دعا کی جائے۔ آپ نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیے۔ رات بھر آپ بارگاہ ایزدی میں دعا گو رہے۔ صبح ہوئی تو آپ مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت بابا فرید الدین مصلے پر قبلہ رخ بیٹھے تھے۔ آپ کا چہرہ انور ہشاش بشاش تھا۔ تکلیف کے آثار تک نہیں تھے۔

"حضرت اب کیسی طبیعت ہے؟"

"میں نے تمہارے حق میں جو دعا کی تھی اللہ نے اسے شرف قبولیت بخشا اور تم نے جو میرے لیے دعا کی تھی اللہ نے وہ بھی منظور کی۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔" آپ نے فرمایا اور جس مصلے پر آپ بیٹھے ہوئے تھے بطور انعام حضرت نظام الدین اولیا کو دے دیا۔

آپ کی ان عنایات بے پایاں نے ظاہر کر دیا تھا کہ آپ حضرت نظام الدین اولیا کو خلافت عطا کرنے والے ہیں۔ بزرگ جب تبرکات تقسیم کرتے ہیں تو اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔

سب انتظار میں تھے کہ دیکھیے کیا ظہور میں آتا ہے۔ حضرت جمال ہانسوی واپس تشریف لے جا چکے تھے کہ ایک روز حاضری کا حکم ہوا۔ حضرت نظام الدین اولیا مرشد کے حضور حاضر ہوئے۔

"محمد بن احمد! اب تمہیں دہلی جانا ہوگا۔"

"میں تو آپ کے قدموں میں رہنے کے لیے یہاں آ کر بیٹھا تھا۔"

"تم پوشیدہ رہنے کے لیے نہیں بنے ہو۔ تم سورج کی طرح چمکو گے۔ تمہیں ایک بڑے آسمان کی ضرورت ہے۔"

"جو آپ کا حکم۔ لیکن میرے حق میں دعا فرمایئے کہ جب تک رہوں کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔"

"آؤ ہم دونوں بارگاہ ایزدی میں دعا کرتے ہیں۔"

دعا کے لیے ہاتھ اٹھے۔ حضرت بابا فرید الدین نے قبولیت کا یقین بھی دلا دیا۔ آپ مطمئن ہو کر اجودھن سے نکلے اور ہانسی پہنچ گئے جہاں حضرت جمال ہانسوی کے پاس اپنے نام کا اندراج کرانا تھا۔ یہاں سے آپ دہلی تشریف لے گئے۔ یہاں حضرت منتخب الدین موجود تھے۔ جنہوں نے سند خلافت کی تصدیق کی۔ اب آپ کو شریعت و طریقت کے فروغ کے لیے دہلی میں قیام کرنا تھا۔

ابھی آپ کو دہلی گئے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ بابا فرید الدین سخت علیل ہو گئے۔ بھوک بالکل ختم ہو گئی۔ زندگی کا دارومدار صرف چند گھونٹ پانی پر رہ گیا۔ تمام قابل طبیبوں نے علاج کر کے دیکھ لیا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آپ کو کیا بیماری ہے۔ جب ہر طرف سے مایوسی ہو گئی تو آپ کے صاحب زادوں اور مریدوں کو یہ گمان گزرنے لگا کہ شاید آپ کا آخری وقت آ گیا ہے۔ تمام خلفا کو جو دور دراز کے علاقوں میں بھیج دیے گئے تھے بلا لیا گیا۔

آپ جب بھی بیمار ہوتے تھے ارادت مندوں سے دعا کے لیے فرماتے تھے لہٰذا تمام خلفا و مریدین بارگاہ الٰہی میں

بھی رخصت ہو گئے۔ اسی شب آپ کے صاحبزادے حضرت بدرالدین سلیمان کچھ دیر کے لیے بستر آرام پر تشریف لے گئے۔ قدرت کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ آپ کی آنکھوں میں نیند بھر گئی۔ خواب دیکھا کہ والد گرامی پر ایک جادوگر شہاب کے بیٹے نے جادو کر رکھا ہے۔ خواب ہی میں آپ کو کچھ کلمات سکھائے گئے کہ اگر ان کلمات کو شہاب جادوگر کی قبر پر پڑھا جائے تو اس کے بیٹے کا جادو کا اثر زائل ہو جائے گا۔ آپ نے خواب ہی میں ان الفاظ کو از بر کر لیا۔

شہاب ایک جادوگر تھا جو مر چکا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنا سحر اپنے بیٹے کو سکھا دیا تھا جس نے اس سحر سے حضرت بابا فرید الدین کو تکلیف میں مبتلا کر دیا تھا۔ خواب میں اسی کی بشارت ہوئی تھی۔

آپ خواب سے بیدار ہوئے تو سیدھے بابا فرید کے بستر علالت پر پہنچے اور خواب انہیں سنایا۔ آپ نے حضرت نظام الدین اولیا کو طلب فرمایا اور حکم دیا کہ وہ ان کلمات کو یاد کر لیں اور شہاب جادوگر کی قبر پر جا کر پڑھیں۔

حضرت نظام الدین اولیا نے لوگوں سے شہاب ساحر کی قبر دریافت کی اور قبر پر تشریف لے گئے۔ یہ قبر پختہ تھی البتہ سرہانے کی طرف مٹی تھی۔ آپ وہیں بیٹھ گئے کلمات ادا کرتے ہوئے مٹی میں ہاتھ مارا تو ہاتھ اندر چلا گیا۔ آپ کے ہاتھ سے کوئی سخت چیز ٹکرائی۔ آپ نے مٹی کرید کر اسے نکالا تو آٹے کا بنا ہوا پتلا تھا جس کے اردگرد بال لپٹے ہوئے تھے اور سوئیاں پیوست تھیں۔ آپ اس پتلے کو لے کر مرشد کے پاس آ گئے۔

"حضرت آٹے کا یہ پتلا مجھے قبر کے اندر سے ملا ہے۔ مجھ میں نہیں آتا کہ اب اس کا کیا کروں کیونکہ خواب میں اس کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔"

"اس پتلے کے بال کھول دو اور سوئیاں نکال دو۔" آپ نے فرمایا۔

جیسے ہی سوئیاں نکالی گئیں حضرت بابا فرید الدین کے چہرے سے تکلیف کے آثار غائب ہو گئے۔ بعد میں پتلا، بال اور سوئیاں ندی میں بہا دیے گئے۔

یہ واقعہ ہی ایسا تھا کہ اجودھن میں اس کی شہرت ہو گئی۔ سب پر یہ ظاہر ہو گیا کہ یہ حرکت شہاب ساحر کے بیٹے کی ہے۔ اب مشکل تھا کہ وہ اجودھن میں رہتا۔ وہ بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا کہ لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور حاکم کے حوالے کر دیا۔

"یہ ہمارا نہیں بابا صاحب آپ کا مجرم ہے۔ ہم اسے آپ کی بارگاہ میں لے جاتے ہیں وہ جس انداز کی موت چاہیں گے اسے دی جائے گی۔"

حاکم گھوڑے پر سوار ہوا۔ سپاہیوں نے اس لڑکے کو ساتھ لیا اور حضرت بابا فرید الدین کے پاس پہنچ گئے۔

"یہ آپ کا مجرم ہے۔ آپ ہی فرمائیں اسے کیا سزا دوں۔"

"ہرگز نہیں۔ یہ اب کسی سزا کا مستحق نہیں۔" آپ نے فرمایا۔

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ اس نے آپ کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔"

"اللہ نے مجھے صحت یاب کر دیا ہے میں اسے معاف کرتا ہوں۔"

آپ کا یہ کہنا تھا کہ وہ لڑکا جو اپنی موت کو یاد کر چکا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔ آپ کے قدموں پر گر گیا اس نے عہد کیا کہ اب وہ کبھی جادو نہیں کرے گا۔

ایک ایک کر کے تمام کانٹے نکل چکے تھے۔ نیا حاکم اجودھن مہربان تھا۔ اہل ثروت آپ کی دعائیں لینے آتے تھے۔ ہندو مسلمان آپ کے عقیدت مند تھے۔ ایک وقت وہ تھا کہ گھاس پھوس کھا کر گزارہ ہوتا تھا۔ کوئی بات پوچھنے والا بھی نہیں تھا لیکن آپ نے استقامت کی وہ شمع روشن کی کہ اجودھن کا بت کدہ مقدس زیارت گاہ بن گیا۔ آپ کی غذا اب بھی بے نمک کی ترکاری تھی لیکن آپ کے دروازے سے ہزاروں بھوکوں کو کھانا مل رہا تھا۔ آپ کے تربیت یافتہ خلفائے ۔۔۔ حق ہندوستان بھر میں پھیل کر اسلام کا چراغ روشن کر رہے تھے۔

جب آپ نے اس دشت میں قدم رکھا تھا ویرانی کے سوا یہاں کچھ نہیں تھا مگر اب یہ حال تھا کہ ہر وقت پروانوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔

طائر وقت تیزی سے پرواز کر رہا تھا۔ زندگی بھر کی جدوجہد کمال عروج پر پہنچ چکی تھی۔ جس مقصد کا آغاز ملتان سے ہوا تھا اس کا اختتام اجودھن میں ہو رہا تھا۔

محرم الحرام کا پانچواں روز تھا۔ آپ دن بھر تلاوت فرماتے رہے۔ آپ کی آواز میں ایسا سوز اس سے پہلے کسی نے محسوس نہیں کیا تھا۔ شام ہوئی تو ذکر میں مشغول ہو گئے۔ ذکر سے فارغ ہوئے تو مغرب کا وقت ہونے لگا تھا۔

"اب تم جاؤ۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔ بلانے پر آجانا۔"

آپ نے اس طرح ٹھہر ٹھہر کر کہا جیسے حاضرین کو ایک ایک لفظ کی تفہیم کرا رہے ہوں۔

مغرب کا وقت گزر گیا۔ عشا کی نماز ادا ہو گئی۔ خانقاہ سے کوئی آواز نہ آئی۔ چند معتبر مریدوں کو تشویش ہوئی۔ اندر آنے کی اجازت طلب کی گئی لیکن اندر مکمل خاموشی تھی۔ آپ نے فرمایا تھا، بلانے پر آنا اس لیے کسی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ خانقاہ کے اندر قدم رکھے۔ آخر صاحبزادے نے ہمت کی۔ چند اور لوگ ساتھ ہوئے کسی نے خانقاہ کے اندر جھانک کر دیکھا۔ آپ پر غشی طاری تھی یا عالم محویت میں تھے۔ قدموں کی چاپ سنی تو آنکھیں کھول دیں۔

"کیا میں نے نماز پڑھ لی؟"

"آپ نماز ادا فرما چکے ہیں۔" جواب آیا۔

"اگر دوبارہ پڑھ لوں تو کیا مضائقہ ہے۔"

یہ کہہ کر باوجود نقاہت اور جوڑوں کے درد کے آپ نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے۔ نماز کی ادائیگی کے بعد پھر محویت طاری ہوئی۔ تین مرتبہ یہی صورت پیش آئی۔ پھر آپ نے بہ آواز بلند اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعلان کیا۔

"یا حی یا قیوم"

اس اعلان کے بعد کسی اعلان کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر محویت طاری ہوئی لیکن اس مرتبہ ہوش میں آنے کے لیے بے ہوش نہیں ہوئے تھے۔ آپ نے جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔

☆☆☆

ایک سوار تیزی سے اجودھن کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اپنی منزل تک پہنچنے کی جلدی تھی لیکن ناہموار راستہ اس کی بے تابی کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔ اسے اپنی بے تابی کی وجہ خود بھی معلوم نہیں تھی۔ بس وہ تو کسی کے روانہ ہونے سے پہلے پہنچنا چاہتا تھا۔

رات کے اندھیرے کو چیرتا ہوا وہ سوار اجودھن کی فصیل تک پہنچا تو شہر کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ اس نے بہت کوشش کی لیکن پہرے دار دروازہ کھولنے کو قطعی تیار نہیں تھے۔

"آپ رات یہیں گزاریں۔ صبح دروازہ کھلے گا تو شہر میں داخل ہونا۔"

"میں دہلی سے چلا آ رہا ہوں۔ مجھے بابا فرید الدین گنج شکر سے ملنا ہے۔"

"ان سے تو سب ہی ملتے ہیں۔"

"میں ان کا خلیفہ خاص محمد بن احمد ہوں۔"

"کوئی بھی ہو۔ دروازہ نہیں کھلے گا۔"

یہ حضرت نظام الدین اولیاؒ تھے جن کی شفاف روح میں یہ عکس ابھر آیا تھا کہ کوئی حادثہ رونما ہونے کو ہے لہٰذا وہ فوراً اجودھن کی طرف روانہ ہو گئے تھے لیکن یہ روایت یہاں بھی ادا ہو رہی تھی۔ حضرت معین الدین چشتیؒ کے وصال کے وقت حضرت بختیار کاکیؒ غیر حاضر تھے۔ حضرت بختیار کاکیؒ کے وصال کے وقت بابا فرید الدینؒ موجود نہیں تھے اور اب حضرت بابا فرید الدینؒ پردہ فرما چکے تھے اور حضرت نظام الدینؒ شہر کی فصیل کے باہر دن نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔

صبح ہوئی اور وہ شہر میں داخل ہوئے تو پورا شہر غم واندوہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ حضرت بابا فرید الدین کا جنازہ تدفین کے لیے تیار تھا۔ اب آپ کی سمجھ میں آیا کہ پہنچنے کی جلدی کیوں تھی۔ وہ بابا جی انتظار بھی نہیں کیا۔ آپ کی آنکھیں اس دائمی جدائی کے صدمے سے چھلکنے لگیں۔

حضرت بابا فرید الدینؒ کے صاحبزادگان آپ کی تدفین کا انتظام شہر سے باہر قبرستان شہدا میں کر چکے تھے لیکن حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اس خیال سے اختلاف کیا۔

"اگر آپ کی قبر مبارک شہر سے باہر بنا دی گئی تو زائرین وہیں سے فاتحہ پڑھ کر چلے جایا کریں گے۔ آپ کے صاحب زادوں کے پاس کوئی بھی نہیں آئے گا۔"

"پھر کہاں دفن کیا جائے؟"

"آپ کو اس حجرے میں دفن کیا جانا چاہیے جہاں آپ عبادت وریاضت میں مشغول رہا کرتے تھے۔"

اس تجویز کو سب نے پسند کیا اور آپ کو اس حجرے میں دفن کر دیا گیا۔ لحد کے لیے کچی اینٹیں حضرت بابا فرید الدینؒ کے مکان سے لائی گئیں اور یوں ایک کچا مقبرہ تعمیر ہو گیا۔ سب بھائیوں سے مشورہ کرنے کے بعد آپ کے صاحب زادے بدر الدین سلیمان کو سجادہ نشین بنا دیا گیا۔

کچی اینٹوں کا یہ مقبرہ رفتہ رفتہ شاندار روضے میں تبدیل ہو گیا۔ کتنے ہی فیاض ہاتھ حرکت میں آئے اور مختلف عمارتیں تعمیر ہوتی چلی گئیں۔ بادشاہان وقت اس روضے پر پیشانی جھکانے کے لیے آتے رہے۔ امیر تیمور جب ہندوستان آیا تو آپ کے مزار مبارک پر حاضر ہوا۔ اکبر اعظم ایک معمولی آدمی کی طرح نیاز مندانہ آپ کے مزار پر حاضر ہوا اور اجودھن کا نام پاک پتن تجویز کیا۔ اس نام کو ایسی مقبولیت نصیب ہوئی کہ آج تک یہ مقام اسی نام سے موسوم ہے۔

☆☆☆

تین شاعر ایک خیال

الوار احمد

خیالوں کی چوری یا ٹکرا جانا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ساحر، فراز اور مسرور انور تینوں شعرا نے ایک ہی خیال کو باندھا ہے۔ کیا یہ ادبی سرقہ کہلائے گا؟

اردو ادب کے پرستاروں کی مدارات

ساحر لدھیانوی، احمد فراز اور مسرور انور، اپنے عہد کے بے مثال شاعر تھے جنہوں نے روایتی شاعری کے علاوہ فلمی شاعری میں بھی خوب نام کمایا۔ یہ سب اپنی اپنی جگہ ایک عہد ساز شخصیت تھے۔ میری اس تحریر کا مقصد کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ہرگز نہیں بلکہ ان تینوں کے خیالات کا اظہار ایک ہی موضوع پر پیش کرنا ہے، جس سے اختلاف ممکن ہے۔

فراز کی نظم ”پیغام بر“ واقعی کمال ہے اور آج کے تناظر میں پوری اترتی ہے۔ فراز کی شاعری ہمیشہ سے ہر دل سے

...رہی، خاص طور سے ان کی نظم "محاصرہ" آمریت کے دور میں لکھا جانے والا ایک انقلابی پیغام ہے۔ اسی طرح ان کی بے شمار غزلیں نہ صرف رومان انگیز ہیں بلکہ عہد حاضر کی سماجی دشواریوں، طبقاتی جدوجہد اور فکری جمود پر بھی کاری وار کرتی نظر آتی ہیں۔

میں نے فراز کی نظم "پیغام بر" پڑھی اور یہ بات بہت دیانت داری سے کہوں گا کہ یہی موضوع اور قریباً یہی بات، اسی زمین میں ساحر لدھیانوی برسوں پہلے اپنی کئی نظموں اور غزلوں میں کر چکے تھے۔ فراز نے اپنی نظم پیغام بر میں "ریت کے ٹیلوں" اور "سایہ ابرِ گریزاں" کی اصطلاح کو اس طرح استعمال کیا۔

ریت کے تپتے ہوئے ٹیلوں پہ ایستادہ ہو تم
سایہ ابرِ رواں کو دیکھتے رہنا تمہارا جزوِ دیں

اسی موضوع اور انہی اصطلاحات کو ساحر نے کس انداز سے اپنے ایک شعر میں رقم کیا۔

ریگزاروں میں بگولوں کے سوا کچھ بھی نہیں
سایہ ابرِ گریزاں سے مجھے کیا لینا

فراز نے "پیغام بر" میں کہا۔

من و سلویٰ کے لیے دامن کشا
قحط خوردہ زار و بیمار و حزیں

ساحر نے یہی بات برسوں پہلے اس طرح کی تھی۔

من و سلویٰ کا زمانہ جا چکا
بھوک اور آفات کی باتیں کریں

میرے کہنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ میں کسی بھی طور فراز کو ادبی سرقے کا مرتکب ٹھہراتا ہوں۔ اکثر شاعر دوسرے شاعر کے خیالات اور موضوع سے متاثر ہو کر اسی زمین میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسا اساتذہ کی شاعری میں بھی ہوا ہے، لیکن یہ بات بھی ضرور کہوں گا کہ فراز کی بہت سی نظموں اور غزلوں میں ساحر کا رنگ ضرور نظر آتا ہے۔

ادبی سرقے کی ایک بڑی مثال فلمی گیت نگار سرور انور کا مشہور گانا، جو فلم "دوراہا" میں شامل تھا اور اسے مرحوم احمد رشدی نے کیا خوب گایا اور بہت ہٹ بھی ہوا۔ اس کے چند بول کچھ اس طرح تھے۔

جب پیار میں دو دل ملتے ہیں میں سوچتا ہوں
ان کا بھی کہیں مجھ جیسا ہی انجام نہ ہو
ان کا بھی جنوں ناکام نہ ہو

سرور انور نے اس گیت میں ساحر کی پوری لائن اور مصرعے ہی ٹانک دیے، جو میرے نزدیک یقیناً ادبی خیانت کے زمرے میں آتا ہے۔ اب دیکھیں ساحر نے اسی خیال کو اپنی ایک طویل نظم "پرچھائیاں" میں کس خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔

سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے
چاہت کے سنہرے خوابوں کا انجام ہے اب تک یاد مجھے
آج جب ان پیڑوں کے سائے میں پھر دو سائے لہرائے ہیں
پھر دو دل ملنے آئے ہیں، میں سوچ رہا ہوں
ان کا بھی اپنی طرح انجام نہ ہو، ان کا بھی جنوں ناکام نہ ہو
ان کے بھی مقدر میں لکھی اک خون میں لتھڑی شام نہ ہو
سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے

ساحر کی نظم "پرچھائیاں" اردو ادب، خاص طور پر ترقی پسند ادب کا سرمایہ ہے، جو جنگِ عظیم دوم کے پس منظر میں لکھی گئی۔ جب ہندوستانی جوان، گورا فوج میں بھرتی ہو کر بدیس جا رہے تھے۔ ایک ایسے سفر پر جہاں سے واپسی کم کم ہی ہوتی۔ ان کبرو جوانوں کے جانے کے بعد جو افتاد ان کی بستیوں، کھلیانوں اور سماج پر پڑی اور جب نوخیز بچیوں کی عزت سرِعام نیلام ہونے لگیں تو حساس شاعر تڑپ اٹھا اور اس نے جنگ اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تباہ کاریوں کا جو نقشہ کھینچا وہ امن پسند تحریک کا ترانہ بن گیا۔

پرچھائیاں ایک بے حد دل گداز، رومان انگیزی کے ساتھ معاشرتی جبر اور غربت و افلاس، قحط اور بے روزگاری کی کچھ اس طرح کی تصویر پیش کرتی ہے کہ پڑھنے والا غیر محسوس طریقے سے، شاعر کے ساتھ اس کرب میں از خود شامل ہو جاتا ہے۔ ساحر نے "پرچھائیاں" میں اپنے قلم کو ایک مصور کے برش میں تبدیل کر دیا اور حالات کے کینوس پر ایسی منظر کشی کی کہ پڑھنے اور دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ساحر نے جنگ سے پہلے کی منظر کشی، کتنے کومل انداز میں کی اور اس میں ہمارے دیہاتی معاشرے کی کیسی عکاسی کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

وہ لمحے کتنے دل کش تھے
وہ گھڑیاں کتنی پیاری تھیں
وہ سہرے کتنے نازک تھے
وہ لڑیاں کتنی پیاری تھیں
بستی کی ہر اک شاداب گلی
خوابوں کی جزیرہ تھی گویا

ساحر کے اس قطعہ میں رومانویت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔

بکھرے پلنگ پہ بکھری ہوئی کتابوں کو
ادائے عجز و کرم سے اٹھا رہی ہو تم
سہاگ رات جو ڈھولک پہ گائے جاتے ہیں
دبے سروں میں وہی گیت گنگنا رہی ہو تم

اور پھر اچانک مغرب میں طبل جنگ بج اٹھا، اور دوسری جنگ عظیم اپنی تمام تر ہولناکیوں کے ساتھ دنیا پر مسلط کر دی گئی۔ حالات بدلے تو ساحر کی نظم کا منظر نامہ بھی تبدیل ہوا۔ ساحر کا کمال ہے کہ انہوں نے اپنی نظم کو ایک کہانی کی طرح بیان کیا اور وہ اکثر فلیش بیک میں چلے جاتے ہیں، جیسے کوئی اپنے بیتے دنوں کو بس یونہی یاد کر لیتا ہو۔ لیکن فوراً وہ ایک جھرجھری لے کر دوبارہ اسی وحشت و بربریت کے موضوع پر آجاتے ہیں اور پھر ایک ماہر جراح کی طرح حالات کی کچھ ایسی نشتر زنی کرتے ہیں کہ سامراجی قوتوں اور استعمار کا مکروہ چہرہ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

جنگ عظیم دوم کے شروع ہوتے ہی پر امن بستیوں پر وحشت اور بربریت کے مہیب سائے لہرانے لگے۔ اسے ساحر نے محسوس کیا اور کس خوب صورتی سے بیان کیا۔

ناگاہ لہکتے کھیتوں سے ٹاپوں کی صدائیں آنے لگیں
بارود کی بوجھل بو لے کر پچھم سے ہوائیں آنے لگیں
تعمیر کے روشن چہرے پہ تخریب کا بادل پھیل گیا
ہر گاؤں میں وحشت ناچ اٹھی ہر شہر میں جنگل پھیل گیا

اور پھر جب جنگ کی وجہ سے معاشی بدحالی نے قحط کی شکل اختیار کر لی تو شاعر نے اپنے خیالات کو ان الفاظ میں بیان کیا۔

دھول اڑنے لگی بازاروں میں، بھوک اگنے لگی کھلیانوں میں
ہر چیز دکانوں سے اٹھ کر، روپوش ہوئی تہہ خانوں میں
بدحال گھروں کی بدحالی، بڑھتے بڑھتے جنجال بنی
مہنگائی بڑھ کر کال بنی، ساری بستی کنگال بنی
افلاس زدہ دہقانوں کے، ہل بیل بکے، کھلیان بکے
جینے کی تمنا کے ہاتھوں، جینے کے سب سامان بکے
کچھ بھی نہ رہا جب بکنے کو، جسموں کی تجارت ہونے لگی
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں۔

اسی طرح بنگال میں "مصنوعی قحط" پڑا۔ ساری اجناس اور پیداوار، جنگی محاذوں پر بھیج دی گئیں، جس کے نتیجے میں لاکھوں انسان لقمۂ اجل بنے تو ساحر چیخ اٹھا۔

پچاس لاکھ فسردہ گلے سڑے ڈھانچے

نظام زر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

جنگ کے دوران میں ساحر نے گھر گھر موت کو ناچتے دیکھا اور کہہ اٹھا۔

تمہارے گھر میں قیامت کا شور برپا ہے محاذ جنگ سے ہرکارہ تار لایا ہے
کہ جس کا ذکر تمہیں جان سے پیارا تھا وہ بھائی نرغۂ دشمن میں کام آیا ہے

شاعر کی محبوبہ بھی زمانے کے ہاتھوں رسوا ہوئی۔ اس کی بھی عصمت بہت سی دوسری دوشیزاؤں کی طرح تار تار ہوئی تو اس کے لہجے کی تلخی مزید بڑھ گئی۔ وہ شکوہ کرتا تو کس سے۔ بس اپنی بے بسی پر یہی کہہ پایا۔

تم آ رہی ہو سر عام بال بکھرائے
ہزار گونہ ملامت کا بار اٹھائے ہوئے
ہوس پرست نگاہوں کی چیرہ دستی سے
بدن کی جھینپتی عریانیاں چھپائے ہوئے

لیکن ان تمام آلام کے باوجود شاعر مایوس نہیں ہوا، اور آنے والی نسل کے لیے یوں دعا گو ہوتا ہے۔

ہمارا پیار حوادث کی تاب لا نہ سکا
مگر انہیں تو مرادوں کی رات مل جائے
ہمیں تو کشمکش مرگ بے اماں ہی ملی
انہیں تو جھومتی گاتی حیات مل جائے

پچھلی جنگ کی تباہ کاریوں کو دیکھ چکنے کے بعد ساحر کو ایک ان جانے خوف نے آلیا۔ وہ آئندہ لڑی جانے والی جنگ کی ممکنہ ہولناکیوں سے دنیا کو خبردار کرتا ہے۔

کہو کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے
تو اس دمکتے ہوئے خاکداں کی خیر نہیں
جنوں کی ڈھالی ہوئی ایٹمی بلاؤں سے
زمیں کی خیر نہیں آسماں کی خیر نہیں

ساحر، فراز اور گیت نگار مسرور انور پر میری یہ تحریر ایک تقابلی مضمون تصور کی جا سکتی ہے اور اس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ساحر اور فراز، اردو ادب کا سرمایہ ہیں جب کہ مسرور انور کا مقام ادب میں کہیں بہت پیچھے ہے، مگر ان کی فلمی شاعری سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

بدقسمتی سے ہمارے یہاں فلم انڈسٹری زوال پذیر ہوئی اور اس کے ساتھ فلمی شاعری بھی، اور پھر اتنی گری کہ گیت کے نام پر لچر اور بے ہودہ تک بندی، جیسے "آ سینے نال لگ جا ٹھاہ کر کے" سن کر بھی کسی کو سمع خراشی کی شکایت نہیں ہوئی۔

کیا یہ ادبی زوال نہیں؟

☆☆

جان بچا

زین مہدی

حادثات کی روداد ایک الجھی کہانی کو جنم دیتی ہیں۔ اس کی زندگی تو حادثات و واقعات کا مجموعہ بن گئی تھی کہ جہاں بھی جاتا حادثات تعاقب میں رہتے۔ وہ ان پہ در پہ رونما واقعات کے گرداب سے نکلنا چاہتا تھا۔ لوٹ کر وطن آنا چاہتا تھا لیکن راہ نہیں مل رہی تھی۔

لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی لہو رنگ روداد کا اٹھارہواں حصہ

urdunovels.com

نئے پڑھنے والے یہاں سے شروع کریں

زارا مہرو سندھ کے تپتے ریگستان کا باسی تھا مگر اسے ہریالی پسند تھی۔ وہ سرسبز علاقوں کو دیکھنے شرقی پاکستان پہنچا تھا کہ سقوط ڈھاکا کا المیہ رونما ہو گیا۔ ادھر فوج اور مکتی باہنی پاکستان کی حمایت کرنے والوں کا قتل عام کرنے لگی۔ وہ جان بچانے کے لیے دریا کنارے بنے ایک گھر میں پناہ لیے ہوئے تھا کہ اس گھر کو مکتی باہنی نے گھیر لیا۔ فائرنگ شروع ہوئی تو گھر والوں نے دریا میں چھلانگ لگا کر فرار کی راہ منتخب کی۔ وہ بھی

دریا میں کود گیا۔ دریا میں گرنے سے وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسے ہوش آیا تو وہ انڈیا کے سرحدی قصبہ بن گاؤں کے ایک گھر میں تھا۔ ریکھا نامی لڑکی نے بتایا کہ وہ اس کا بھیا (بھوئی) آنند ہے جسے ملاحوں نے دریا میں بہتے ہوئے پایا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے ایک تاجر سے تنویر احمد کی ملاقات ہوئی جس نے کہا کہ وہ اس کا دوست ہے۔ تنویر احمد اس دوست کے گھر میں بیٹھا تھا کہ مقامی غنڈے آ گئے۔ غنڈوں نے اس شخص پر ہاتھ اٹھایا تو تنویر احمد کو غصہ آ گیا۔ ابھی غنڈوں کے جانے سے پہلے اس نے ایک غنڈے کو قتل کر دیا۔ جانے سے پہلے اس نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ غنڈوں کی تنظیم اسے چھوڑے گی نہیں۔ وہ تاجر کے ساتھ کلکتہ آ گیا۔ وہیں اس کی ملاقات تیز طرار نوجوان سے ہوئی۔ وہ اسے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں برابر والے گھر میں ایک خواجہ فروش کی بیوی کو مقامی غنڈے کا لوسیاں نے اغوا کر لیا۔ یہ سن کر وہ بہت غنڈے کے اڈے پر جا کر ان کی پٹائی کی اور عدیل کی بیوی کو چھڑا لایا۔ پھر غنڈوں کے سردار گمنام کو پتا چلا تو اس نے بن گاؤں کے جس گھر میں تنویر احمد آنند بن کر رہ رہا تھا اس گھر کی لڑکی ریکھا جو اسے اپنا بھیا (بھوئی) کہتی تھی وہ آ گئی۔ اس نے بتایا کہ غنڈوں کی تنظیم کے بندے کو قتل کیا اس کا بدلہ لینے کے لیے غنڈوں نے اس کے پورے گھر کو قتل کر دیا۔ وہ اکیلی زندہ بچ گئی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ تنویر احمد عرف آنند اپنے دوست تاجر کے گھر میں ہو گا اسی لیے وہ کلکتہ آ گئی۔ مقامی غنڈوں نے ریکھا کو آنند (تنویر) کے پاس پہنچا دیا۔ مخالف گروہ کے غنڈے اس کی جان کے درپے تھے۔ گمنام نے خبر دی کہ عدیل کے پورے گھرانے کو قتل کر دیا ہے۔ صرف عدیل کی سالی زندہ ہے۔ رشیدہ کو بھی تنویر احمد کے پاس پہنچا دیا گیا۔ اسی دوران گمنام کو خبر ملی کہ کلکتہ کی سی آئی ڈی تنویر احمد کو گرفتار کرنے والی ہے۔ اس نے مشورہ دیا کہ وہ شہر کی حدود سے نکل جائے۔ وہ ریکھا، رشیدہ اور احسن اقبال کے ساتھ ایک دوسرے شہر آ گیا مگر وہاں بھی خطرہ محسوس ہوا تو وہ اقبال کے مشورے پر ایک دوسرے شہر بہرام پور آ گیا۔ وہاں سے وہ سب لکھنؤ پہنچے تو رشیدہ، ریکھا اور اقبال کے ساتھ سینما میں فلم دیکھنے گئی تھی پر اسرار انداز میں غائب ہو گئی۔ تنویر احمد کو شک تھا کہ رشیدہ کے اغوا میں کیسینو والوں کا ہاتھ ہے۔ وہاں اسے وہ لڑکا بھی نظر آیا جو ریکھا کے پیچھے نظر آیا تھا۔ باہر آ کر تنویر احمد اور اقبال کھڑے ہو گئے جیسے ہی لڑکا باہر آیا اسے بے ہوش کر کے تنویر احمد اور اقبال لے جا رہے تھے کہ پولیس نے گھیر لیا۔ ان سے جان بچا کر تنویر احمد بھاگ رہا تھا کہ ایک کار والے نے اسے اپنی کار میں بٹھا لیا۔ بعد میں کار والے نے بتایا کہ وہ شہر کا مشہور غنڈا ہے۔ وہ ایک دوسرے غنڈے رستوگی کا مد مقابل ہے۔ وہ رشیدہ کو رستوگی کے چنگل سے چھڑا سکتا ہے اس کے لیے تنویر احمد کو اس کی مدد کرنی ہو گی۔ رستوگی کی جس عمارت میں تجوری ہے۔ وہاں ڈاکا مارنا ہے۔ کل وہاں بیس لاکھ روپے آئے ہیں اگر لوٹ لیے تو میں تمہاری مدد بھرپور انداز میں کروں گا۔ ان روپوں میں تمہارا بھی حصہ ہو گا۔ رشیدہ کو بھی رستوگی کی قید سے چھڑا لوں گا۔ تنویر احمد نے اس کے کہنے پر مزید دو آدمیوں کو ساتھ ملایا اور اس عمارت میں پہنچ گیا۔ عمارت کے کیئر ٹیکر نے اسے رستوگی کا آدمی سمجھا کیونکہ رستوگی نے فون پر کہا تھا کہ اس کا بندہ آ رہا ہے اسے رقم دے دینا۔ یہ لوگ وہاں ڈاکا ڈالنے پہنچے تو اس نے بغیر کچھ پوچھے اسے رقم دے دی۔ وہ رقم لے کر کچھ دور پہنچے تو وہاں ایک ایمبولینس کھڑی تھی۔ وہ سب اس پر سوار ہو کر ایک حویلی میں پہنچے۔ بکس اتارے گئے۔ ابھی وہ آرام کر رہے تھے کہ تریا بھی آ گیا۔ اس نے بتایا کہ رستوگی نے انسپکٹر رتن لال کے قتل کا حکم دیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بے کو ڈھونڈنے کے لیے اسے کہا ہے۔ اگلے دن وہ بے رشیدہ کو رستوگی کی قید سے چھڑا لایا۔ وہ سب باتیں کر رہے تھے کہ روشن لال پڑھا لکھا ہے پھر غنڈہ گردی میں کیسے آ گیا تو روشن نے بتانا شروع کیا کہ وہ پولیس میں انسپکٹر تھا۔ اس کے افسر نے اسے ڈیوٹی سونپی کہ وہ شہر کے ایک بہت بڑے منشیات کے اسمگلر کالیا کو پکڑنے کے لیے اس کے گینگ میں شامل ہو جائے۔ وہ شامل ہو گیا۔ کالیا نے اسے اپنے اڈے پر بلایا۔ وہ وہاں پہنچا۔ پیچھے سے ڈی ایس پی راٹھور بھی پولیس فورس کے ساتھ آ گئے۔ مقابلہ ہوا۔ ڈی ایس پی مارا گیا۔ پولیس نے تمام لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ گرفتار ہونے والوں میں روشن بھی تھا۔ اس نے لاکھ کہا کہ میں پولیس کے لیے مخبری کرنے ان کے گروہ میں شامل ہوا ہوں لیکن کسی نے نہیں مانا اور اسے بھی سزا ہو گئی۔ جیل سے نکلا تو زندہ رہنے کے لیے جرم کی دنیا میں آ گیا۔ روشن نے تنویر احمد کو گوا کے ایک بوڑھے اسمگلر ڈیسوزا کا پتا دیا کہ وہ تمہیں سمندری راستے سے پاکستان پہنچا دے گا۔ تنویر احمد اپنے ساتھیوں سمیت گوا پہنچا۔ ریکھا اور رشیدہ کو ہوٹل میں ٹھہرا کر ڈیسوزا سے ملنے نکل پڑا۔

(اب آگے پڑھیں)

ہال میں بیٹھے لوگوں کی طرف ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر سیکرٹ والی بولی۔ ”تم کسٹم آفیسر ہو؟“

”میں کسٹم آفیسر نہیں ہوں۔“

”تو پھر پولیس کے آدمی ہو گے؟“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”نہیں میں تو بیمہ کمپنی کا ایجنٹ ہوں اور ایک بیمہ کے بارے میں ہی مائیکل ڈی سوزا سے ملنے آیا ہوں۔“

تبھی باہر شور گونجا جیسے کچھ آدمی زبردستی اندر آنا چاہ رہے ہوں۔ یہ ایک پریشان کن بات تھی۔ میری نظریں دروازے کی سمت اٹھ گئیں۔ پھر ادھر سے نظر ہٹ کر گوانی کی جانب مڑ گئیں۔

گوانی کی نظر کاؤنٹر کے سامنے بیٹھے دو بڑے آدمی

ڈینئل کی جانب اٹھ گئی۔ اقبال کی نظریں بھی اس جانب اٹھیں لیکن اگر ان دونوں کے بیچ میں کسی قسم کا اشاروں کا تبادلہ ہوا بھی تو کم سے کم میں اسے پکڑ نہیں سکا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

ہم کھانے میں جت گئے۔

"آج تو واپس جا رہے ہو نا تم؟" لڑکی نے لگاوٹ بھرے انداز میں اقبال سے پوچھا۔

اقبال نے پانی کا آخری گھونٹ پیا پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ "ایک بات بتاؤ کیا واقعی تم لوگ میرے یہاں رہنے کا انتظام نہیں کر سکتے؟"

"نہیں کر سکتی۔" لوسی نظریں جھکا کر بولی۔

مجھے وہ سچ بولتی ہوئی محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اس گاؤں کا کوئی آدمی ہمیں ایک رات کے لیے چھت نہیں دے گا؟"

"نہیں کیوں کہ یہاں کے لوگ اجنبیوں سے بہت پرہیز کرتے ہیں؟" پھر بولی۔ "جلدی جلدی کھانا ختم کر لو۔ آخری بس اسٹاپ یہاں سے آٹھ میل دور ہے۔ دیر لگاؤ گے تو بس نکل جائے گی۔"

"ہم اسٹاپ پر ٹھہر جائیں گے۔" اقبال بولا۔

"وہ ٹھہر جاؤں گا مار کر اسٹاپ نہیں ہے۔"

اقبال میری طرح چپ چاپ کھانا کھانے لگا۔ اس نے جواب میں کچھ بولنے سے اجتناب کیا۔

"میں ڈیڈی کو گھوڑا گاڑی منگوانے کے لیے کہوں؟" لوسی نے پوچھا۔

"گھوڑا گاڑی والا کتنے پیسے لے گا؟" اقبال نے سوال کیا۔

"20 روپے۔" لڑکی نے جواب میں کہا۔

"میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔" اقبال نے جواب دیا۔

"تو کم دے دینا۔ 10 روپے دے دینا۔"

"10 روپے بھی نہیں ہیں میرے پاس۔" اقبال کا جواب دو ٹوک تھا۔

"کیوں جھوٹ بول رہے ہو۔" لوسی آنکھیں تریر کر بولی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"تو اپنے دوست سے لے لو۔" اس کا اشارہ میری طرف تھا۔

"وہ بھی میری طرح کنگلا ہے۔" اقبال نے ہنس کر جواب دیا۔

"پھر یوں ہی چلے جاؤ۔ جب دوسری بار واپس آؤ تو پیسے دے دینا۔"

"میں ادھار پسند نہیں کرتا۔" اقبال نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ایسی کی تیسی تمہاری۔" لوسی جھلا کر بولی۔ "تم سیدھے سیدھے کیوں نہیں کہتے کہ تمہاری لوٹ کر جانے کی نیت نہیں ہے۔"

"چلو چھوڑو یہی بات ہے۔ لوٹ کر تو ہم ہرگز نہیں جائیں گے چاہے ہمیں ساری رات ایک ایک فٹ پانی سے بھری ہوئی گلیوں میں کیوں نہ گزارنی پڑے۔" اقبال نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

"صبح تک دونوں اکڑے پڑے ہوں گے۔ آدھا گلاس اسکاچ پینے کے بعد شاید ایسی نوبت نہ آئے۔ تو میں ڈیڈی سے کہہ دوں کہ تم واپس نہیں جا رہے ہو اس لیے تمہیں گھوڑا گاڑی کی ضرورت نہیں پڑے گی؟"

"کہہ دو۔" اقبال نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

لوسی اٹھ کھڑی ہوئی اور سیدھی کاؤنٹر کی جانب چل دی۔ پھر کاؤنٹر کے پیچھے بنے دروازے میں داخل ہو گئی اور اس نے اپنے پیچھے بڑا سا دروازہ زور سے بند کر دیا۔

ڈینئل نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر بند ہوتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر اس کی الجھن بھری نظریں ہماری طرف اٹھ گئیں۔ میں چپ چاپ کھانا کھاتا رہا اور سوچتا رہا کہ ہر کوئی ہمیں ویگام سے باہر نکالنے پر کیوں تلا ہوا ہے۔ آخر یہ لوگ کیوں نہیں چاہتے کہ ہم رات کو ویگام میں رہیں۔ اگر ہم کسٹم آفیسر یا پولیس آفیسر ہیں بھی تو ان لوگوں کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ لیکن ایک بھی سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ کھانا کھا لینے کے بعد اقبال نے پھر سگریٹ سلگا لیا۔ گرائی پچھلے کمرے سے نکل کر پھر کاؤنٹر کے پیچھے آ بیٹھا تھا۔ ڈینئل اب بھی شراب پی رہا تھا۔ لوسی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اچانک اقبال اٹھا اور کاؤنٹر کے سامنے پہنچا۔ کھانے کے کتنے پیسے ہوئے اس نے گرائی سے پوچھا۔

"15 روپے۔" گرائی بولا۔ اقبال کاؤنٹر کے سامنے رکھے ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی جیب میں سے

urdunovels.com

ایک دس کا اور ایک پانچ کا نوٹ نکالا اور انہیں کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ گروانی نے نوٹ اٹھا لیے اور بولا۔ "اب کیا ارادہ ہے صاحب؟"

اقبال، گروانی کی آنکھوں میں جھانکتا رہا اور پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ "ڈی سوزا کی حویلی میں جاؤں گا۔"

ڈینل جو باہر سے آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا تھا اس نے ٹک کی آواز کے ساتھ ہاتھ میں تھاما ہوا گلاس میز پر رکھ دیا۔

گروانی نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "باہر کیا ہوا تھا؟"

"بھوتی اور الیگزینڈر کے لوگ آپس میں الجھ پڑے تھے۔ میں نے دونوں پارٹیوں کو بھگا دیا۔" کہہ کر اقبال کی طرف دیکھا اور پھر سوالیہ لہجے میں بولا۔ "حویلی میں؟"

"ہاں!" اقبال بولا۔ "ایک بار دیوگام تک آ پہنچنے کے بعد اب میں بغیر اپنا کام مکمل کیے لوٹ کر تو ہرگز نہیں جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے خود مائیکل ڈی سوزا مجھے ایک رات حویلی میں ٹھہرا لینے میں کسی قسم کا اعتراض نہیں کریں گے جب کہ میں انہی کے کام سے دیوگام آیا ہوں۔"

"آج کی رات کیسے حویلی میں جائیں گے آپ۔ وہ بھی اس موسم میں جب ہم گوا کے لوگ ایسے موسم میں اپنے گھر میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں؟"

"ابھی تو ساڑھے نو ہی بجے ہیں؟" اقبال گھڑی دیکھتا ہوا بولا۔

گروانی خاموش ہو گیا اقبال نے سگریٹ کا آخری کش لگایا اور اسے فرش پر پھینک دیا۔

"مائیکل صاحب کو معلوم ہے کہ آپ آنے والے ہیں؟" گروانی نے پوچھا۔

"ہاں!" اقبال بولا۔ "میں نے انہیں ٹیلی گرام کر دیا تھا۔"

"پھر تو انہیں آپ کو حویلی تک لے جانے کے لیے موٹر بوٹ بھیجنی چاہیے تھی۔ ڈی سوزا صاحب کے پاس فرسٹ کلاس موٹر بوٹ ہے۔"

"اگر میری کار راستے میں خراب نہ ہوتی تو میں یہاں پانچ بجے پہنچ گیا ہوتا۔ ممکن ہے کہ موٹر بوٹ میرا انتظار کر کے لوٹ گئی ہو۔"

"آج حویلی سے موٹر بوٹ کنارے پر نہیں آئی۔" ڈینل بھاری لہجے میں بولا۔

"آپ کو کیسے معلوم کہ بوٹ آئی یا نہیں آئی؟" اقبال نے پوچھا۔

ڈینل نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ ایک لمحہ کے لیے میں بھی الجھن میں پڑ گیا۔

"کوئی مجھے کشتی میں حویلی تک چھوڑ کر آ سکتا ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

"اس طوفانی رات میں آپ کو کون حویلی تک چھوڑنے جائے گا صاحب؟" گروانی بولا۔ "باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ سمندر پر دھند کے بادل چھا رہے ہیں۔ ایسے موسم میں تو راستہ سجھائی نہیں دیتا ہے اور پھر کنارے سے لے کر حویلی تک کا راستہ سمندری چٹانوں سے بھرا پڑا ہے۔ رات کو چٹانیں دکھائی نہیں دیتی ہیں۔ کشتی کسی بھی کہیں بھی کسی چٹان سے ٹکرا کر چور چور ہو سکتی ہے۔ ہر کسی کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔ مجھے امید نہیں ایسی خطرناک رات میں کوئی سمندر میں کشتی اتارنے کا حوصلہ کرے گا۔"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ دیوگام کے ماہی گیر رات کے وقت سمندر میں کشتی ڈالتے ہی نہیں؟" اقبال بولا۔

"رات رات میں فرق ہوتا ہے، ایسی رات میں کوئی بھی سمندر میں جانے کا حوصلہ نہیں کرتا۔"

مجھے لگا بوڑھا گروانی ہمیں خوامخواہ ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ "ایسی رات میں مان لو اگر حویلی سے ہی کسی کو کنارے پر آنا پڑ جائے تو وہ کیا کرتا ہے؟" اقبال بولا۔

"ان لوگوں کے پاس موٹر بوٹ ہے۔" گروانی بولا۔ "سمندری چٹانوں سے بچنے کے لیے وہ لوگ ایک لمبا چکر کاٹ کر کنارے پر پہنچتے ہیں۔"

"حویلی میں ٹیلیفون ہے؟"

"ٹیلی فون؟" گروانی بولا۔ "بنگلے میں بجلی نہیں ہے آپ ٹیلی فون کی بات کر رہے ہیں۔"

اقبال سوچنے لگا پھر بولا۔ "دیکھو پیارے میں کل پیدا نہیں ہوا ہوں۔ مجھے صاف صاف بتاؤ کہ تم لوگ جان بوجھ کر ہماری مدد کرنا نہیں چاہتے۔ نہ جانے کیوں تم لوگ آج کی رات دیوگام میں میری موجودگی یا حویلی میں جانے کے میرے ارادے کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھ رہے ہو۔ میرا خیال ہے اگر تم چاہو تو آج رات کے لیے ہمیں ٹھہرا سکتے ہو اور اگر واقعی تمہارے پاس جگہ نہیں ہے تو تم کم سے کم ہمیں حویلی پہنچانے کا تو انتظام کر ہی سکتے ہو لیکن نہ جانے کیوں تم لوگ ایسا کرنا نہیں چاہتے۔ واپس لوٹنے میں تو تم میری ہر قسم کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو۔" پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "لیکن

urdunovels.com

بولا۔ اب تو مجھے بھی ضد ہو گئی ہے۔ میں آج رات حویلی میں ضرور جاؤں گا چاہے مجھے یہاں سے حویلی تک کا راستہ تیر کر ہی پار کرنا پڑے۔"

نہ جانے کیوں ایک بار پھر ہال میں سناٹا چھا گیا تھا۔ ایک بار پھر ہر کوئی ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ کوانی ہٹا کٹا سا کبھی ہماری طرف اور کبھی ڈینئل کا منہ دیکھ رہا تھا اس کا چہرہ سلیٹ کی طرح صاف تھا۔

"کوئی ہمیں کشتی پر حویلی تک لے جانے کے لیے تیار ہے۔ منہ مانگا محنتانہ دوں گا۔" اقبال اونچی آواز میں بولا تاکہ ہال میں بیٹھا ہر آدمی سن لے۔

کوئی کچھ نہیں بولا۔

"آل رائٹ۔" اقبال بولا۔ "دیوگام میں تمہارے علاوہ بھی لوگ رہتے ہی ہوں گے۔ میں ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا۔ کوئی تو مجھے حویلی تک لے جانے کے لیے تیار ہوگا۔" اقبال نے اپنا ایئر بیگ کندھے پر رکھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر آہستہ قدموں سے ہال سے باہر کی جانب چل دیا۔

"ٹھہرو!" اقبال آواز سنتے ہی رک گیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ پکارنے والا ڈینئل تھا۔

"چپو چلانا جانتے ہو؟" اس نے اقبال سے پوچھا۔

"جانتا ہوں۔" اقبال نے جواب دیا

ڈینئل اپنی کرسی سے اٹھا اس نے مرکزی دروازے پر جا کر باہر آسمان دیکھا، پانی ابھی بھی برس رہا تھا۔ واپس ہمارے پاس آ کر بولا۔ "بادل چھٹ رہے ہیں دس پندرہ منٹ میں بارش رک جائے گی تب ایک کشتی دے دوں گا۔ اگر پہنچ سکو تو حویلی پہنچ جانا۔ ڈوب گئے تو تمہاری قسمت۔"

"شکریہ۔" اقبال نے کہا۔

تینوں واپس آ کر کاؤنٹر کے سامنے اسٹولوں پر بیٹھ گئے۔ کوانی کے چہرے پر الجھن کے آثار ابھر آئے تھے۔

"کچھ پیو گے؟" ڈینئل نے پوچھا۔

"نہیں۔" اقبال بولا۔

ڈینئل پھر پینے میں جت گیا۔ اقبال نے ایک سگریٹ سلگا لیا اور دھیرے دھیرے کش لگانے لگا لوئی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ دس منٹ بعد بارش کی تیز بوچھار بوندا باندی میں بدل گئی پھر بارش رک گئی۔ ڈینئل کوانی سے بولا۔ "کھانا لاؤ۔"

کاؤنٹر پر ہی کھانا لگا دیا گیا۔

موریا سلطنت

(322 ق م ۔ 185 ق م)

ہند قدیم کی ایک سلطنت، اس کی بنیاد چندر گپت موریا نے 322 ق م میں پچھلی سلطنت کے تباہ ہونے پر ڈالی۔ موریا سلطنت شمال سے جنوب تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ عہد حکومت تجارت، خوش حالی اور دوسرے ممالک سے راہ و رسم کے لیے مشہور تھا۔ اس خاندان کا مشہور بادشاہ اشوک (232۔272 ق م) ہوا۔ اشوک نے بدھ مت اختیار کیا اور اسے پھیلانے کے لیے کئی ممالک میں بھکشو بھیجے۔ بدھ مت کے بھکشوؤں کے لیے مندر تعمیر کروائے۔ عام لوگوں کو بدھ مت کے اصولوں سے آشنا کرنے کے لیے ساری سلطنت میں ستون اور لاٹیں بنائی گئیں، جن پر بدھ مت کے اصول کندہ کروائے گئے۔ یہ ستون تراشیدہ ہیں اور فن کا بہترین نمونہ۔ اشوک کے عہد کا شاہی آرٹ ستونوں اور لاٹوں پر ملتی ہے۔ اشوک کے دور کے تمام ستون اعلیٰ فن کاری کا ثبوت ہیں۔

مرسلہ: آفاق حکیم۔ جہلم

اردو شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی جو خالص مردانہ طرز اظہار کی شاعری ہے اس لیے اس میں تمام تر مردوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس شاعری کا رشتہ جس ملک، جس تہذیب اور جس روایت سے جڑا ہوا ہے، اس میں عورت مرد کی ملکیت کا درجہ رکھتی ہے اس لیے وہ اردو شاعری کا موضوع تو بنی لیکن اس میں صرف اس کے حسن و جمال کا ذکر ہے۔ مردوں کی دنیا میں اس کا بھی مقصد ٹھہرا کہ وہ مرد کی آسودگی اور آرام کا ذریعہ بنے، اپنے ناز و ادا سے اس کا دل لبھائے۔ اس کے ہجر میں تڑپے اور پھر بھی ہرجائی کہلائی۔ خود عورت کو اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کا موقع نہیں ملا۔ خواتین نے شاعری کی تو مردوں کے ہی انداز بیان اور زبان میں، یا پھر مذہب اور تصوف کا سہارا لے کر۔ اسی لیے اردو شاعری کی ساری امیجری عورت کی زلف اور رخسار، قد و قامت اور ناز و ادا سے عبارت ہے۔

ویٹر نے پانچ کی جگہ 15 منٹ لگائے۔ کھانا کھا لینے کے بعد بڑی بے پروائی سے پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ہوا اٹھا اور بولا۔ "چلو چپو سنبھالیے۔"

ساحل پر آ کر اس نے ایک کشتی کو پانی میں آگے دھکیل دیا پھر ہمیں سوار ہونے کا اشارہ دیا۔ سوار ہوتے ہی ہم دونوں نے چپو سنبھال لیا اور سائے کی طرح دکھائی دینے والی حویلی کی جانب کشتی کھینچنی شروع کر دی۔ سمندر میں پہنچ کر مجھے احساس ہونے لگا کہ ہوٹل کے کرائی مالک نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ ہر ہر قدم پر خطرہ منہ کھولے نظر آ رہا تھا پھر بھی ہم چپو چلائے جا رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ اگر ایک بار راہ سے بھٹک گئے تو پھر ہم اس عمیق سمندر میں تنکے کی طرح کھو جائیں گے اور پھر دیوکام کے کنارے پر بھی نہیں نکل پائیں گے۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کنارہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ پیچھے پانی کی اٹھتی بیٹھتی لہروں کے علاوہ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خطرے کا ادراک ہو چکا تھا اور اب میں اپنے ضد پر پچھتا رہا تھا۔ جو کام پہلے آسان لگ رہا تھا اب وہی موت کا سامان لگ رہا تھا۔ ایک بار دل میں خیال آیا کہ واپس لوٹ جائیں لیکن پھر حویلی کی جانب ہی بڑھتے رہنے کا ارادہ کر لیا تبھی ہمارے کانوں میں ایک نئی آواز پڑی۔ اقبال نے بھی چپو چلانا بند کر دیا اور غور سے اس آواز کو سننے لگا پھر وہ آواز بند ہو گئی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی موٹر بوٹ کی آواز تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے لگا۔ شاید ڈیسوزا کی موٹر بوٹ کنارے کی جانب آ رہی ہے، میں نے سوچا۔ کچھ دوری پر موٹر بوٹ کی فلیش لائٹ چمکی تھی اس روشنی میں میں نے پانی پر پہلے حویلی کے سائے کے پیچھے بندوق سے چھوٹی گولی کی تیزی سے نکلتی ہوئی موٹر بوٹ کو دیکھا پھر وہ غائب ہو گئی۔ جیسے اس نے راستہ بدل لیا ہو لیکن موٹر بوٹ کے انجن کی آواز اب بھی سماعت کے پردے سے ٹکرا رہی تھی مگر موٹر بوٹ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ آواز سے تو ایسا لگا موٹر بوٹ ہم سے 30۔40 گز دوری سے گزری ہو۔ اقبال زور سے چلایا۔ اپنی آواز کی کوئی ری ایکشن اسے دکھائی نہیں دی۔ موٹر بوٹ کے انجن کی آواز دھیرے دھیرے دھیمی ہوتی ہوئی سنائی دی پھر وہ بھی بند ہو گئی۔

اقبال نے پھر چپو سنبھال لیا۔ سمندر ایک بار پھر سرکش دکھائی دیا۔ میں فوراً ہی ہوشیار ہو گیا اور تیزی سے حویلی کی جانب کشتی کھینچنی شروع کر دی۔ اب سامنے پہاڑ کی طرح کھنڈری حویلی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اقبال نے چپو چلانے کی رفتار کم کر دی اور پھر دم لے کر اپنی ساری قوت لگا کر چپو چلانے لگا۔ ایک دو جگہ پر ہمیں سمندر سے سر نکالے چھوٹی چھوٹی چٹانیں دکھائی دیں تھیں جن سے کشتی کو بڑی احتیاط سے بچایا تھا۔ حویلی اب تھوڑی ہی دور تھی کبھی مجھے وہاں حویلی کے گھاٹ پر ایک انسانی سایہ سا دکھائی دیا۔ اقبال بڑی تیزی سے کشتی کو چٹانوں سے ٹکرانے سے بچاتا ہوا گھاٹ کی سمت لے آیا لیکن وہاں گھاٹ کا کنارہ دیوار کی طرح پانی سے کم سے کم آٹھ فٹ اونچا اٹھا ہوا تھا۔ کشتی میں کھڑے ہو کر وہاں سے کنارے پر پہنچ جانا محال تھا۔

"آس پاس کہیں جیٹی بھی ہوگی۔" اقبال نے کہا۔

تبھی میں نے کہا۔ "ہمیں کسی بھی طرح گھاٹ تک پہنچنے کی کوشش کرنا ہے۔" کہتے ہوئے چٹان کے ساتھ ساتھ کشتی آگے بڑھانے کے لیے چپو چلانے کی رفتار میں تیزی لائی۔

اسی وقت بھڑک کی آواز آئی اور کشتی کے تلے میں سے لگ بھگ ایک فٹ چوڑا لکڑی کا ٹکڑا اکھڑ گیا۔ کشتی پانی میں چھپی کسی نوکیلی چٹان سے جا ٹکرائی تھی اگلے لمبے تختے کے ساتھ لگے ہوئے میرے پاؤں پر ایک فٹ پانی چڑھ آیا۔ پانی تیزی سے کشتی میں گھس رہا تھا۔ کشتی پانی میں دھنستی جا رہی تھی۔ ایک اونچی لہر ہماری طرف بڑھی۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر اقبال کو پکڑا۔ چٹانوں کے ساتھ بھیانک روپ سے ٹکراتی ہوئی لہروں نے ہمیں ایک دم اوپر اچھال دیا۔ میں نے اقبال سے کہا۔ "ہمیں چھلانگ لگانا ہے۔" اور پھر میں نے چھلانگ لگا دی۔

اقبال کے گلے میں ائر بیگ تھا اس لیے وہ مزید بھاری ہو رہا تھا۔ پھر بھی میرے ہی ساتھ اچھلا تھا۔

☆☆☆

میرا سر کسی پتھر سے ٹکرایا اور آنکھوں کے سامنے لال پیلے سورج طلوع ہونے لگے۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اتنا یاد ہے کہ میں نے اقبال کو مضبوطی سے تھاما اور کنارے کی جانب گھسیٹا تھا۔

ہوش آیا تو میں نے اپنے سر کو ایک زور کا جھٹکا دیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں بند کیں اور پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اطراف کا جائزہ لیا۔ میں ایک

چٹان پر پڑا تھا۔ اقبال اب تک ہوش سے بیگانہ تھا۔ اس کے کندھے سے اس کا ائیر بیگ لٹکا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اپنی بے ہوشی کی حالت میں میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ خواب میں میں نے ایک خوبصورت سی لڑکی کو اپنے اوپر جھکے دیکھا تھا ایسا لگا تھا جیسے پہلے لڑکی میرے چہرے پر پانی کے چھینٹیں مارتی رہی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کپڑوں سے پانی نچوڑنے لگا۔ رہ رہ کر میرے جسم میں خوف کی لہری دوڑ جاتی تھی میرے دانت بجنے لگے تھے۔ میں نے خود کو سنبھالا اور اندھیرے سمندر پر ایک نظر ڈال کر حویلی کی سمت بڑھ گیا۔ اقبال کو کمر پر لاد رکھا تھا۔ حویلی کے گرد اونچی دیوار تھی۔ چاردیواری میں کھڑی حویلی کے عالی شان دروازے کے سامنے جا کر میں ٹھٹک گیا۔ دیوار کتنی جگہ سے ڈھ چکی تھی اس لیے دیوار کے بیچ اندر جانے کے کتنے ہی راستے بن گئے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر بائیں ہاتھوں سے عالی شان دروازے کے ایک پلڑے پر دباؤ ڈالا۔ بھاری دروازہ چرچراہٹ کی آواز سے کھلتا چلا گیا۔ چاردیواری ٹوٹی ہونے کی وجہ سے حویلی میں رہنے والے دروازہ بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ اندر پہنچ کر پلڑے کو بند کر دیا اور پھر حویلی کی سمت بڑھ گیا۔ راہ داری کے آس پاس لمبی لمبی جنگلی گھاس اور خودرو جھاڑیوں کی بھرمار تھی۔ کسی زمانے میں بڑی ایک اہمیت کی حامل حویلی رہی ہوگی لیکن اب تو عبرت ناک تھی۔ اقبال کو اٹھائے ہوئے حویلی کے سامنے کی 10 بارہ سیڑھیاں طے کر کے میں حویلی کے مرکزی دروازے کے سامنے آ گیا۔ میں نے زور سے کنڈی کھٹکھٹائی پھر بلند آواز میں پکارا مگر پکار تیز سمندری ہوا کے شور میں گم ہو گئی۔ ڈی سوزا کا نام لے کر پکارا پھر بھی کوئی جواب نہیں آیا لیکن اقبال کو ہوش آ گیا۔ اس نے خود کو نیچے اتارنے کے لیے کہا پھر اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے ہوئے سر کی چوٹ کو ٹٹولا اور بولا۔ ”لگتا ہے سر کچھ زیادہ ہی زور سے ٹکرایا تھا۔“ کہنے کے بعد اقبال نے دونوں ہاتھوں سے دروازہ دھڑ دھڑایا اور چیخا۔ ”کوئی ہے؟“

جواب پھر بھی نہیں آیا۔

ہم دونوں پریشانی کے عالم میں دروازے پر کھڑے تھے۔ اسی لیے اقبال کی نظر دروازے کے برابر میں لٹکتی ہوئی لمبی زنجیر پر پڑی۔ پرانے وقتوں میں بڑے دروازوں پر اس قسم کی زنجیر لگانا فیشن تھا تاکہ لوگ اسے ہلا کر دروازہ کھٹکھٹائیں۔ اقبال نے اس زنجیر کو زور سے نیچے کی جانب کھینچا

اندر کہیں گھنٹا بجنے کی زوردار آواز سنائی دی تھی۔ اس نے پوری قوت سے پانچ چھ بار زنجیر کھینچی۔ ابھی گھنٹی کی آواز حویلی کی درودیوار سے ٹکرا رہی تھی اور میرے ذہن میں دیکھی ہوئی آدمی درجن فلموں کے سسپنس بھرے مناظر تازہ ہو گئے۔ پورے 2 منٹ انتظار کے بعد دوبارہ زنجیر کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دروازے کے ایک دم اوپر پہلی منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی کا دروازہ کھلتا دکھائی دیا۔ پھر لالٹین ہاتھ میں لیے ایک چہرہ کھڑکی پر نمودار ہوا اور پھر کسی نے پوچھا۔ ”کون؟“

”میرا نام نذر ہے لکھنؤ سے ڈی سوزا صاحب سے ملنے آیا ہوں۔“

”ملنا ہے مگر ملنے کا یہ کون سا وقت ہے؟“

”مجھے پہنچنے میں دیر ہو گئی وجہ پھر بتاؤں گا پہلے آپ دروازہ کھولیے میں ایک دم بھیگا ہوا ہوں اور ٹھنڈ میں ٹھٹھر رہا ہوں۔“

”آپ کو بلایا ہے؟“

”تو کیا مجھے کالے کتے نے کاٹا ہے جو ایسے گندے موسم میں اپنے گھر کا آرام چھوڑ کر آیا ہوں؟“

”ہنہ...“ اوپر کھڑے شخص نے گہری سانس کھینچی۔

”آپ نیچے آ کر دروازہ کھولیں گے یا وہیں کھڑے کھڑے سوالات کیے جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

لالٹین والا شخص چپ رہا اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”ٹھہرو آ رہا ہوں۔“

کھڑکی میں سے اس کا باہر نکلا سر غائب ہو گیا۔ ہم بے صبری سے دروازہ کھولنے کا انتظار کرنے لگے۔ پورے 5 منٹ بعد اندر کی طرف آہٹ ابھری پھر دروازے کا بھاری بولٹ ہٹا ایک آدمی قمیص اور ٹراوزر پہنے ہاتھ میں لال ٹین تھامے برآمد ہوا۔ اس کے پیچھے اقبال کی عمر کا ایک شاندار پرسنلٹی والا جوان جس نے سلک کا گاؤن پہن رکھا تھا۔

”ہیلو!“ اقبال مسکرا کر بولا۔

گاؤن والا بولا۔ ”ڈی سوزا جی نے بلائے آئے ہیں۔“ پھر اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

لالٹین والے نے لالٹین نیچے رکھ دی اور دروازہ بند کر کے بولٹ چڑھا دیا۔ اس نے لالٹین پھر اٹھائی اور لالٹین کی روشنی میں راستہ دکھاتا ہوا آگے آگے چلنے لگا۔ اقبال ائیر بیگ سنبھالے اس کے ساتھ میں، ہم دونوں ان کی رہبری میں چلنے لگے۔

urdunovels.com

"آپ کس سلسلے میں ملنے آئے ہیں؟"

"صاحب سے سلسلہ تو مجھے معلوم نہیں۔ مسٹر ڈی سوزا ہی بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے کس سلسلے میں مجھے بلایا ہے۔"

پھر میں نے مڑ کر گاؤن والے سے پوچھا۔ "آپ کون ہیں؟"

"میں الفریڈ ڈی سوزا ہوں۔ انکل مائیکل ڈی سوزا کا بھتیجا۔"

"ویسے آپ کام کیا کرتے ہیں؟"

"انشورنس کمپنی میں ملازم ہوں۔"

"لیکن انکل نے تو کوئی انشورنس نہیں کرا رکھا ہے۔"

"انہوں نے ایک بڑی بلکہ بہت بڑی رقم کا انشورنس کرا رکھا ہے۔ یہ انشورنس میرے ہی چچن کے مسٹر بجرو داج نے کیا تھا۔ ڈی سوزا صاحب پابندی سے پریمیئر ادا کرتے تھے۔ کلیم کا وقت قریب آرہا ہے۔ رقم بڑی ہے اسی وجہ سے میں خود بتانے آگیا ہوں۔"

"اچھا...... لیکن ایسے خطرناک موسم میں کیوں آئے۔ ایک دو دن بعد آتے۔"

"میں تو یہاں 5 بجے ہی پہنچ گیا ہوتا لیکن موسم نے سب گڑبڑ کر دیا بڑی مشکل سے میں دیوگام پہنچا۔"

الفریڈ نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔ "آپ یہاں، حویلی تک پہنچے کیسے؟"

"کشتی سے!"

"آپ کا مطلب ہے آپ اس بھیانک موسم میں یہاں تک خود کشتی چلا کر پہنچے ہیں؟"

"جی ہاں۔ کیونکہ دیوگام والے ایک شخص نے ہماری ضد سے مجبور ہو کر اپنی کشتی دے دی کہ نوکیلی چٹانوں سے ٹکرا کر ہم سمندر میں بہہ جائیں۔ لیکن قسمت کہ ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔"

باتیں کرتے ہوئے ہم گیارے کے سرے پر پہنچ گئے پھر ایک موڑ مڑ گئے اور سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ سیڑھیوں، چھاروں کے بعد ہم لوگ دوسری منزل پر پہنچے۔ اس کی اونچی چھت کے سہارے ایک بہت بڑا جھالروں والا فانوس لگا ہوا تھا جس میں 40، 50 موٹی موٹی موم بتیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے 4 یا 5 موم بتیاں روشن تھیں۔ ان میں سے نکلی زرد روشنی بڑے ہال کا نجانے کتنی صدیوں کا سمٹا ہوا اندھیرا دور کرنے کے لیے موثر نہ تھی۔ دیوار میں بنی ہوئی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ سمندر دکھائی دے رہا تھا اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آرہے تھے۔

"آپ یہاں تشریف رکھیے۔" 15 فٹ لمبی اور 5 فٹ چوڑی برماٹک کی میز کے آگے رکھی کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ملازم جیسا دکھنے والا ہال سے باہر نکل گیا۔

ہم انتظار کرنے لگے۔ کپڑے گیلے ہونے کے سبب ٹھنڈی ہوا اور بھی ٹھنڈی لگ رہی تھی۔ رہ رہ کر ہوا کے جھونکوں سے فانوس ایک ردھم میں ہلکے ہلکے لرز رہا تھا۔ میری آنکھیں ہال کی دیواروں پر گھوم رہی تھیں جہاں بارعب مگر خونخوار چہروں والے جنگلی لباس پہنے جنگجوؤں کی آئل پینٹ سے بنی ہوئی تصاویر تھیں۔ تصاویر کے درمیان میں دیواروں پر تلواریں کراس کی شکل میں ڈھالوں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کسی تاریخی فلم کے سیٹ پر یا کسی میوزیم میں آگیا ہوں۔ تبھی اندر والا دروازہ کھلا اور واکنگ اسٹیک کا سہارا لیے ہوئے ایک شخص ہال میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے نوکر سا لگنے والا وہی آدمی چل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس وقت لالٹین نہیں تھی۔ میں نے کسی چابی کے کھلونے کی طرح دونوں ہاتھ جوڑ دیے جیسا کہ ہندو نمستے کرنے کے لیے جوڑتے ہیں۔ لیکن نووارد نے جیسے دیکھا ہی نہیں چپ چاپ گزر رہا۔ لمبی میز کے سامنے رکھی تخت سی لگنے والی ایک کرسی پر وہ بیٹھ گیا لیکن ابھی تک اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ شکل سے بھی وہ بڑے ہی سیدھے سادے انسان لگ رہے تھے۔ ان کی عمر کا صحیح اندازہ تو میں بھی نہیں لگا سکا لیکن پھر بھی میرے خیال سے 80 سال سے کم نہیں تھے۔

"تمہارا نام نذر محمد ہے نا؟" ڈی سوزا نے پوچھا پھر خود ہی بولا۔ "روشن جی نے ہمیں تمہارے بارے میں بتایا تھا۔" پھر نوکر کی طرف مڑ کر بولے۔ "صاحب کے لیے کمرا تیار کر دو اور پھر لوٹ کر یہاں آجاؤ۔"

نوکر کمرے سے باہر نکل گیا۔ مائیکل ڈی سوزا نے الفریڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم بھی جا کر دیکھو شایانِ شان کمرا تیار کر رہا ہے نا۔" الفریڈ ہال سے جیسے ہی باہر نکلا انہوں نے ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے چونک کر کاغذ پر نظر ڈالی۔ اس پر انگریزی میں لکھا تھا۔ "ان لوگوں کے سامنے کچھ نہ بولیں۔ صحیح بات بعد میں ہوگی۔ ابھی خود کو انشورنس ایجنٹ ہی کہتے رہیں۔"

ابھی میں نے کاغذ کو پڑھا ہی تھا کہ الفریڈ دوبارہ ہال میں داخل ہوا۔ "انکل کمرا سیٹ ہوگیا۔"

الفریڈ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تبھی مائیکل ڈیوڈا بولے۔ ”الفریڈ نے ہمیں بتلایا ہے کہ تم کن پریشانیوں سے گزر کر حویلی تک پہنچے ہو اس کے لیے ہم شرمندہ ہیں لیکن ہمیں یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ تم نے ہمیں اپنے آنے کی خبر کیوں نہیں دی۔“

”میں نے آپ کو ٹیلیگرام دے دیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

وہ صاحب بولے۔ ”ٹیلیگرام ہم تک نہیں پہنچا۔“

”شاید ٹیلیگرام دیو گام پہنچ گیا ہو لیکن موسم خراب ہونے کے سبب ڈیلیور نہیں ہوا۔“

”7 بجے کے قریب میں دیو گام گیا تھا۔“ الفریڈ بولا۔ ”تب تک تو کوئی ٹیلیگرام نہیں آیا تھا۔ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہو گی۔“

”میں مشکور ہوں کہ اتنی تکلیف اٹھا کر تمہیں یہاں آنا پڑا۔ تمہاری کمپنی کو میں لیٹر لکھ کر تمہارا شکریہ ادا کروں گا۔“ پھر کچھ سوچ کر بولے۔ ”الفریڈ نے تمہیں کچھ بتایا ہے؟“

”جی نہیں، انہوں نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔ سارا قصہ آپ ہی کے منہ سے سننا پسند کروں گا۔ اس سے مجھے سہولت ہوگی۔“ میں الجھ رہا تھا کہ آیا کس کام سے ہوں اور یہ بوڑھا کچھ اور کہہ رہا ہے۔ انداز بھی پُراسرار سا ہے۔ انہوں نے جو کہا تھا اسی حساب سے میں نے جواب دے دیا تھا۔

”ہم بتاتے ہیں۔“ وہ الفریڈ کی طرف رخ کر کے بولے پھر سر جھکائے سوچتے رہے کچھ دیر بعد بولے۔ ”بات لمبی ہے۔ تم لوگ تھکے ہوئے ہو اسی لیے کہا تھا کہ صبح بات ہو گی۔“

بڑے میاں کا انداز ایسا تھا جیسے وہ سنانے پر بضد ہیں لیکن الفریڈ اور نوکر کی وجہ سے بہانے پر آمادہ ہیں۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ہم تروتازہ ہیں۔ جہاں تک سنا سکتے ہیں سنا دیں۔ باقی کی روداد صبح سنا دیجیے گا۔“

”یہ پچھلے دنوں کی بات ہے۔ ایک انڈین لڑکا حویلی کا مہمان تھا وکرم سنگھ۔ اس کی والدہ اس کی پیدائش پر مر گئیں۔ جب وہ آٹھ مہینے کا تھا کہ اس کے والد کو سانپ نے کاٹ لیا۔ اس سارے سنسار میں اس کا کوئی اپنا نہ تھا۔ کچھ ہوشمند ہوا تو اس نے خود کو اکیلا پایا۔ اس کی پرورش ایک یتیم خانے میں ہو رہی تھی۔ اپنے اکیلے پن کو اس نے رنگ و برش میں گھول دیا۔ چترکاری کرنے لگا۔ پنسل سے ایسی تصویر بنا دیتا کہ لوگ حیرت میں رہ جاتے۔ جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا اس کے فن میں پختگی آتی گئی۔ چترکاروں کی خدمت کر کے مجھے

برق لکھنوی کو شاہ اودھ واجد علی شاہ سے بے انتہا انس تھا۔ جب بادشاہ اپنی سلطنت کی واپسی کا مقدمہ لے کر کلکتے کے لیے روانہ ہوئے تو یہ بھی اپنی ضعیفی کے باوجود ان کے ہمراہ تھے۔ بادشاہ نے ہر چند منع کیا مگر شوق جاں نثاری میں نہ مانے اور ساتھ ہو لیے۔ کلکتے پہنچ کر جون 1857ء میں بادشاہ قلعہ فورٹ ولیم میں نظر بند کر دیے گئے۔ برق سے وہاں کے مصائب برداشت نہ ہوئے اس وجہ سے بیمار پڑ گئے۔ چند مہینے اسی عالم میں گزرے، حالت روز بروز بگڑتی گئی، بالآخر شنبہ 28 صفر 1274ھ مطابق 17 اکتوبر 1857ء کو عالم غربت میں انتقال کر گئے۔ کلکتے کے امام باڑہ مرزا احمد سوداگر میں مدفون ہوئے۔ بہ قول نظم طباطبائی، برق نے مرتے وقت یہ شعر لکھ کر واجد علی شاہ کے پاس بھیجا

برق جو منہ سے کہا تھا وہی کر کے اٹھے
جان دی آپ کے دروازے پہ مر کے اٹھے

برق لکھنوی کی پرگوئی اور قادر الکلامی کا ثبوت ان کا ضخیم دیوان ہے جس میں غزلیں، مسدس، مخمس، مثنوی، قطعات، ترجیع بند، غرض کہ تمام اصناف موجود ہیں۔ انہوں نے ایک ”واسوخت“ اور ایک ”شہر آشوب“ بھی نظم کیا۔ دیوان ان کی زندگی ہی میں بہت خوشخط اور عمدہ کاغذ پر مطبع سلطانی لکھنو سے شائع ہوا تھا۔

حرکت میں برکت ہے

”حرکت میں برکت ہے۔“ مجھے نہیں معلوم یہ مقولہ کس کا ہے مگر میں نے یہ بات بالکل بچپن سے اپنی والدہ سے سنی ہے۔ وہ اپنی عمر کے بہتر سال تک یہ مقولہ دہراتی رہیں اور میں اب پچاس سال تک اس مقولے پر عمل کر رہا ہوں اور اس کی معقولیت کی داد دیتا ہوں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک انسان کے لیے جو اپنے مقصدِ پیدائش کو پورا کرنے کا عزم رکھتا ہو اور جو دنیا میں ایک مفید انسان بننا چاہتا ہو اور جو صحت مند اور کارآمد زندگی گزارنے کا ارادہ رکھتا ہو، اس سے بہتر کوئی مقولہ ہو سکتا ہے۔ اتنا پڑھنے کے بعد اور اتنا لکھنے کے بعد آپ انتہائی سکون و غرق کے ساتھ غور کیجیے کہ کیا حرکت کے بغیر آپ کوئی بھی کام کر سکتے ہیں؟

مرسلہ: ناہید یوسف، اسلام آباد

خوشی ہوتی تھی۔ انہیں مہمان بنا کر دل کو تسکین ملتی تھی۔ اس شوق کی خاطر اپنی زندگی میں ہم نے لاکھوں روپے خرچ کیے ہیں۔ ہمارے پاس پکاسو۔ وان گوگ۔ لیو نارڈو دا ونچی، مائیکل اینجلو کے فن پارے بھی ہیں، جن کی قیمت اس وقت لاکھوں میں ہے۔ انڈین مصوروں کے فن پارے بھی ہیں روی ورما، امریتا شیر گل، جیمنی رائے۔ ایم ایف حسین، طیب مہتا، ایس ایچ رضا، ارپیتا سنگھ جیسے آرٹسٹوں کی بھی میں نے دعوت کی ہے۔ میرا ایک البم ہے اس میں جتنی بھی تصویریں ہیں وہ اپنے آپ میں منفرد ہیں۔ ان پینٹنگز کو بنانے کے لیے چترکار نے بہترا رنگ استعمال کیا ہے۔ کیوس استعمال کیا ہے۔ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ بمبئی میں ایک نمائش لگی تھی وہاں مجھے جہانگیر لے گیا تھا کہ وہاں ایک نئے چترکار کے فن پاروں کی نمائش ہو رہی تھی۔ نمائش میں اس نئے مصور کی تصویریں دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا، واقعی بڑی شاندار تصاویر تھیں۔ اس چترکار کا نام وکرم سنگھ تھا۔ ہم نے اسے اپنے اور اپنے شوق کے بارے میں بتایا اور اسے اپنے ہاں مہمان ٹھہرنے کی دعوت دی لیکن اس نے بتایا کہ شو کے فوراً بعد وہ پیرس جا رہا ہے۔ ان شہ پاروں سے جو آمدنی ہوگی وہ وہاں اس کے کام آئے گی۔ ہم نے اسے قیمت سے زائد دینی چاہی لیکن اس نے انکار کر دیا کہ وہ بتائی گئی قیمت سے زیادہ نہیں لے گا۔ وہ فرانس چلا گیا۔ وقت گزرتا رہا پھر اس مہینے کے پانچ تاریخ کو ہمیں پتا لگا کہ وکرم سنگھ فرانس سے لوٹ آیا ہے اور اس وقت پاناجی میں ہے اور جلد ہی ہمارے پاس آئے گا پھر پچھلے سوموار کو وہ آیا تھا۔ اتفاق ہے اس دن گاجا پتھی موجود نہیں تھا۔

"کیا مسٹر گاجا پتھی یہیں رہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"گاجا پتھی اس 400 سال پرانی حویلی کے نیرس میں سوتے ہیں تاکہ مجھے ضرورت پڑے تو فوراً آجائیں۔" ڈی سوزا نے کہا۔ "ہماری ایک کوٹھی پاناجی میں بھی ہے۔ الفریڈ وہاں رہتا ہے۔ کبھی کبھار یہ یہاں ملنے آجاتا ہے۔ نابینا ہونے سے پہلے میں بھی..... پاناجی میں ہی رہتا تھا۔ بینائی چھن جانے کے بعد ہمارے لیے تو پاناجی اور یہ پرانی حویلی ایک جیسی ہو گئی ہے۔ اس لیے شہر کا شور و غل چھوڑ کر ہم یہاں آ گئے۔"

"آپ وکرم جی کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے؟" اقبال خاموش نہ رہ سکا۔

"ہاں وکرم سنگھ پچھلی سوموار کو آیا۔ بہت سی باتیں ہوئیں۔ وہ ہمارا کلیکشن دیکھنا چاہتا لیکن کلیکشن دیکھنے، اس پر جتنے اسٹروک ہیں اسے سمجھنے کے لیے اچھا خاصا دن چاہیے تھا۔ ویسے اس کا وہاں کئی دن ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔

اب مجھے بوریت ہونے لگی تھی تبھی ڈی سوزا بولا۔

"رات کو وکرم سنگھ اپنے کمرے میں سویا تھا۔ صبح بریک فاسٹ کے لیے اسے بلانے گاجا پتھی کمرے میں پہنچا تو وہ وہاں نہیں تھا۔"

"اپنے کمرے میں نہیں تھا کیا مطلب؟"

"دو گھنٹے بعد ساری حویلی میں اسے تلاش کرنے کے لیے ہر طرف لوگ پھیل گئے لیکن بکرم سنگھ تو نہیں ملا تب ہم نے اندازہ لگایا کہ وکرم سنگھ صبح صبح موٹر بوٹ لے کر دیوگام چلا گیا ہے۔ ہم کچھ حد تک پریشان ہو گئے لیکن جب دوپہر تک وکرم سنگھ کی صورت نہیں دکھائی تو ہم نے گاجا پتھی کو جانے کے لیے کہا۔ وہ کشتی لے کر دیوگام چلا گیا۔"

مجھے اب ڈی سوزا کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ جب کہ میں جس کام سے آیا تھا وہ پس پشت چلا گیا تھا۔ وہ کشتی لے کر چلا گیا تھا اس جملے پر میں نے سوال داغا۔

"کیا کشتی یوں ہی کھڑی رہتی ہے؟ اسے لاک نہیں رکھتے ہیں؟"

ڈی سوزا کی بجائے الفریڈ نے جواباً کہا۔ "موٹر بوٹ کنارے پر کھڑی رہتی ہے۔ ہماری بوٹ کو ہاتھ لگانے کی کسی میں ہمت نہیں ہے۔"

"وکرم سنگھ کو کسی نے جاتے ہوئے دیکھا تھا؟" میں نے گاجا پتھی سے پوچھا۔

"میں نے تمام لوگوں سے پوچھا تھا۔ کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ وہ حویلی سے بہت سویرے نکل پڑے تھے۔" گاجا پتھی نے جواب دیا۔

"میں نے بھی پتا کروایا تھا کسی کو بھی پتا نہیں کہ وہ کس وقت گیا۔ بہر حال دیوگام کے کسی آدمی نے اسے دیکھا نہیں اور اگر کسی نے دیکھا تو اس نے مجھے بتایا نہیں۔" الفریڈ بولا۔

"دیوگام میں جٹی کے پاس ہمارا گیرج ہے۔ وہاں ہماری گاڑی کھڑی رہتی ہے تاکہ کبھی شہر جانا ہو تو اسے کام میں لایا جائے۔" گاجا پتھی نے جواب دیا۔ "میں نے وہاں جا کر دیکھا کالی ایمبیسڈر گاڑی گیرج میں نہیں تھی۔ میں نے سوچا شاید وکرم سنگھ کو کوئی ضروری کام ہوگا اسی لیے وہ گاڑی

لے گیا ہے کیونکہ چابی مین ہال میں پڑی رہتی ہے۔'' گاجا جی نے بتایا۔

''وہ تو مہمان تھا اسے ان باتوں کا پتا کیسے چلا؟'' اقبال نے پوچھا۔

''اسے ہم نے بتایا تھا کیونکہ وہ حویلی میں کئی دن کے لیے رہنے آیا تھا، اس دن میں نے یہی سوچا تھا کہ وہ شام تک لوٹ آئے گا لیکن پورے 2 دن ہم اس کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ واپس نہیں لوٹا۔'' ڈی سوزا نے کہا۔

''کار کے غائب ہونے کی رپورٹ کسی تھانے میں درج کرائی؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں درج کرائی اور پولیس والوں نے فوراً ہی ڈھونڈ نکالی۔'' ڈی سوزا نے کہا۔

''وکرم سنگھ کا کوئی اتا پتا ملا؟''

''یہی تو ہمیں چکرا رہی ہے کہ وہ واقعی وکرم سنگھ تھا یا کوئی اور تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وکرم سنگھ کو صرف میں نے دیکھا تھا وہ بھی اس وقت جب میری بینائی باقی تھی۔ نو سال بعد جو آدمی ہماری حویلی میں آیا وہ وکرم نہیں کوئی چور یا ٹھگ لگ رہا ہے۔ حویلی میں اسے کچھ ملا نہیں کیونکہ ہم سب کچھ بینک میں رکھتے ہیں اس لیے وہ کار لے اڑا جو پیٹرول کی کمی کے سبب راستے میں بند ہو گئی۔ شاید اسی لیے وہ اسے چھوڑ بھاگا۔''

''لیکن وہ آرٹ گیلری سے لاکھوں روپے کی تصویریں بھی تو چرا سکتا تھا؟''

''تصویریں لاکھوں روپے کی ضرور ہیں مگر معمولی چور اسے کیسے چھپا سکتا ہے کیونکہ اسے بازار میں دکان لگا کر بیچ نہیں سکتا۔ پینٹنگز بیچ پانے کے لیے قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس آدمی میں قابلیت ہوتی تو وہ جاہلوں کی طرح لاکھوں روپے کی تصویریں چھوڑ کر ایک ایمبیسڈر کار ہی لے کر نہ جاتا۔''

''کوئی اور وجہ؟'' میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

ڈی سوزا کسی سوچ میں ڈوب گئے پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ ''کچھ لوگوں نے ایک بات مشہور کر رکھی ہے گو کہ اس بات پر ہمیں بالکل یقین نہیں ہے۔''

''ایسی کون سی بات ہے؟'' ان کے پُراسرار انداز پر میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''ہم تو اس بات میں یقین نہیں کرتے لیکن لوگ کہتے ہیں کہ ہماری حویلی میں کوئی ان دیکھی مخلوق بھی رہتی ہے۔ ہمارے یہاں آنے سے پہلے ہمارے ایک دو نوکر بھی اسی وجہ سے نوکری چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ دیوگام کے لوگوں کا کہنا ہے کہ ہمارے اجداد کی روحیں یہاں چکرا تی ہیں۔ ہمیں تو کچھ نہیں کہتیں لیکن نئے لوگوں کو خوب دکھی کرتی ہیں۔ آپ ارواح پر یقین رکھتے ہیں؟''

''میں بھوت پریت، ارواح وغیرہ پر یقین نہیں کرتا۔'' میں نے جواب دیا۔

''بھوت پریت ہیں یا نہیں اس بات سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ لیکن۔'' الفریڈ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولا۔ ''پہلے یقین نہیں کرتا تھا لیکن اب کرنے لگا ہوں۔''

''آپ نے ایسا کیا دیکھ لیا؟''

''چھوٹی چھوٹی کئی باتیں ہوئی ہیں جس سے مجھے تو بھوت پریتوں پر یقین ہوتا جا رہا ہے۔'' پھر اس نے گردن موڑ کر اپنے عقب کی دیوار پر لگے ایک بڑے سے فریم میں سجی تصویر کی جانب اشارہ کیا۔ اس تصویر میں گھوڑے پر سوار واسکوڈی گاما جیسے کپڑوں میں ملبوس ایک نوجوان کو لہرا رہا تھا۔ وہ ایک بھاری بھرکم جسم والا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ میں گھوڑے کی لگام تھام رکھی تھی اور دائیں ہاتھ میں تلوار تھی۔

''یہ انکل کے دادا کے والد کی تصویر ہے۔ ابھی کو زیادہ لوگوں نے دیکھا۔ ایک بار میں نے بھی ایک عجیب واقعہ دیکھا۔ آدھی رات کے قریب میں نے کیا دیکھا؟ یہ دیکھا کہ تصویر سے موسیو مجھے دیکھتے ہی اپنے گھوڑے سے کود پڑے اور میری جانب بڑھنے لگے۔ خوف سے میرے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ اس وقت یہ تصویر میرے بیڈ روم میں تھی۔ بڑی مشکل سے میرے منہ سے چیخ نکلی جو پوری حویلی میں پھیل گئی۔ میرے چیختے ہی تصویر اپنی پہلی حالت میں خود بخود آ گئی۔''

''ہو سکتا ہو کہ ایسا منظر آپ نے اس لیے دیکھا کہ ذہن پر نیند غالب تھی۔'' اقبال نے کہا۔

''اس واقعہ کے کئی ماہ بعد کی بات ہے۔ میں کسی کام سے باہر نکلا تو حیران رہ گیا۔ حویلی کی چھت پر ایک لائٹ ہاؤس ہے جو زمانہ قدیم میں ہمارے بزرگوں نے تعمیر کیا تھا جو عرصہ دراز سے بند پڑا ہے۔ وہ لائٹ ہاؤس روشن تھا۔ لائٹ ہاؤس میں کوئی بلب نہیں کوئی کوئی الیکٹریکل آلات نہیں، تیل سے جلنے والی مشعلیں جلائی جاتی تھیں جو روشن تھیں۔ اس کی کھڑکیوں پر ایسے شیشے لگے ہوئے ہیں جو روشنی کو منعکس کرتے ہیں۔ ان کی تیزی بڑھ جائے ہیں۔ میرے

urdunovels.com

پہرے لگنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس لائٹ ہاؤس کے دروازے پر اتنا بڑا تالا لگا ہے۔" اس نے ہاتھ پھیلا کر تالے کا حجم بتایا۔ "اس تالے کو ایک صدی سے زیادہ ہو گیا ہے کسی نے کھولا نہیں۔ میں نے سرچ لائٹ کی طرح روشنی گھومتے دیکھی۔ کبھی وہ روشنی جلنے بجھنے لگتی تھی اور کبھی تیز ہو جاتی۔ پہلی بار میں بھی سمجھا اوپر کوئی ہے۔ چیک کرنے کے لیے سیدھا چھت پر پہنچ گیا۔ تالا اسی طرح جھول رہا تھا۔ تالے کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ تالا بند تھا۔ پوری طرح زنگ آلود تھا۔ میں واپس پیچھے آ گیا اور اس تالے کی چابی لے کر واپس آیا جو آرٹ گیلری کی ایک الماری میں رکھی رہتی تھی۔ جانے کتنے سالوں سے استعمال نہیں ہوئی تھی۔ میں نے مینار کا تالا کھولا۔ تالا کھول کر میں گھستا چلا گیا تھا۔ اوپر پہنچ کر دیکھا کہ لائٹ ہاؤس تو اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ پھر وہ روشنی کس چیز کی تھی سمجھ سے باہر ہے؟"

"پھر آپ نے کیا کیا؟"

"میرا حوصلہ جواب دینے لگا تھا۔ مجھے یقین آ گیا کہ حویلی میں گھومنے والی روحوں کی کرامت تھی یہ۔ پہلے میں یقین نہیں کرتا تھا لیکن اب کرنا پڑا۔ بس میں الٹے پاؤں وہاں سے بھاگا۔ اس کے بعد میں نے دوبارہ وہاں روشنی نہیں دیکھی۔"

"کئی بار اندھیری راتوں میں روشنی رقصاں دکھائی دے جاتی ہیں جسے الوشن کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اندھیری رات تو آج بھی ہے۔" اقبال بولا۔

"میری بتائی باتیں آپ کو کہانیاں لگتی ہیں۔ کچھ دن حویلی میں رہ جائیے یقین کرنے لگیں گے۔" پھر سوچتا ہوا بولا۔ "ایک بار گراؤنڈ فلور کے گلیارے میں سے گزر رہا تھا۔ ایک انسانی ہڈیوں کا ڈھانچا اپنی جانب بڑھتے دیکھا۔ میں دہل کر اپنے مقام پر کھڑا ہو گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس ڈھانچے کو دیکھنے لگا۔ میرے دیکھتے دیکھتے ڈھانچا ایک اپسرا جیسی خوبصورت لڑکی میں بدل گیا۔ میرے منہ سے چیخ نکلی اور وہ حسینہ بڑا سا سیاہ کالے ناگ میں بدل گئی۔ اور پھر میں بیہوش ہو کر گر پڑا جب مجھے ہوش آیا تو میرے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے جا رہے تھے۔" ڈی سوزا خاموش تھا الفریڈ بولے جا رہا تھا۔

"یہ کب کی بات ہے؟"

"سات آٹھ مہینے ہو گئے...... مگر یہاں تو ہر چوتھی رات کو ایک نیا کرشمہ دیکھنے کو ملتا ہے۔"

"پھر بھی آپ یہاں رہ رہے ہیں؟ اور ڈی سوزا صاحب کو یہاں رہنے دے رہے ہیں۔ جبکہ وہ بینائی سے بھی محروم ہیں۔" میں نے سوال کیا۔

"میں تو یہاں رہتا نہیں ہوں اور یہ میری بات مانتے نہیں ہیں، یہیں رہنا چاہتے ہیں۔"

"کیا حویلی میں کوئی لڑکی بھی رہتی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"اگر حویلی میں کوئی لڑکی نہیں رہتی تو پھر کم سے کم ایک روح کو میں نے بھی دیکھا ہے۔"

"کیا؟" الفریڈ۔ اور آگا پچھی دونوں ایک ساتھ بولے۔

"حویلی کی گھاٹ پر کشتی پہنچی تھی کہ پانی میں چھپی ہوئی نکیلی چٹان سے ٹکرا کر میری کشتی کا نچلا حصہ ٹوٹ گیا۔ ہم بیہوشی کی حالت میں ڈوب کر مر جاتے کہ دو ہاتھوں نے ہمیں تھام کر کنارے پر کھینچ لیا تھا۔ سمندر کے پانی سے دور ایک چٹان پر پڑے پڑے مجھے تھوڑا سا ہوش آیا تو میں نے ایک خوبصورت لڑکی کو اپنے چہرے پر جھکے ہوئے دیکھا۔ جب میں پوری طرح ہوش میں آیا تو وہ لڑکی وہاں سے غائب ہو چکی تھی اگر آپ کہتے ہیں کہ کوئی لڑکی نہیں ہے تو ضرور کسی بھوت پریت نے میری جان بچائی ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بھوتوں کا ذکر چھیڑنے سے کہیں آپ کا خیال یہ تو نہیں تھا کہ وکرم سنگھ نے رات کو کوئی بھیانک آسیبی عمل دیکھ لیا اور ڈر کے مارے آپ لوگوں کو بتائے بغیر رات کو ہی یا سویرے بھاگ نکلا۔" اقبال بولا۔

"اس نکتے پر خیال آرائی تو کر سکتے ہیں لیکن ہم پورے یقین کے ساتھ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ ایسا ہی ہوا ہے۔" ڈی سوزا نے کہا۔

"وکرم سنگھ کے غائب ہو جانے کی وجہ سے کئی سوال ابھرتے ہیں۔ اس کے ساتھ کوئی بڑا واقعہ ہوا ہے۔" میں نے اپنا خیال پیش کیا۔

الفریڈ چپ رہا۔ "وکرم سنگھ کے غائب ہونے کی وجہ اس کا پردہ فاش کرنے کی کوشش کروں گا۔ اب آپ میرے ایک دو سوالوں کا جواب دیجیے۔ آپ کو معلوم ہے۔ یہاں سے آ کر وکرم سنگھ کہاں ٹھہرا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا کوئی پکا پتا تو ہے نہیں یہاں سے لوٹا ہی تھا۔

بدل اس کے ابھی وہ طے نہیں کر پایا تھا کہ کہاں رہے گا۔ بمبئی میں ٹھہرا ہیں۔"

"وکرم سنگھ کے غائب ہو جانے کے بعد آپ نے اس ہوٹل میں پتا کیا تھا جہاں وہ ایک رات ٹھہرا تھا؟"

"وہ وہاں نہیں پہنچا تھا۔"

"وہ جب یہاں آیا تھا تو اس کے پاس کچھ سامان تھا۔"

"جی ہاں تھا۔ ایک بڑا ایک تھا پینٹنگ کا سامان تھا۔"

"سامان کہاں گیا؟"

"اس کے کمرے میں نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ وکرم سنگھ ساتھ ہی لے گیا ہے۔"

"کھانا لگ گیا ہے۔" ایک دوسرے نوکر نے ڈرائنگ روم میں آ کر کہا۔

"آپ لوگ کھائیں۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔" ڈی سوزا نے وہیل چیئر کو آگے دھکیل کر کہا۔

"مجھے کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" الفریڈ کے بولنے سے پہلے ہی اقبال بول پڑا۔ "میں دیوگام کے ہوٹل میں پیٹ بھر کر آیا ہوں۔"

"آیئے آپ کو آپ کا کمرا دکھا دوں۔ اب صبح ملاقات ہوگی۔" الفریڈ بولا۔

میں اور اقبال ساتھ اٹھے۔ الفریڈ کے ساتھ ہم ایک کوری ڈور میں آئے۔

"ایک بات پوچھوں۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ نے اپنے آپ کو انشورنس کمپنی کا کیوں بتایا تھا۔" اس نے رک کر گہری سانس لی پھر کہا۔ "لیکن ابھی انکل کی بات سے لگا کہ آپ کچھ بھی ہوں، انشورنس ایجنٹ نہیں ہیں۔"

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کو جانتا نہیں تھا۔ آپ نے بھی یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ آپ مجھے جانتے ہیں۔ اگر ڈیسوزا نے آپ کے سامنے یہ ظاہر نہ کیا ہوتا کہ انہوں نے مجھے کسی شخص کی تلاش کے لیے بلایا ہے تو میں اب بھی آپ کو نہ بتاتا۔"

"بہرحال آپ انشورنس کمپنی سے نہیں ہیں یہ تو ظاہر ہو گیا ہے۔ اب مجھے بھی بتا دیں کہ آپ ہیں کون؟"

"میں ایک اخبار کا رپورٹر ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور یہ میرا دوست ہے جو گوا دیکھنے کے لیے ساتھ ہو لیا ہے۔"

"اچھا...... میں تو آپ کو کوئی سی آئی ڈی کا آدمی یا پرائیویٹ جاسوس سمجھا تھا۔"

میں نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور چپ رہا۔

"آپ انکل سے آج پہلی بار ملے ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے ایک لفظی جواب پر اکتفا کیا۔

"آپ کو بغیر جانے انکل آپ کے بارے میں بڑی اونچی رائے رکھتے ہیں۔"

"مگر میں تو ایک معمولی سا رپورٹر ہوں۔"

"آپ پولیس سے بھی نہیں ہیں پھر بھی اتنے پُرامید کیسے ہیں کہ وکرم سنگھ کے معاملے میں کچھ نہ کچھ کر ہی دکھائیں گے۔"

میں اس بار بھی خاموش رہا تو اس نے ایک اور سوال جھونک دیا۔

"وکرم سنگھ کہاں اور کیوں غائب ہو گیا۔ اس بارے میں آپ کا اندازہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میرے دماغ میں ایک تھیوری ہے اس کا سرا تلاش کر لوں پھر بتاؤں گا۔"

اتنی دیر میں ہم ایک کمرے کے سامنے پہنچ گئے تھے۔

اس کے دروازے پر وہ رک گیا۔

پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ساتھ میں ہم بھی داخل ہو گئے۔ اس نے میز پر رکھے شمع دان میں لگی موم بتی کو روشن کر دیا۔ "یہ آپ کا کمرا ہے۔" کچھ توقف کے بعد بولا۔ "اس گلیارے کے دوسرے سرے پر میرا اور انکل کا کمرا ہے۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دیجیے گا...... اور فارگاڈ سیک رات کے اندھیرے میں اس گلیارے کے علاوہ اور کہیں آنے جانے کی کوشش مت کیجیے گا۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیوں؟"

"یہ حویلی کچھ اس طور پر بنی ہے کہ اس کی راہداریاں اور سیڑھیاں بھول بھلیاں سے کم نہیں۔ ایک قدم غلط اٹھا تو کہیں کے کہیں پہنچ جائیں گے۔ انجانے میں ایک منزل سے دوسری منزل پر پہنچ جائیں گے اور آپ کو یہ بھی پتا نہیں لگے گا کہ اونچائی پر جا رہے ہیں یا نیچے اتر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آپ کو حویلی کی کئی باتیں پریشان کر سکتی ہیں۔"

"مثلاً؟" میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس حویلی کے بہت سے گوشے جن کا پتا ہمیں بھی نہیں ہے۔ آپ اگر ان میں سے کسی میں پھنس گئے تو خود

urdunovels.com

وہاں سے مشکل سے ہی نکل پائیں گے اور آپ چیخ چیخ کر مر جائیں گے پھر بھی ہم تک آواز نہیں پہنچے گی۔ یہ حویلی خود میں ایک اسرار ہے اس کے سارے راز سچ پوچھئے تو میں نے بھی نہیں دیکھے ہیں۔"

"آپ حویلی کی نچلی منزل استعمال نہیں کرتے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ استعمال نہیں کرتے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہی ہے کہ حویلی میں اتنی جگہ ہے کہ ہمیں نچلی منزل استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی دوسری بات یہ ہے کہ اچھی حالت میں نہیں ہے۔ تیسری اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پچھلے کچھ برسوں سے حویلی کی نچلی منزل قابل استعمال نہیں رہی۔ کیوں کہ پچھلے حصے کا ڈھیر سارا حصہ وقت کی مار نہ سہہ سکا اور ڈھے گیا ہے۔ اس حصے کے ساتھ سمندر کی لہریں ٹکراتی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی جب سمندر میں زور کا جوار اٹھتا ہے تو پانی حویلی کے ٹوٹے ہوئے پائے سے اچھل کر نچلی منزل اور کمروں تک پہنچ جاتا ہے۔ پانی تو بعد میں نکل جاتا ہے لیکن نچلی منزل میں سے سیلن نہیں جاتی اس لیے ہم نے نیچے کا حصہ استعمال میں لانا بند کر دیا ہے۔ اس منزل پر 35 کمرے ہیں جن میں سے 12 استعمال کے قابل ہی نہیں ہیں۔"

"اتنی پرانی حویلی ہے۔ سمندر کا پانی پچھلے ٹوٹے ہوئے حصے سے ٹکراتا ہے۔"

"یہاں رہتے ہوئے خطرہ محسوس نہیں کرتے؟" اقبال نے پوچھا۔

"حویلی پرانی ضرور ہے لیکن جو حصہ گرا تھا وہ باقی حویلی سے الگ تھا۔ دیواریں پانچ پانچ فٹ چوڑی ہیں اور دیواروں پر اڑد کی دال، کوڑیاں اور چونا ملا کر بنایا گیا پلستر ہے جو اتنا ہی مضبوط اور چمکیلا ہے۔"

"اڑد کی دال، کوڑیاں اور چونے کا پلستر؟" اقبال حیرانی سے بولا۔

"سیمنٹ کی ایجاد تو ابھی کی ہے۔ پہلے تو عمارتوں میں یہی پلستر استعمال کیا جاتا تھا۔ سیمنٹ تو اس پلستر کے مقابلے میں مٹی کا پھسپھسا ڈھیر ہے۔ اب آپ آرام کیجیے۔" ہماری جانب مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہوا بولا۔ "گڈ نائٹ دروازہ اچھی طرح بند کر لیجیے گا۔"

دروازہ بند ہوتے ہی اقبال نے سگریٹ سلگایا اور چھوٹے چھوٹے کش لیتا ہوا کمرے کا معائنہ کرنے لگا۔ کمرا بہت بڑا تھا اس کے سامنے کی دیوار میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں اور کھڑکیاں بند تھیں۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک آبنوس کی لکڑی کا اونچے پاؤں والا بڑا سا بنا ہوا بیڈ جس پر کم سے کم چھ انچ موٹا گدا بچھا ہوا تھا۔ بیڈ کے پاس ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر ایک پانی کا جگ رکھا تھا اس کے علاوہ کمرے میں ایک وارڈروب جیسی الماری ایک رائٹنگ ٹیبل اور دو کرسیاں رکھی تھیں۔ شمع دان رائٹنگ ٹیبل پر رکھا تھا۔ اس میں ایک ہی موم بتی جل رہی تھی جس کی ہلکی زرد روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اقبال نے اپنا ایئر بیگ میز پر رکھ کر کھولا اور اس میں سے نائٹ سوٹ نکال لیا۔ اس نے آڑ میں جا کر کپڑے اتارے اور نائٹ سوٹ پہن لیا۔ اس کے پہنے ہوئے گیلے کپڑے جسم کی حدت سے ہی کافی حد تک سوکھ گئے تھے۔ اس نے کپڑوں کو کرسیوں کے پیچھے پر پھیلا دیا۔ پھر بیڈ کے ایک کونے پر بیٹھ گیا اور سگریٹ کے کش لگاتا ہوا بولا۔ "ایک بات سمجھ نہیں آئی ہے کہ آخر کیوں دیوگام کے لوگ ہمیں اس حویلی تک پہنچنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ وکرم کہاں چلا گیا؟ اتنے پراسرار انداز سے حویلی سے غائب ہو گیا کہ اس نے رات کو یا اگلی صبح بھاگنے سے پہلے ڈی سوزا کو مطلع کرنا کیوں ضروری نہیں سمجھا؟ کیا سچ مچ ہی اس نے کچھ دیکھ لیا تھا۔ کیا بھوت پریت آسیب کا وجود ہے۔ اگر ہاں تو کیا حویلی میں واقعی ڈی سوزا کے اجداد کی روحیں بھٹکتی ہیں؟"

"میرا دل بھی بھوت پریت بھٹکتی روحوں پر یقین نہیں رکھتا۔ بھوتوں کو بھی میں عیاروں کا پھیلایا جال مانتا تھا لیکن اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ میرا ہی اندازہ غلط ہو اور بھوت پریت ارواح حقیقت ہوں تو نوکر نے سچ میں ایسا کچھ دیکھا ہو۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے سگریٹ کا آخری کش لگایا اور اس کا بچا ہوا ٹکڑا فرش پر پھینک کر جوتے سے مسل دیا پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکیوں کی قطار کی سمت پہنچا۔ اس نے ایک کھڑکی کا بولٹ ہٹا کر اس کا ایک پٹ تھوڑا سا کھول دیا۔ ابھی اس نے کھڑکی کے پلے سے ہاتھ ہٹایا ہی تھا کہ کھڑکی کے دونوں پلے زوردار آواز کے ساتھ کھل کر بند ہو گئے۔ باہر سائیں سائیں کرتی ہوئی تیز ہوا چل رہی تھی۔ اس کھڑکی سے سمندری ہوا کے جھونکے کمرے میں داخل ہونے لگے اور کمرے کے پردے اور بستر کی چادریں پھڑپھڑانے لگیں۔ میں نے کھڑکی بند کرنے کا حکم نہیں دیا، کھڑکی کے نزدیک جا

urdunovels.com

کر باہر جھانکا۔ باہر کالا سمندر لہریں مار رہا تھا۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ تیز ہوا سے پیڑ پودے بری طرح جھوم رہے تھے۔ کھڑکی میں سے پیچھے گھپ اندھیرا تھا۔ میں کھڑکی سے ہٹ گیا اور پلنگ کی جانب بڑھا اسی لمحے تیز ہوا کا جھونکا کمرے میں داخل ہوا شمع دان میں لگی موم بتی کی لو تیز ہوئی اور پھر موم بتی بجھ گئی۔ کمرے میں گہرا اندھیرا چھا گیا۔ اقبال نے پہلے ماچس نکال کر شمع دان کی موم بتی جلانا چاہی لیکن پھر اس نے ارادہ چھوڑ دیا روشنی کی اب اسے ضرورت نہیں تھی۔ وہ ٹٹولتا ہوا بیڈ کے پاس پہنچا اور جوتے اتار کر بستر پر جا لیٹا۔ حویلی کا ماحول عجیب سا پُراسرار محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی ریڈیم ڈائل والی گھڑی پر نظر ڈالی۔ گیارہ بج چکا تھا میں اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ کیا کرنا چاہتا تھا، میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

ابھی ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ ہونٹوں پر ہنسی آ گئی۔ لیٹتے ہی اسے نیند آ گئی تھی اور اس نے عادت کے مطابق خراٹے لینا شروع کر دیا تھا۔

میں نے بھی سرتاپا چادر تان لی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ تبھی میرے کان کھڑے ہو گئے۔ گلیارے میں کوئی چل رہا تھا میں سانس روکے قدموں کی آواز سنتا رہا۔ کوئی دبے پاؤں کمرے کے دروازے کی سمت بڑھنے والا تھا کیونکہ آہٹ بہت نزدیک آ چکی تھی۔ میں نے اقبال پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے دباؤ ڈالا۔ یہ اشارہ تھا کہ وہ خاموشی سے لیٹا رہے مگر وہ تو خراٹے لینے لگا تھا۔ نیند کی وادیوں میں اتر گیا تھا۔ میں بھی نیند میں ڈوبے ہونے کی اداکاری کرنے لگا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر روشنی کی ایک پتلی سی لکیر دروازے کے درز سے داخل ہوئی اور ایک دو لمحے کمرے میں ناچتی رہنے کے بعد غائب ہو گئی۔ اس کے فوراً بعد ہی واپس لوٹتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی تھی۔

میں لپک کر بستر سے اٹھا اور دروازے کے پاس پہنچا۔ کمرے کے دروازے کو تھوڑا سا کھول کر باہر جھانکا۔ گلیارہ خالی تھا۔ میں دبے پاؤں بھاگتا ہوا گلیارے کے موڑ تک پہنچا لیکن موڑ کے بعد دوسرے گلیارے میں بھی کوئی دکھائی نہیں دیا۔ الفریڈ نے بتایا تھا کہ آخری سرے کے دو کمروں میں ڈیسوزا اور وہ رہتا ہے۔ میں تیزی سے کرب پا چلتا ہوا ان کمروں کے دروازے پر پہنچا پلڑے کو ہلکے سے دھکیل کر دیکھا۔ دونوں ہی در بند تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ میں کاجا پتھی کو جگا کر بتاؤں کہ حویلی میں کوئی ہے لیکن پھر میں نے ارادہ بدل دیا کیونکہ کاجا پتھی کی نظروں میں حویلی میں کسی کا ہونا کوئی حیرانی کی بات نہیں تھی۔ وہ بھوتوں پر یقین کرتا تھا اس لیے آسانی سے یہ کہہ دے گا کہ کوئی بھوت ہوگا اور پھر وہ سوتا کہاں ہے اس کا بھی پتا نہیں تھا۔ ڈیسوزا نے بتایا تھا کہ وہ گیلری میں سوتا ہے۔

میں واپس اپنے کمرے کی جانب چلنے لگا۔ راستے میں پڑنے والے ہر کمرے کے دروازے کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ بھی رہا تھا۔ سبھی دروازوں پر تالے جھول رہے تھے۔ میں اب واپس اپنے کمرے کے سامنے آ گیا۔

میں نے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ ٹھٹک گیا کمرے میں کوئی تھا۔ کسی کے تیز تیز سانس لینے کی آواز کانوں میں پڑ رہی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرے کے اندھیرے میں گھورنے لگا لیکن کہیں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ایک بھٹ کی آواز ہوئی مشین کی طرح میں آواز کی جانب گھوم گیا۔ شمع دان میں سے موم بتی گر کر زمین پر لڑک گئی تھی لیکن میرے آس پاس کوئی دکھائی نہیں دیا۔ خوف کی لہر جسم میں دوڑ گئی۔ اے خدا یہ کیا ہے؟ ذہن میں گونج اٹھی۔ میں نے حوصلے مجتمع کر کے جیب کی جانب ہاتھ بڑھایا اور ماچس نکال۔ تیلی جلائی۔ کمرے میں ہلکا سا اجالا پھیلا لیکن فوراً ہوا سے تیلی بجھ گئی۔ اتنی دیر میں میری نگاہیں سارے کمرے میں گھوم گئی تھی۔ کمرا خالی تھا۔ میں نے ماچس میں سے ایک اور تیلی نکالی اور اسے جلانے لگا اسی لمحے ایک زوردار دھڑام کی آواز ہوئی جیسے کوئی بھاری چیز گری ہو اور ساتھ ہی ٹوٹتی ہوئی لکڑی کی چرچراہٹ سے کمرا گونج اٹھا۔ آواز دینے سے قبل اقبال بھی اٹھ گیا تھا اور اب بستر پر بیٹھا نیند میں ڈوبی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں اپنی جگہ تنہا سا کھڑا رہا۔ آواز کس چیز کی تھی سمجھ نہیں آئی۔ اسی لمحے ایک سایہ سا غیر انسانی تیزی سے کمرے کی کھڑکی کی جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ وہ کسی بھی حالت میں انسان نہیں تھا۔

”کون ہے؟“ میں زور سے چلایا۔

سایہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا۔ میں نے جلدی سے ماچس جلائی۔

سایہ کھڑکی کی سمت لپکا۔ ماچس کی دھندلی روشنی میں کھڑکی کے پاس جو چہرہ دکھائی دیا اسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ منہ سے آواز نہیں نکلی اور آنکھیں گویا پتھرا گئیں۔

کہانی ابھی جاری ہے
بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

تاریک کنارہ

محترم مدیر

السلام علیکم!

یہ سچی کہانی کافی پرانی لیکن سبق بھری ہے۔ جو لوگ بغیر سوچے سمجھے قدم اٹھاتے ہیں ان کا یہی انجام ہوتا ہے۔ اختتام دل تھام کر پڑھیں۔

کوثر خان
(کراچی)

وہ اپنے بدن کے لیے نیا لباس منتخب کر چکا تھا۔

مگر ابھی "بیوی" نام کا اترن اسلم کے تن پر ہی جھول رہا تھا۔ ایک اترن ہی نہیں، اس اترن کی دمچی، چند مریل، سوکھے سڑے بچے بھی تھے، جو ہر سال دہلیز عبور کر کے یوں گھر میں آجایا کرتے تھے جیسے ہاکر کا ڈالا ہوا اخبار پڑا مل جاتا ہے۔

جس وقت اسلم کی شادی ساجدہ سے ہوئی، اس وقت خود اسلم کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ آگے جا کر وہ اس سات آٹھ سالہ بچی کا محبوب بن جائے گا اور یہ بچی جو رشتے میں اس کی سالی تھی بعد میں اسلم کی حیوانی ضرورتوں کی مطلوب ہوگی۔

جس دن ہاجرہ نے بچی سے لڑکی بننے کا راستہ طے کیا تو اسے جوانی کی کال کوٹھری میں پابہ زنجیر کر دیا گیا۔

"یہ اماں آخر کیوں اس قدر پابندی لگا رہی ہیں؟"

"اور یہ کیا ہر وقت کہتی رہتی ہیں کہ میں اب جوان ہوگئی ہوں۔"

ہاجرہ کے کورے ذہن نے یوں خود کو ڈھانپ کر پردوں میں چھپا دینے کے محرکات پر سوچنا شروع کر دیا۔

ہمارے مشرقی بزرگوں کی یہ روایت بھی بڑی عجیب ہے۔ یہ خود ہی ذہن کے سادے صفحے پر جوانی کے لفظ کو جگہ جگہ زبردستی رقم کر دیتے ہیں اور جب اس وقت سے پہلے، شتر بے مہار بھرتی ہوئی بچی کا دم اس کال کوٹھری میں گھٹنے لگتا ہے اور وہ اس کوٹھری سے دیوانہ وار، لال رنگ دیکھے بھینسے کی طرح بھاگ نکلنے کی کوشش کرتی ہے تو اس کے کردار پر حرف آرائی کر کے اسے بدنام کر دیتے ہیں۔

ہاجرہ کا باہر نکلنا، لڑکوں کے ہمراہ کھیلنا، بے دوپٹا پھرنا غرض بھی کچھ اماں کی پابندیوں کی نذر ہو گیا تھا۔

اس موقع پر محلے کی خالائیں، چچیاں، پڑوسنیں یا پھر بڑی بہنیں بھی بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں جو کچے ذہنوں کو دستور جوانی اور آداب بلوغت کا احساس دلاتی ہیں۔

☆☆☆

موسم آہستہ آہستہ تبدیل ہو رہا تھا۔

اماں گڑیا کے کپڑے سیتی ہوئی ہاجرہ کو سویٹر پہننے کی تاکید کرتی ہوئی آلو خریدنے مارکیٹ چلی گئیں تب تھوڑی ہی دیر بعد ساجدہ آپا اپنے شوہر کے ساتھ گھر آگئیں۔ خیر خیریت اور اماں کے متعلق پوچھنے کے بعد ساجدہ آپا اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں بولیں۔ "اری ہجو! تجھے سمجھایا تھا کہ اب دوپٹا اوڑھ کے رہا کر...... اب تو جوان ہوگئی ہے اور ہاں...... گھر کے کام کاج میں دھیان دیا کر۔ اب ان گڑیوں وڑیوں کو سمیٹ کر رکھ دے۔"

"افوہ آپا...... میری گڑیوں کے کپڑے کتنے پرانے ہوگئے ہیں...... اور کام میں کرتی تو ہوں۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"اچھا بکواس مت کر...... جا اپنے چھوٹے دولہا بھائی کے لیے چائے بنا لا۔"

"تم تو نہیں پیوگی ناں؟" ہاجرہ نے جل کر پوچھا۔

"اری جب پانی چڑھ جائے تو آدھا کپ میرے لیے

UUNovels.com

بھی ڈال پھوپھو۔" ساجدہ کی پریشانی بڑی بے بسی تھی۔ وہ کبھی براہ راست اپنے لیے چائے بنوانے کی فرمائش نہیں کرتی تھی۔ ہمیشہ دوسرے کا کام لے کر اپنے لیے چائے بنوالی مگر اس وقت ہاجرہ اپنے من پسند مشغلے میں الجھی ہوئی تھی اس لیے چڑ کر بولی۔

"جب تم بھی بیوی کی تو خود ہی بنالو ناں، میں اپنی گڑیا کے۔۔۔۔"

"مذاق ہے یا نہیں۔۔۔۔ ابھی پھینک دوں گی یہ گڑیا اٹھا کر۔" ساجدہ نے دھمکی دی اور ہاجرہ پاؤں پٹختی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے کیوں پیچھے پڑ گئی ہو بے چاری کے۔ ابھی سے کام کا بوجھ نہ لادو۔ ابھی تو وہ خود ننھی سی گڑیا ہے۔" چھوٹے دولہا بھائی کا انداز، آواز اور الفاظ اس وقت ہاجرہ کو بہت بھلے سے لگے۔

اس کی ساری جھنجھلاہٹ زائل ہو گئی۔

یوں بھی اسے چھوٹے دولہا بھائی سے بڑی رغبت تھی۔ وہ بڑے دلار سے اسلم سے چیز کھانے کے لیے پیسے مانگتی ضدیں کرتی۔

پہلے وہ گھر لوٹتی تھی تو کودتی پھلانگتی ہوئی گھر میں گھستی، مگر اب گھر واپس آتی تو ٹھہری ٹھہری سی چال چلتی، انجانی سوچوں کے حصار میں قید ہوتی اور ذہن ایک انجانی، نامعلوم سی تکرار میں الجھا ہوا ہوتا۔

بستر پر لیٹ کر اب وہ اپنے کورے ذہن کو ٹٹولنے لگی تھی اور یہ سب کچھ خود بخود ہی ہو رہا تھا۔

پھر جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ ذہن کے کورے کاغذ پر چھوٹے دولہا بھائی اسلم کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ سچ ہے کہ دل کسی رشتے کی مروت نہیں کرتا۔

بچپن ہی سے وہ چھوٹے دولہا بھائی کی گود میں کھیلتی چلی آ رہی تھی، مگر اب اسلم کی طرف اٹھتی ہوئی نظروں میں کوئی نامعلوم سی انوکھی اور نئی بات ہوتی۔ ادھر اسلم بھی ان نظروں کی وارفتگی، تبدیلی اور اس اچھوتے نئے پن کو محسوس کر رہا تھا۔ گویا اسے کوئی پیام مل رہا تھا۔

اگرچہ اب ہاجرہ دوپٹے کے طور پر بڑی سی چادر اوڑھے رہتی جس کی موٹی موٹی تہوں میں جوانی کی دھکیں چھپی رہتیں، مگر اسلم کی نگاہ بھی ٹٹول ٹٹول کر رعنائیوں کو اپنے رستے کرتے دیکھ ہی لیتی۔

ایک روز جب مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے موسم بڑا

ہائی ہائی سا ہو رہا تھا تو اسلم ساجدہ کے بغیر ہی آ گیا۔

"چھوٹے دولہا بھائی۔۔۔۔! ایک بات کہوں۔" اماں تھوڑا سا ادھر ادھر ہو گئیں تو تنہائی ملتے ہی ہاجرہ دھیمے سے پکار بیٹھی۔

اس جوانی والی واردات کے بعد وہ پہلی بار اسلم کو مخاطب کر رہی تھی ورنہ اس سے قبل تنہائی میں مخاطب کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔

اسلم ذرا خوش ہو کر ہاجرہ کے قریب آ کر اپنائیت سے بولا۔ "ایک نہیں ہزار باتیں کرو۔"

اسلم کے انداز میں اپنائیت کے علاوہ کچھ ایسی لگاوٹ تھی کہ ہاجرہ اپنے تن بدن میں رینگ جانے والی سنسناہٹوں سے، گدگداہٹوں سے خود میں سمٹ کر رہ گئی۔

"اب میں دوپٹا اوڑھنے لگی ہوں۔" وہ شرما کر قدرے توقف کے بعد بولی۔ "اماں نے میرے نئے کپڑے بنوائے ہیں جن کا دوپٹا وہ اب تک نہیں لائی ہیں، تم لا دو ناں۔"

"چیز" کے لیے کہنے کا رویہ نہیں بدلا تھا بس کہنے والی کے انداز میں تھوڑی سی تبدیلی آ گئی تھی۔

پھر تنہائی میں کسی جوان لڑکی کے ہمراہ باتیں کرتے ہوئے مرد کی شخصیت پر چڑھے چھلکے ابلے ہوئے آلو کے چھلکے کی طرح بڑی آسانی سے اترتے چلے جاتے ہیں۔

"تو جانتی ہے ناں ہاجرہ۔۔۔۔ دوپٹا سہاگ کی نشانی ہوتا ہے۔" اسلم نے ویسے ہی ذومعنی جملہ کہا تھا مگر چادر کی تہوں میں سانسوں کا زیر و بم اسلم کو سمجھا گیا کہ کہیں کوئی خاص بات ہے ضرور۔

پھر کئی روز تک امنگوں کے سورج طلوع ہو ہو کر مجبوریوں کی گود میں ڈوبتے رہے۔ اسلم اور ساجدہ کرائے کے مکان میں قریب کے محلے میں رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اسلم کو دو پاؤں مار کر جب چاہے ہاجرہ کا دیدار کرنے کی سہولت حاصل تھی۔

عشاق کے گھر اگر نزدیک ہوں تو ان کا عشق دور رہنے والوں کی نسبت جلدی ہی پنپ جاتا ہے۔

بچپن میں تو ہاجرہ کچھ ڈھنگ کی بھی تھی مگر جوان ہونے پر تو اس میں کوئی خوبی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ اچھا خاصا کالا رنگ، شکل صورت بہت معمولی اور لوگوں کے لیے اس میں سوائے نوجوان ہوتے خوبصورت بدن کے کوئی کشش نہیں تھی۔ اور پھر اسلم خود بھی ادھیڑ عمر تھا جس کا بڑھاپا سر پہ

UrduNovels.com

ماجدہ کی دن بدن بڑھتی ہوئی
گرمجوشی، والہانہ پن میں بدلتی
دراصل اس کی محبت گہری ہے کم نہیں۔
ایک دن جب اسلم کمرے میں اکیلا تھا ماجدہ، جوان ولولوں سے پُرجوش اٹھی تھی۔ ٹرے میں گرم گرم چائے لیے کمرے میں ہولے ہولے چلتی آ گئی۔

"تم میرا اتنا خیال کیوں رکھتی ہو ماجدہ؟" اسلم نے والہانہ پن سے پوچھا۔

"میں تمہارا خیال رکھتی نہیں بلکہ مجھے تمہارا خیال رہتا ہے۔" وہ عجیب انداز سے بولی۔

"کیوں؟" اسلم نے چائے کا گھونٹ یوں وارفتگی سے بھرا جیسے ماجدہ کو حلق سے من میں اتار رہا ہو۔

"تم میری سوچوں میں ہر وقت رہتے ہو اسلم بھائی...... پتا نہیں کیوں؟"

"کیا تم مجھے صرف اسلم نہیں کہہ سکتیں۔" وہ محویت سے ماجدہ کے سراپے پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

"تب پھر تم بھی مجھے...... جو کہا کرو۔" وہ شرمائی۔

جوانی کی مہک دل اور روح کو معطر کر رہی تھی۔ حسن طلب بن رہا تھا تو عشق کی فطرت کیوں پیار کر بیٹھتی؟

اسلم کے دل میں بھی ریشمی ریشمی سرسراہٹیں ہونے لگیں۔

"ماجدہ کل تک تو میرے آگے کی بچی تھی مگر آج میرے دل کی ملکہ بن گئی ہے۔"

"اچھا!" وہ غضب کے انداز میں اٹھلائی۔

"بول جو کیا تجھے بھی میں اچھا لگتا ہوں؟" اسلم نے جلدی سے آگے بڑھ کر ماجدہ کا ہاتھ تھام لیا۔

اس نے بڑے محتاط الفاظ استعمال کیے تھے کیونکہ تیزی دکھانے سے خود بخود طلب گار دل میں آئی ہوئی "بچی" بدک کر بھاگ بھی سکتی تھی۔

ماجدہ نے ہاتھ چھڑانے کی رسمی سی جدوجہد کی، تب شاطر مرد نے اس کی نیم آمادگی کو تاڑتے ہوئے اس کے کالے کالے ہاتھ پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے اسے اگلے مرحلے کے طور پر ذرا سا قریب کھینچ لیا۔

"اسلم بھائی...... اوہ...... اسلم...... کوئی آ جائے گا۔" ماجدہ نے بھائی کہتے کہتے بے ساختگی سے خود پر قابو پاتے ہوئے شرما کر کہا۔

"اب کسی کے آ جانے سے کیوں ڈرتی ہو...... میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔"

"آپا مجھ سے سنا تو کیا کہیں گی؟" وہ اٹھلا کر بولی۔

"دیکھو ماجدہ، دل پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا، اور پھر وہ مجھ سے اپنے حصے کا پیار حاصل کر چکی ہے۔ میں دس سال سے اسے محبت دے رہا ہوں۔"

"ہاں...... یہ تو ہے۔"

"خود سوچو...... میں ساجدہ کے لیے کیا کر رہا ہوں۔ حتی الامکان اس کی ساری خواہشیں پوری کر رہا ہوں...... لیکن...... اب یہ تیرا حق ہے...... تو ہے ہی اس قابل کہ تجھے چاہا جائے...... تو تو بچپن سے میری گود میں کھیلتی آ رہی ہے اب اگر تو میری آغوش میں......"

اسی لمحے دستک کی تیز آواز نے دونوں کو چونکا دیا۔ وہ دونوں اچھل پڑے۔ دونوں ایک دوسرے کی گرم سانسوں میں پیار کی حدت محسوس کرنے لگے تھے کہ انہیں الگ ہونا پڑا انہیں ایسا لگا جیسے انہیں جنت سے نکال دیا گیا ہو۔

دروازہ کھولا تو سامنے ساجدہ کا چہرہ نظر آیا۔

اس کی شکل دیکھ کر دونوں کے دل کا چور ان کے چہروں پر زردیاں بکھیر کر دبے پاؤں کہیں کھسک لیا مگر بھولی بھالی ساجدہ کچھ سمجھ ہی نہ سکی۔

"ارے رشید کے ابو...... تم ادھر بیٹھے سالی سے باتیں مٹکا رہے ہو اور ادھر میں سودے کے لیے پریشان ہو رہی ہوں۔"

"ہاں ذرا دیر کو بیٹھ گیا تھا...... بتاؤ کیا منگانا ہے۔ میں لائے دیتا ہوں۔"

"بچوں کو چھینکیں آ رہی ہیں۔ ویسے بھی سارے بچے آتے جاڑے کا اثر لے رہے ہیں اس لیے آج آلو بیگن پکائے لیتی ہوں۔" ساجدہ پلو سے بندھے پیسے کھولتے ہوئے بولی۔

"اری بھاگوان...... انڈے بھی گرم ہی ہوتے ہیں۔ آج تو آلو کے ساتھ انڈے پکا لے۔" کچھ دیر پہلے اسلم کی روح چٹخارے دار ذائقے چکھ رہی تھی اب زبان بھی چٹخارے مانگنے لگی۔

ساجدہ نے گھورا اور پھر ترخ کر بولی۔ "بہت حسن کا رہے ہو ناں کہ تمہیں انڈے مرغی پکا پکا کر کھلاؤں؟"

اسلم اپنی کم آمدنی کے متعلق یہ ریمارکس ماجدہ کے سامنے سن کر گھبرا گیا، اگرچہ ماجدہ بچپن ہی سے بہنوئی کو کماؤ بیٹے کا کام کرتا اور بہن کو اسلم سے قلیل آمدنی پر جھگڑا کرتے دیکھتی آ رہی تھی مگر چونکہ وہ نئے رشتے استوار کر رہا

UrduNovels.com

تھا اس لیے کباڑیے کا ذہن ایک بار پھر "بچی" کے بدک جانے سے گھبرا گیا۔

"آپا...... قناعت پسندی کو تو تم قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتیں، جو آمدنی ہے سو ہے...... اسی کو چلن سے خرچ کرنا سیکھو اس سے گزارہ کرنا سیکھو۔" ہاجرہ نے کہا تو ساجدہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

یہ بات ہاجرہ کے ناپختہ ذہن کی دلیل تھی، محدود آمدنی میں روزانہ چولہا جلانے کا ہنر عورت کو اولاد ہی سکھاتی ہے ورنہ پیار کے گیت الاپنے کے دوران تو یہ بات بکواس ہی لگتی ہے۔

"بہن...... اگر تجھے آتا ہے تو مجھے سکھا دے گزارہ کرنا۔" ساجدہ جل کر بولی پھر گردن جھٹک کر دوبارہ گویا ہوئی۔ "کچھ دن کو میرے بچے بھی لے لے، میرا میاں بھی اور میرا چولہا ہانڈی بھی...... پھر گزارہ کر کے دکھا مجھ کو۔"

مگر ہاجرہ صرف "میاں" چاہتی تھی، بچے اس کے بھی ہو سکتے تھے اور چولہا ہانڈی تو ایک مشترک سی چیز ہے۔

☆☆☆

کچھ لڑکیاں فطری طور پر بے حد چالاک ہوتی ہیں، نہ اپنی محبت لوگوں کی نظروں میں آنے دیتی ہیں اور نہ اس کی بازگشت کسی کی سماعت تک پہنچنے دیتی ہیں۔ مگر ہاجرہ اتنی ہنرمند ثابت نہ ہوئی۔

میاں سے بیوی کا تعلق دنیا کا حساس ترین تعلق ہوتا ہے اور یہ اس رشتے کی حساسیت ہی تھی کہ ساجدہ کی نظروں سے شاکی بن کر بہت جلد اس محبت کا سراغ لگا لیا۔

اس نے چند ماہ صبر کرنے کے بعد ایک روز تنہائی میں بری طرح ہاجرہ کو پیٹ ڈالا۔ روتی بلکتی اور زبان چلاتی ہاجرہ کو اس نے ایک بڑی بہن بن کر صلواتیں سنائیں اور ایک بیوی بن کر آئندہ کے لیے خبردار کر دیا، مگر اس کی شفقت نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ ماں کو کچھ بتاتی یا لاہور میں مقیم اپنی بڑی بہن نفیسہ کو کچھ لکھ بھیجتی۔

نفیسہ کا شوہر ادریس الحسن اس خاندان کا واحد پڑھا لکھا اور صاحب جائیداد آدمی تھا۔ دونوں میاں بیوی ذاتی مصلحت یا پھر خدا کی حکمت عملی کی وجہ سے صرف ایک ہی بچے کے والدین بن سکے تھے۔

مگر یہ حکمت ان دونوں کی باہمی چپقلش کا سبب نہ بن سکی تھی۔

پھر یہ ساجدہ کی قسمت ہی تھی کہ چند روز بعد یہ خوشحال جوڑا اچانک کراچی آ گیا ان کی آمد پر خاصی گہما گہمی ہو گئی اور مصروفیت بھی بڑھ گئی۔

یہ الگ بات کہ غریب گھرانوں کی گہما گہمی ایک دن کے قورمے اور دوسرے دن کی بریانی سے بڑھ کر نہیں ہوتی۔ البتہ مصروفیت کے ضمن میں ہاجرہ کو آنے جانے والے مہمانوں کے لیے دن میں کئی بار چائے بنانی پڑ رہی تھی اور اسلم اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔ وہ جب بھی سیاہ چھت والے باورچی خانے میں ہاجرہ کو چائے بناتے دیکھتا خود بھی وہیں جا کر بیٹھ جاتا۔

سالی بہنوئی کو ایک جگہ بیٹھے دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ چولہے پر پکتی، ابلتی چائے کی طرح ان کے جذبات کے چولہے پر چڑھی ہانڈی میں بھی "چاہ" پک رہی ہے، جس میں اب بڑی تیزی سے سطح تک ابال آ آ کر لوٹ رہے ہیں۔

اسلم اس وقت بھی ہاجرہ کے پاس بیٹھا کہہ رہا تھا۔

"ہجو...... رات میں نے تجھے خواب میں دلہن بنے دیکھا...... ویسے تو میں ہر رات تجھے ہی خواب میں دیکھتا ہوں، مگر رات دلہن کے روپ میں دیکھ کر میرا دل تڑپ تڑپ کر رہ گیا۔"

"اچھا...... سناؤ تو خواب میں کیا دیکھا؟"

یہ سوال ہاجرہ نے نہیں بلکہ جذبات کی شورش نے پوچھا تھا۔ اس تشنگی نے پوچھا تھا جو سیراب ہونے کو مچل رہی تھی۔

"میں نے دیکھا...... تو سرخ جوڑا پہنے، زیوروں سے لدی پھندی، مہندی رچے ہاتھوں میں ڈھیر سارے تانبے اور اسٹیل کے برتن لیے چلی آ رہی ہے اور مجھ سے کہتی ہے کہ مجھے یہ برتن بیچنے ہیں، کباڑ میں لوگے یا آدھی قیمت پر۔ اگر تم آدھی......"

"دھت تیرے کی...... خوابوں میں بھی تم اپنے کباڑیے پن سے باز نہیں آتے۔" ہاجرہ جل ہی تو گئی۔

وہ تو کسی خوبصورت منظر کشی اور جذبات سے بھرپور مکالموں کی توقع کر رہی تھی، مگر کسی کباڑیے کے خواب پر اس کا کوئی اختیار نہ تھا۔

ہاجرہ کے یوں بدمزہ ہو کر جھڑک دینے کے باوجود وہ خواب کے ہنڈولے میں جھولتا ہوا بولا۔ "اری ہجو کیا یہ خواب سچ نہیں ہو سکتے؟ تو سچ میں میری دلہن نہیں بن سکتی کیا؟"

"ہمت کرنے سے کیا نہیں ہو سکتا؟"

"میں ساجدہ کی جھگڑالو طبیعت سے ڈرتا ہوں، وہ تو ویسے ہی ذرا سا گھپلا کرنے پر آسمان سر پر اٹھا لیتی ہے...... اور یہ تو پھر اس کے سہاگ میں گھپلا ہے۔ وہ اپنا گھر بچانے کے لیے پاگل ہو رہی ہیں، مگر میں بھی کیا کروں...... میں بھی تمہارے لیے باؤلی ہوئی جا رہی ہوں۔"

"میں سمجھتا ہوں...... پر اپنا ملن......"

"دیکھو یہ دودھ کی قسمت میرے سامنے رکھی ہے میں اس قسمت کی قسم کھا کر کہہ رہی ہوں کہ اگر یہ ملن نہ ہوا تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔"

"دیکھو...... آج تو تم نے مرنے کی بات کی ہے پر آیندہ مت کرنا، کیوں ایسا بول کر میرے دل کو تکلیف پہنچاتی ہے؟"

"دکھ پہنچتا ہے تو کچھ کرو ناں۔" وہ ٹھنکی۔

"جلد بازی سے کام خراب ہو جاتا ہے جو...... میں دھیرے دھیرے ساجدہ کو پٹڑی پر لانے کی کوشش کروں گا...... اب اس سے زیادہ میں اور کیا کر سکتا ہوں۔" اسلم نے بے چارگی جتائی۔

مرد جاہل ہی کیوں نہ ہو مگر مکاری اور عیاری اس کی فطرت میں شامل ہوتی ہے۔ اسی طرح عورت کے پاس چاہے جتنی سمجھ کیوں نہ ہو وہ بے چاری بعض حساس معاملات میں بے وقوف بن جاتی ہے۔

اسلم بھی ساجدہ کے ہڈیوں کے ڈھانچے جیسے بدن سے اب عاجز آچکا تھا اور جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر سامنے ماجدہ کا معصوم ذہن اور کورا بدن تھا اگر اس کے معصوم ذہن میں کوئی قابل نفرت بات بیٹھ جاتی تو گویا وہ ساری زندگی کے لیے لکھ دی جاتی اور بیچارا اسلم کو اس کے کورے بدن سے ہاتھ دھونے پڑتے۔

اس کا ذہن اپنا راستہ صاف کرنے کی ہزار ہا ترکیبیں سوچ رہا تھا [illegible] سوچنا صرف اس بات کا تھا کہ یہ طریقہ اسے ماجدہ سمجھائے تاکہ وہ بھی ساری زندگی ضمیر کے بوجھ تلے دبی رہے۔ نہ کبھی اسے دوش دے سکے اور نہ کبھی سر اونچا کر سکے۔

"کیا وہ تمہارے پٹڑی پر لانے سے آجائے گی؟ سمجھانے بجھانے سے بھی کوئی لڑکی بھلا سوتن لانے پر راضی ہوئی ہے کیا؟" ماجدہ نے کہا۔

"پر تو...... تو اس کی بہن ہے ناں...... کیا مجبوراً وہ اعتراض نہ کرے!"

"کیسی باتیں جیسی باتیں کر رہے ہو اسلم، سہاگ میں کسی کی ساجھے داری......" بات ابھی یہیں تک ہی پہنچی تھی کہ ساجدہ دندناتی ہوئی ان کے سروں پر پہنچ گئی اور ایک دھمکی آمیز، مگر رازدارانہ انداز میں بولی۔

"تم پھر لگے بیٹھے ہو نا اس کے ساتھ لگے ہے...... کوئی اور کام نہیں ہے کیا؟"

"ارے چھوٹی آپا شرم کرو...... کیوں الٹی سیدھی بات کرتی ہو...... پر تو......"

"شرم کرو تم کلموہی...... ایک سوت بن کر کھانے کو تجھے میرا ہی گھر ملا تھا؟"

"کیوں بہن پر الزام لگا رہی ہے ساجدہ، وہ تو ظلم کی اسٹوری سنا رہی تھی مجھے۔" اسلم جلدی سے بول پڑا۔

"جانتی ہوں تم دونوں کیسی اسٹوریاں سنا رہے ہو ایک دوسرے کو......!"

"جا...... جا...... اپنا کام کر...... وہم میں مری جا رہی ہے۔" اسلم بے پروائی سے کہنے لگا۔ ساجدہ اس وقت تو وہاں سے ہٹ آئی مگر پھر شفقت اور مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر دوسرے روز بڑی بہن شمیمہ کو ڈھکے چھپے اور محتاط الفاظ میں سب کچھ بتا دیا۔

"توبہ ہے...... تیری بات پر یقین کرنے کو جی نہیں کرتا ساجدہ۔" شمیمہ کان چھوتے ہوئے بولی۔

"کانوں سنی اور آنکھوں دیکھی بات کہہ رہی ہوں آپا شمیمہ...... اور چلو...... میں نے مان لیا کہ جو دیکھا وہ بھی جھوٹ اور جو سنا وہ بھی میرا وہم تھا مگر اب ماجدہ کا بیاہ ہو جانا چاہیے...... خیر سے سیانی ہوگئی ہے۔"

"ہاں...... لیکن ایک دم سے اتنا پیسا کہاں سے آئے گا؟ میں تو اس مقصد کے تحت بہت تھوڑا سا جوڑ رہی ہوں [illegible]"

[illegible] یہ سب سرسری سے کہا تب ساجدہ جلدی سے بولی۔

"کپڑا لتا اور تھوڑا سا زیور اماں نے بنایا ہوا ہے...... باقی انتظام میں کر دوں گی۔"

"تو کہاں سے لائے گی؟"

"تھوڑا بہت جمع کیا تھا سوچا تھا کرائے کے مکان کی مصیبت ختم ہو جائے گی۔ میں اپنا گھر لے لوں گی، لیکن یہاں تو گھر ہی بگڑنے لگا ہے اس لیے گھر بچانے کو مکان کا پیسا خرچ کر دوں گی۔ کچھ زیور بھی ہے جو مصیبت میں کام آنے سے بہ کر کچھ سے بچا لیا تھا۔ پر اب اسے بھی بیچ دوں

urdunovelist.com

گی۔"

"اول تو خدا نہ کرے کہ ایسا وقت آئے میں ہاجرہ اور اسلم دونوں کو سمجھاؤں گی اور اگر وہ نہیں مانے اور ایسا ہی کرنا پڑے تو دیکھو زیور اِدھر اُدھر اونے پونے بیچنے کی بجائے مجھے بیچ دینا۔"

ساجدہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ "واہ...... جب اتنا ویسا ہے تو کیا آپا بطور ادھار خرچ نہیں کر سکتیں۔ میری مجبوری سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے اگر ان کا اپنا گھر بگڑ رہا ہوتا تو؟"

"بہن مفاد پر اتر آئی" ساجدہ صرف تلخی سے سوچ کر رہ گئی مگر اس کی سوچ کی کڑواہٹ شمیمہ محسوس نہ کر سکی۔

"چلو آپا ٹھیک ہے، بس اب یہ رشتہ بلکہ یہ شادی کرا کے ہی جانا۔"

"مگر کوئی رشتہ آیا ہوا بھی ہے کہ بس یونہی؟" یہ سوال پوچھتے ہوئے شمیمہ صرف ایک بات سوچ رہی تھی کہ زیور خرید کر بیچنے پر کتنا منافع مل سکتا ہے۔

"رشتہ آیا ہوا تو نہیں ہے...... کون ایسی صورت پر رشتہ لے کر آئے گا؟ مگر وہ ہیں ناں فیاض کی خالہ وہ فیاض کے لیے کئی بار کہہ چکی ہیں۔"

"اچھا کب کہا تھا تم سے؟"

"پچھلے ہفتے بھی کہا تھا مگر فیاض ذرا سا بھینگا ہے۔"

"ارے تو کیا ہو گیا...... جذبات کی روانی میں نہ بھینگا پن یاد رہتا ہے اور نہ اود بلاؤ جیسی صورت۔" شمیمہ کا کرنسی والا حساب لگ گیا تھا اس لیے فیاض اگر بھینگا ہونے کے ساتھ لنگڑا اور بہرا بھی ہوتا تب بھی وہ اس موقع پر مفت میں ملنے والا منافع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔

پھر دونوں بہنوں کی مشترکہ کوششوں سے رشتہ طے کرنے کی بات چل پڑی۔

اس موقع پر اسلم تھوڑا سا گھبرایا اور پھر ایک روز موقع ملتے ہی گرم لوہے پر چوٹ مارنے آ گیا۔

"تو تم پرائی ہو رہی ہو ہاجرہ۔" وہ گہرے دکھ کے ساتھ بولا۔

"تمہیں کیا...... میں مروں یا جیوں...... بزدل کہیں کے۔"

"ارے تو...... تو ہی بتا ناں...... کیا کروں میں؟"

"ہٹا دو آپا کو رستے سے ورنہ یاد رکھو فیاض کنوارہ ہے جبکہ تمہارے ساتھ مجھے نئے دنوں میں بھی بچوں کا روگ لگا رہے گا۔ جو آپا زندہ رہی تو وہ بھی ہتھیلی کا چھالا بنی رہے گی۔ جبکہ فیاض سے شادی کر کے مجھے سکون بھی ملے گا اور محبت بھی۔"

"دیکھ...... دیکھ بے وفائی کی باتیں مت کر ہجو۔" آج آخر کار ہاجرہ نے وہ طریقہ بتا ہی دیا تھا لہٰذا اسلم دل ہی دل میں خوش ہو گیا۔

"تم بے وفائی کر جاؤ...... اور میں بے وفائی کی باتیں بھی نہ کروں۔" ہاجرہ منہ پھلا کر بولی۔

"تو پھر...... تو سچے دل سے کہہ رہی ہے ناں کہ میں اسے رستے سے ہٹا دوں؟ پھر بعد میں مجھ کو طعنہ مت دینا کہ میں تیری بہن کا قاتل ہوں...... تیرے کہنے پر ہی میں ایسا کر رہا ہوں۔" یہی الفاظ تو وہ جال تھے جس میں اسلم ہاجرہ کو گھیرنا چاہتا تھا۔

"میں تمہاری محبت میں ایسا کرنے کو کہہ رہی ہوں، کون سا میں اپنی بہن کی دشمن ہوں۔"

"چل بابا...... جیسے تیری مرضی...... تو جیتی...... میں ہارا۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا تو ہاجرہ ہلکے سے مسکرا دی۔

اسلم نے ہار کا کہہ تو دیا تھا مگر مرد کبھی ہارنا نہیں چاہتا اور جہاں کہیں بھی مرد جان بوجھ کر ہارتا ہے تو یہ بات طے ہوتی ہے کہ وہ دراصل جیت رہا ہے۔

☆☆☆

رات کی تنہائی بڑی پراسرار لگ رہی تھی۔

وہ ٹوٹی ہوئی چارپائی پر لیٹی تو مختلف سوچوں کے گرداب میں گھر گئی۔ گھر کے کمروں میں شمیمہ آپا ان کا بیٹا شکیل اور بڑے دولہا بھائی سو رہے تھے۔

اماں آنگن میں پاس ہی سو رہی تھیں۔

جوان ہونے کے بعد اچھوتے جذبوں کو چھونے کے بعد اس نے بھی اِدھر اُدھر رشتے داروں میں، آفتاب، وارث، [illegible] اٹھنے والی کسی نظر میں نظریں دوڑائی تھیں، مگر [illegible] میں پیار کا وہ مخصوص التفات نہ تھا تب ہی تو ہاجرہ کی متلاشی نظریں اسلم پر آ کر ٹک گئی تھیں۔

اسلم نے پیار کی نگاہ کا جواب کچھ اس طرح دیا تھا کہ وہ اپنی سدھ بدھ ہار گئی تھی اور پھر بڑھتے بڑھتے بات اتنی بڑھی کہ اس نے آج خود ہی سگی بہن کو رستے سے ہٹانے کے لیے کہہ دیا۔

اس کا ذہن اسلم کی چالبازی کو نہ سمجھ سکا وہ خود کو ہی مجرم سمجھ رہی تھی۔

urdunovels.com

پھر ہاجرہ نے ذہن ہٹانا بھی چاہا تو اس بات سے ہٹا نہ سکی۔ بار بار وہ رہ کر خیال آتا کہ وہ مجرم بنتی جا رہی ہے۔ اپنی بہن کو مروانے کا اس نے خود کہا ہے، وہ بہن جس نے بچپن میں اسے بھی اولاد کی طرح سمجھا۔

پھر بچپن یاد آتے ہی ساجدہ کی مہربانیاں اس قدر یاد آئیں کہ ہاجرہ کا دم گھٹنے لگا۔

اس نے اٹھ کر دبے پاؤں جا کر پانی پیا۔

مگر جلتے ہوئے اعصاب پر فرق نہ پڑا۔ تب اچانک ہی خون کا جوش اسے تڑپا گیا اس نے سوچا۔

"میری جوانی کی امنگوں کو ایک کنوارہ مل رہا ہے جو میرا ہم عمر بھی ہے...... پھر بہن کی موت کا باعث بننے کا کیا فائدہ؟"

"اسلم ویسے بھی بوڑھا ہو رہا ہے۔ میں جوان ہوں، خوبصورت ہوں (ہر لڑکی کو آئینہ خوبصورت بتاتا ہے) پھر کیا ضرورت ہے کہ ضمیر کی خلش بھی لوں اور سہاگ کے نئے دنوں میں بہن کے بچوں میں سر کھپاؤں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ مجھے اسلم سے محبت ہے، تو محبت میں اس سے فیاض کے ساتھ شادی کے بعد بھی کرتی رہوں گی اور پھر شادی کے بعد تو میرے بہت سے تکلف بھی ختم ہو جائیں گے۔ میں اسلم سے کھل کر مل سکوں گی۔ ہاں ٹھیک ہے...... مفت کا گناہ مول لینے کا کیا فائدہ؟ بس ٹھیک ہے صبح میں اسلم کو آپا کے قتل سے روک دوں گی۔"

ان تمام سوچوں کے بعد آخری بات پر پہنچ کے اس کا ضمیر مطمئن ہو گیا۔ جب ضمیر مطمئن ہوا تو نیند خود بخود ہی آ جاتی ہے۔ وہ بھی تھوڑی ہی دیر میں نیند کی خاموش وادی میں کھو گئی۔ نیند آ جانے سے ... پہلے اس کا دل شدت سے چاہا کہ وہ دوڑ کر اپنی بہن سے جا کر لپٹ جائے۔

☆☆☆

لیکن صبح وہ ایک عجیب ماتم آمیز ہنگامے میں جاگ گئی۔ ہاجرہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھی۔

"کیا ہوا؟"

"اری کم بخت ہونا کیا ہے ساجدہ مر گئی، تیرے نصیبوں سے...... ڈائن کہیں کی۔"

شمیمہ آپا نے ایک دو ہتڑ اس کی کمر پر جما کر کہا۔ وہ دھاڑیں مار مار رو رہی تھیں معلوم نہیں...... یہ آنسو کس نقصان پر تھے؟

"ہائے...... ! یہ کیسے مر گئی ساجدہ آپا؟" ہاجرہ صدق دل سے کلیجہ تھام کر بولی۔

"کرنٹ لگنے...... پر تجھے کیا...... تو تو خوش ہو جا، تا جو کہیں کی......"

"میں نے کیا کیا ہے خوامخواہ مجھے کہے چلی جا رہی ہو۔" ہاجرہ بگڑ گئی۔

"چپ رہ کمینی ورنہ ابھی سارا قصہ اماں کو بتا دوں گی۔"

"کیا قصہ بتا دوں گی؟ دھمکی کس بات کی دے رہی ہو۔" وہ دوپٹہ دوا کر بولی۔

"اچھا، اچھا...... چوری اور سینہ زوری۔" شمیمہ نے آنکھیں نکالیں۔

اپنے مجرم احساس سے مغلوب ہو کر ہاجرہ نے ابھی ابھی فیصلہ کیا تھا کہ بہن کے بچوں پر ماں بن کر ہاتھ ضرور رکھے گی۔

اب جبکہ اپنے اخلاقی جرم سے بچنے کے فیصلے کے باوجود بہن مر ہی گئی تھی تو اب کیا ضرورت تھی کہ محبت سے دامن تہی کرنے کی، لہٰذا اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب یہ بات بڑوں میں پڑ جانی چاہیے۔

پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔

ماں نے جب ساری بات سنی تو سر پیٹ کر رہ گئی، بڑے دولہا بھائی بھی چکرا کر رہ گئے تھے لیکن اس وقت ہاجرہ کو کچھ نہ کہا گیا۔

موت کے گھر میں اپنے پرائے، رشتے ناتے دار سب ہی جمع تھے۔ بات پھیل جاتی تو اس میں اپنی ہی بدنامی ہوتی۔

ماں نے تو ساجدہ اور ہاجرہ دونوں ہی کو ... رکھا تھا اور اب تو ساجدہ جن چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ گئی تھی ان کا خیال بھی اسے ہی رکھنا تھا۔

لیکن فی الوقت کفن دفن کے انتظام اور موت میت کے لیے آنے والوں کے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرنے کے سوا اسے کسی بات کا ہوش نہ تھا۔

کڑوی روٹی کا ذمہ بڑے دولہا بھائی نے لے لیا، ماں نے قرض ادھار کر کے کفن دفن اور میت گاڑی کا انتظام کر لیا اور دیگر کام بھی ان دونوں نے بخوشی اپنے اپنے ذمہ لے لیے۔

اسلم صرف رو رہا تھا۔ ہاجرہ صرف کڑھ رہی تھی۔ پھر

تیجے تک کسی نے کسی سے کوئی بات نہ کی۔ قل کے بعد جب آئے ہوئے مہمان رخصت ہو گئے تب یہ موضوع شمیمہ نے چھیڑا۔

یہ ایک تپتی ہوئی دوپہر تھی۔ گھر کے سارے ہی افراد جمع تھے۔ محلے کے ایک فریج والے گھر سے برف منگوا کر پہلے سب نے ٹھنڈا پانی پیا اور پھر شمیمہ اسلم سے مخاطب ہو کر پُرجوش انداز میں بولی۔ "ہاں میاں...... اب جواب دو...... ساجدہ کیسے مری...... کیسے لگا اس کو کرنٹ؟" یہ کھلا شک کا اظہار تھا۔ مکمل جارحیت تھی۔ مگر اسلم اس غیر متوقع سوال سے بوکھلا گیا۔

"وہ...... وہ...... کپ...... ڑے دھو رہی تھی...... کپڑے دھوتے دھوتے گیلے ہاتھوں اور ننگے پاؤں سے کمرے میں آ کر پنکھا چلانے کے لیے تار اٹھا کر بس پلگ سے لگایا ہی تھا کہ چیخ پڑی اور...... اور جب وہ گھر میں پہنچا تو وہ مر گئی تھی۔" وہ مصنوعی انداز میں رونے لگا۔

"کیوں تم کہاں گئے ہوئے تھے؟"

"گھر میں دودھ نہیں تھا، اس لیے خود اسی نے مجھے دودھ اور سودا لانے کے لیے بازار بھیجا ہوا تھا...... وہ جب بھی کپڑے دھوتی تھی تو تھکن سے نڈھال ہو کر بار بار چائے پیتی تھی۔"

"اور تمہیں یہ ساری صورت حال بتائی کس نے؟" شمیمہ نے کڑے تیوروں سے ایک اور سوال داغا۔

"کاکے نے۔ وہ تو شکر ہوا کہ گھر میں موجود کسی بچے نے اسے نہیں چھوا مگر آپا تم یہ سب باتیں کیوں کر رہی ہو؟ کیا تمہیں مجھ پر شک ہے؟"

"شک نہیں یقین ہے...... ہاجرہ کا ذہن تو معصوم ہے، اسے ورغلانے کی چار سو بیسی تم نے کی ہے اور یہ بات مجھے ساجدہ بتا گئی ہے کہ تم آج کل کس چکر میں ہو۔"

"خدا نہ کرے یہ مجھ پر الزام ہے۔ ساجدہ تو تھی ہی شکی مزاج عورت اللہ اسے جنت نصیب کرے مگر یہ ہاجرہ بیٹھی ہے اس سے پوچھ لو...... کیوں ہاجرہ...... کیا میں نے تم سے کبھی کوئی غلط بات کی ہے؟"

ہاجرہ محبت کے پہلے پہلے اسلم کو ہاتھ تھامے نکل رہی تھی، مخالفت کیسے کرتی، اچھا جلدی جلدی نفی میں گردن ہلانے لگی۔

"منہ چھوڑ کا بھائی کرنٹ...... یہ کچھ کیوں بتانے لگی دیکھو تو کیسی معصوم شکل بنا کر کھڑی ہے۔"

"دیکھو اماں...... آپا برسوں سے مجھے بات بے بات پر مارے بھی جا رہی ہیں اور خوامخواہ کی باتیں بھی سنائے جا رہی ہیں۔ میرا کیا قصور ہے؟" ہاجرہ اپنے موٹے موٹے ہونٹ پھیلا کر رونے لگی اسی لمحے کچھ لوگ تعزیت کرنے آ گئے اور یہ موضوع وقتی طور پر ختم کر دیا گیا۔

☆☆☆

اچھی منصوبہ بندی سے کیے گئے جرائم چھپ بھی جاتے ہیں۔ اسلم کا جرم بھی چھپ گیا۔

ساجدہ کے بیسویں کے بعد یہ موضوع گفتگو پھر چھڑ گیا اور اس بار اسلم نے زیادہ بحث و مباحثہ مناسب نہ سمجھ کر ہاجرہ کی ماں کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"اماں میں تو ویران ہو گیا میرے بچے بن ماں کے رہ گئے ہیں۔ تم آخر کب تک میرے بچوں کو اس طرح سنبھالو گی۔ میں ساری زندگی اسی طرح ہاتھ جوڑ کر رہوں گا خدا کا واسطہ مجھے ہاجرہ کا رشتہ دے دو۔" اسلم کی آنکھوں میں باقاعدہ موٹے موٹے آنسو تھے۔

اس وقت اماں سر تھامے تخت پر بیٹھی اسلم کو تک رہی تھیں، دائیں طرف شمیمہ آپا بیٹھی تھیں اور کچھ دور ایک ستون سے لگے بڑے دولہا بھائی خاموش تماشائی بنے سب کچھ سن رہے تھے۔

ہاجرہ بھی برابر والے کمرے میں دیوار سے چپکی اماں کے جواب کی منتظر تھی۔ دل دھک دھک کر رہا تھا کہ اماں نجانے کیا جواب دیں۔

"نہ بھیا...... میں نہیں کروں گی یہ رشتہ۔" اماں یکا نون کو ہاتھ لگا کر بولیں۔ مگر اس جواب سے قبل وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں شمیمہ سے مشورہ مانگ چکی تھیں۔

"ہاں اماں...... ابھی ہاجرہ ابھی بچی ہے۔ اس مکار کی حال میں [illegible]

[illegible] باتوں میں نہ آنا ورنہ کچھ بعید نہیں کہ کچھ بچوں کی ماں بننے کے بعد ہاجرہ کو بھی کرنٹ لگ جائے۔" شمیمہ نے پان کی گلوری منہ میں دباتے ہوئے کہا۔

"آپا خدا کے واسطے اپنی یہ رٹ ختم کر دو۔" اسلم نے گہری معصومیت سے کہا۔

"بھئی اس رشتے کی مخالفت تو میں بھی کروں گا۔ تمہاری اور ہاجرہ کی عمروں میں زمین آسمان کا فرق ہے اس لیے یہ شادی کچھ جچے گی نہیں۔" بڑے دولہا بھائی نے پہلی بار گفتگو میں دخل دیا۔

"تو پھر مجھے بتاؤ کہ میرے بچوں کا کیا ہوگا؟ اب میں

ان کے لیے کیا کروں؟"

"ان کی فکر چھوڑ وہ تمہارا خون ہیں تو ہمارے بھی کچھ لگتے ہیں۔ بس اب تم اپنی شکل گم کرو یہاں سے۔" شمیم نے کہا تو اسلم نے چہرے پر معصومیت اور بے چارگی کے سارے رنگ سجاتے ہوئے بڑے دولہا بھائی کی طرف دیکھا، اس بھروسے پر کہ مرد، مرد کی طرف داری کرے گا۔

"بچے یہیں رہیں گے اور ان کا خرچا میں برداشت کروں گا۔ تم کبھی کبھی اپنے بچوں سے ملنے آسکتے ہو۔" بڑے دولہا بھائی نے دوٹوک بات کرکے اسلم کو حیران کر دیا۔ شمیم کے لیے بھی یہ غیر متوقع تھا۔

"یہ تو ناانصافی ہے۔" اسلم گھگھیایا۔

"اب جو بھی ہے میرا یہی فیصلہ ہے۔" وہ اٹل لہجے میں کہہ کر اٹھ گئے۔ شمیم آپا بھی ساتھ ہی اٹھ کر چلی گئیں۔

بیٹی داماد کو جاتا دیکھ کر اماں بھی وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ یوں اسلم کمرے میں تنہا بیٹھا رہ گیا۔

یہ ایک طرح کا گھر والوں کی طرف سے اسلم سے اجازت چاہنے کا خاموش مطالبہ تھا جسے اس نے اس وقت بے چوں و چرا تسلیم کر لیا۔

مگر جب آدھی رات گزری تو وہ گھر کی بیرونی دیوار پھاند کر خاموشی سے گھر میں کود آیا۔

ایک بڑھاپے کے کنارے کھڑا اَٹ پونجیا، بدصورت مرد اتنی آسانی سے کسی نوجوان لڑکی کی محبت سے دستبردار نہیں ہوتا۔

مگر شاید گھر کے سیانوں کے علم میں یہ بات نہ تھی جب ہی تو آنگن میں چارپائیاں ڈالے سب بے خبر پڑے سو رہے تھے۔

صحن کی خاموش اور تلگجی فضا میں چار چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں ایک پر اماں، دوسری پر بڑے دولہا بھائی اور تیسری پر شمیم اپنے گیارہ سالہ بیٹے شکیل کے ہمراہ آرام سے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ چوتھی چارپائی خالی تھی۔ اس پر سونے والی، چین کی نیند سونے کی بجائے ہجر کی آگ میں جل رہی تھی۔

اسلم نے اسے چارپائیوں سے کافی دور گھر کے ایک اوراس سے کونے میں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے دیکھا۔

وہ دبے پاؤں، بے آواز چلتا ہوا ہاجرہ کے پاس پہنچ کر خود بھی دوزانوں ہو کر بیٹھ گیا۔

"ہاجرہ......!"

ہاجرہ اچھل پڑی۔

اندھیرے میں۔۔۔ یوں کسی کو سامنے پا کر شاید وہ چیخ پڑتی مگر جب انسان کسی غم میں بے حد مشغول ہوتا ہے تو بہت سے فطری جذبوں کا ارتکاب اس سے نہیں ہوتا اور پھر اسلم نے اس کا نام لے کر پکارا تھا۔

دونوں کی رنگتیں کالی تھیں۔ اندھیرے میں نقوش اس بنا پر بھی نظر نہیں آ رہے تھے مگر ایک دوسرے کے نقش و نگار ذہن میں بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ یہ بات بھی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دل کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

"اسلم......اتم!"

مدھم سی چاندنی یا روشنی کی ہلکی سی کرن بھی نہ ہونے کے باوجود اسلم نے ہاجرہ کی آنکھوں میں وفا کے چراغ آنسوؤں کی صورت جلتے دیکھ لیے۔

"کیوں رو رہی ہے پگلی؟" اسلم نے اپنی انگشت شہادت سے ہاجرہ کے آنسو پونچھتے ہوئے کوشش کی تھی کہ اس کی آواز زورِ جذبات سے ڈگمگاتی محسوس ہو۔

"اسلم......! میں تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔" ہاجرہ خود کو ان لمحوں میں محبت کی سلطنتوں پر حکومت کرنے والی ملکہ سمجھ رہی تھی۔ وہ اسلم کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں کی گرم گرفت میں لے کر دھیمی آواز سے سسک پڑی۔

"ہم جیسے لوگوں پر جب ہر راستہ بند ہو جائے تو پھر ایک نیا راستہ کھلتا ہے......بغاوت کا راستہ۔"

"کیا مطلب!" ہاجرہ کے انداز میں بیک وقت طفلانہ سادگی بھی تھی اور فہم و ادراک کی چمک بھی۔

"بھاگ چل۔"

"پر اس طرح تو میری اماں بدنام ہو جائیں گی۔"

"کون سے ماں باپ؟ یہ لوگ......جنہیں نہ تیری خوشیوں کا خیال ہے نہ میری چاہت کا احساس؟ جو مجھے میرے بچوں سے دور کر رہے ہیں اور تجھے تیرے پیار سے۔"

ہاجرہ اس جذباتی تقریر کے بعد گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگی پھر چند لمحوں بعد بولی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو مگر ہم بھاگ کر جائیں گے کہاں؟"

"یہ سوچنا میرا کام ہے......بس تو چلی چل۔" اسلم نے کھڑے ہوتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں کہا پھر ہاجرہ کو جھجکتا محسوس کر کے خود ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔

پھر ہاجرہ اپنے خوابوں سے ہار گئی۔ وہ تو یوں بھی جاہل اور کم عقل تھی۔ بے سوچے سمجھے مرد کے ہاتھ کی گری

urdunovelist.com

سے جھٹکا، وہ اسلم کا ہاتھ پکڑے دبے قدم اٹھاتے آہستگی سے دروازے کی سمت بڑھ گئی۔
دروازے تک پہنچ کر اسلم نے انگشت شہادت اپنے ہونٹوں پر رکھ کر ہاجرہ کو چپ رہنے کی ہدایت کی اور ایک چوری نظر سوئے ہوئے گھر والوں پر ڈال کر بڑی مہارت سے بے آواز چٹخنی کھول دی۔
وہ دوڑ رہی تھی۔
اور گھر کی دہلیز پار کرتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ وہ نفرتوں، طعنوں کی اس زمین پر محبتوں کا آسمان اتار لائے گی۔ بدنامی اور رسوائی کے کفن کا عروسی جوڑا پہن کر بھروسے کی پالکی میں رخصت ہوتے ہوئے ہاجرہ پُرامید تھی۔

☆☆☆

خاموش گزرگاہ اور گہرے سناٹے میں وہ ہاجرہ کا ہاتھ تھامے تنگ و کشادہ گلیوں میں اتنی مہارت سے چل رہا تھا جیسے صد بار یہاں آچکا ہو۔
پھر کچھ اور چلنے کے بعد اس سفر کا اختتام ہوا اور اسلم بے جھجک ایک مکان میں داخل ہو گیا۔
یہ ایک بوسیدہ اور مکمل طور پر اندھیرے میں ڈوبا ہوا گھر تھا۔ جس کی چار دیواری میں قدم رکھتے ہی ہاجرہ کو گوبر کی بدبو کا ایک زبردست بھبکا محسوس ہوا۔
تب وہ جو چاندنی اور قوس و قزح کی رنگین پڑیا میں بند سے روح پرور اور چمکیلے خواب گٹھڑی میں دبا لائی تھی، وہ چٹاک پر رکھتے ہوئے مجروح ہوتے جذبات سے بولی۔ ”یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟“
”یہ میرے ایک دوست کا گھر ہے۔ میں نے اس سے کچھ دنوں کے لیے کل ہی لے لیا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا تو میرا بڑھا ہوا ہاتھ نہیں ٹھکرائے گی۔ فی الحال تو یہاں بالکل اکیلی رہے گی تاکہ تیرا حسن لوگوں کی نظریں پڑنے سے میلا نہ ہو جائے۔“ یہ آزمودہ حربہ کام دکھا ہی جاتا ہے۔ آپ کو بھی کے حسن کی تعریف کریں۔ اسے حور کہہ دیں تو وہ بھی شرما جاتی ہے جیسے اس وقت ہاجرہ شرما گئی تھی۔ آنکھیں تاریکی سے مانوس ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ چند قدم آگے بڑھے تو آنگن میں بندھی بھینسیں بھی ہاجرہ کو نظر آ گئیں۔
یہ تعفن جس نے آتے ہی ہاجرہ کے احساس کو مجروح کیا تھا شاید ان بھینسوں کی ہی کارستانی تھی۔
اسلم نے آنگن کی پچھلی طرف والے دو میں سے ایک کمرے میں داخل ہو کر کوئی سوئچ دبا کر کمرا روشن کر دیا۔
اندر بھی گندگی اور بساند پھیلی ہوئی تھی۔
”آؤ...... یہاں بیٹھ جاؤ۔“ وہ ایک ڈھیلی ڈھالی چارپائی کی طرف جس پر پھٹے پرانے بستر پر میلی سی چادر بچھی تھی، اشارہ کر کے بولا۔
جیسا بھی تھا بستر تو تھا۔
اس فقیرانہ بستر، اس گوبر کی بساند والے آنگن اور سوراخوں بھری چھت کے نیچے وہ دونوں ایک ہو جائیں گے۔
آدمی سیراب ہو یا پیاس بجھنے کی صورت نظر میں ہو تو تشنگی کے بارے میں سوچنا بھی عذاب لگتا ہے اور یہاں تو پیار کی تشنگی میں ہاجرہ کا رواں رواں جلتا ہوا تھا۔
وہ بغیر کسی پس و پیش کے جا کر نیم دراز ہو گئی۔
وہ سوچ رہی تھی کہ اس کی ذات کے آنگن میں چاروں جانب دھوپ ہی دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ جلد ہی اسلم اس پر چھا کر کسی ایک چھوٹے سے گوشے پر سایہ کردے گا۔ وہ اس کی تو اضع میں لگا ہوا تھا جلدی سے بھاگا بھاگا گیا اور پانی سے بھرا ہوا میلا سا کٹورہ تھامے لوٹ آیا۔
”اسلم...... میں نے کل سے اب تک کچھ نہیں کھایا ہے۔“
”بھینس کا دودھ کاڑھ دیتا ہوں...... پیئے گی؟ چینی بھی ہوگی یہاں!“
”کچا؟“
”نہیں ری...... یہاں چولہا بھی ہے مگر اپلے جلانا مجھے آتے نہیں اور گیس والا چولہا اس گھر میں ہے نہیں۔“
”کچھ اور نہیں مل سکتا؟“ اپلے جلانے کے تصور ہی سے ہاجرہ کی روح فنا ہو گئی۔
”اس وقت نہ تو کوئی دکان کھلی ہوگی اور نہ ہی میرے پاس پیسے ہیں۔ صبح میرا دوست آئے گا تو اس سے لے لوں گا۔ صبح تک دودھ پر ہی گزارہ کر لے۔“
”اچھا...... تو پھر دودھ ہی لا دو۔“ وہ مردہ سے لہجے میں بولی تو اسلم تیزی سے باہر نکل گیا۔
ہاجرہ یوں بھاگ کر اپنے شریک سفر کے ہمراہ اگر کسی عیش محل میں پہنچی ہوتی جہاں جاتے ہی اسے کمخواب کی پوشاک پہنا کر زیور سے آراستہ کیا جاتا اور پھولوں کے گہنوں سے آراستہ کیا جاتا۔ اگر اسے نرم ریشمی بستر بھی میسر ہوتا تو شاید اس کے ذہن میں دور دور تک چھوڑ آنے والے گھر کی یاد نہ آتی۔ پچھتانا تو دور کی بات ٹھہری، مگر اس وقت تو

تنہا سسکا رہی تھی۔
اور بیلن زدہ ماحول۔

اس نے سوچا کہ اس وقت اگر وہ اپنے میں ہوتی تو آرام سے اٹھ کر گیس کے چولہے پر کھانا گرم کرتی اور خوب رج کر کھا لیتی۔

تب وہ اپنی ماں کے گھر کو یاد کر کے اندر ہی اندر دھواں دھار رو پڑی مگر بظاہر اس کی آنکھ سے دو قطرے ہی ٹپکے تھے۔

☆☆☆

متعدد غریب گھرانوں میں غیر تعلیم یافتہ عورتیں غم میں بین کر کر کے روتی ہیں اور خوشیوں کے موقع پر خواہ مخواہ ہی گلا پھاڑ کر چیختی نظر آتی ہیں۔

ہاجرہ کی اماں بھی اس وقت دونوں ہاتھوں سے سینہ اور ماتھا پیٹ پیٹ کر بین کر رہی تھیں۔

"ہائے...... ہاجرہ تجھے دہلیز پار کرنے سے پہلے موت کیوں نہ آ گئی۔"

"ہائے...... یہ کلموئی اس بڑھاپے میں میرے منہ پر کیسی کالک مل گئی۔" اماں رو رہی تھیں اور پاس کھڑی شمیمہ کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار تھے۔

بڑے دولہا بھائی نے اب تک محلے کے تھانے میں اسلم کے خلاف اغوا کی رپورٹ درج کروا دی تھی اور خود بھی چند قریبی ملنے والوں کو ہمراہ لے کر بھی بھاگ دوڑ میں مصروف تھے۔

ساجدہ کے معصوم بچے جو ابھی تک ماں کی بھی جدائی کے عادی نہ ہوئے تھے صبح سے کئی بار اپنے "ابو" (اسلم) کے بارے میں پوچھ چکے تھے۔ مگر اس نئی ہنگامہ آرائی سے بے خبر وہ معصوم جس سے بھی ابو کے بارے میں پوچھتے، ایک ہی جھلایا ہوا جواب ملتا۔

"مر گیا تمہارا ابو۔"

سارا دن، ساری رات ماتم میں گزر گئی۔

ماں کے آنسو تھمتے تھے اور نہ ہی وہ اسلم اور ہاجرہ کو کوسنا بند کر رہی تھی۔ پولیس کو اب تک دونوں کی تصاویر نہیں دی گئی تھیں۔ صرف ہاجرہ کے بارے میں گمشدگی کا اشتہار دیا گیا تھا جس میں گمشدگی کی وجہ ذہنی توازن درست نہ ہونا بتائی گئی تھی اور بھی کئی دیگر سرکاری اور غیر سرکاری کوششیں کی گئیں مگر تین چار روز تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

پھر چوتھی رات تین دن اور راتوں کے پریشان حال یہ لوگ بوجھل بوجھل سے ذہن لیے نیند کے ہاتھوں مجبور ہو کر بے خبر سو گئے۔

اب انہیں کیا خبر تھی کہ نیند ان کی آنکھوں میں ایک اور بدنصیبی بن کر اتر رہی ہے۔ اسلم کئی دنوں سے ہاجرہ کے کانوں میں رس گھولنے کے ساتھ ساتھ زمانے کی اونچ نیچ بھی سمجھا رہا تھا۔

بڑی چالاکی، چالبازی، محتاط الفاظ میں خود کو محفوظ رکھتے ہوئے اسلم اسے اس طرح سمجھا رہا تھا کہ ہاجرہ کو اس کی نیت پر شبہ بھی نہ ہوا۔

یوں خود ہاجرہ نے بھی ان تین دنوں میں محسوس کر لیا تھا کہ گزارہ کرنے کے لیے پیسوں کی شدید ضرورت ہے۔

مکان ملا تھا تو وہ مکان سے زیادہ بھینسوں کا باڑہ لگتا تھا اور پھر یہ باڑہ بھی عارضی تھا۔ زندہ رہنے کے لیے مکان کے ساتھ ساتھ روٹی کپڑا بھی چاہیے تب ہاجرہ نے اسلم کی مرضی کے عین مطابق خود ہی یہ فرمائش ظاہر کر دی کہ اماں کے گھر سے کچھ نہ کچھ لایا جانا چاہیے۔

اور پھر اس نے اسلم کو گھر کا ایک ایک بھید بتا دیا کہ کہاں اس کا زیور رکھا ہے؟ کہاں اس کے جہیز کے کپڑے اور تھوڑی بہت نقدی رکھی ہے؟ اور یہ کہ ان ساری چیزوں پر پڑے تالوں کی چابیاں اماں کہاں چھپا کر رکھتی ہیں۔

حد تو یہ تھی کہ ہاجرہ نے بے جھجک تذکرہ یہ تک بتا دیا تھا کہ مہمان آئی ہوئی شمیمہ کے سامان میں کیا کیا قیمتی چیزیں ہیں اور انہیں کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔

"ٹھیک ہے۔ تم جا کر اماں سے میرا زیور، کپڑے اور تھوڑا سا روپیہ مانگ لاؤ۔"

"اماں اب کچھ بھی دینے پر راضی نہ ہوں گی۔ وہ تو میرے خلاف غصے میں بھری بیٹھی ہوں گی۔ میں نے ان کی بیٹی کو بھگایا جو ہے۔ اس کے علاوہ یہ وجہ بھی ہے کہ ابھی تک ہمارا نکاح بھی نہیں ہوا ہے۔"

"میں تو کئی بار کہہ چکی ہوں۔ یوں تو تم میرے جنم جنم کے اپنے ہو مگر نکاح بھی کیوں نہیں پڑھا لیتے؟"

"میں انکاری کب ہوں۔ دراصل بات تو یہی ہے کہ پیسا نہیں ہے۔"

"تو نکاح میں کون سے پیسے لگتے ہیں؟" ہاجرہ نے بھولپن سے کہا اور اسلم دھیرے سے ہنس پڑا۔

"بڑی بھولی ہے تو بھی۔ مری قاضی پیسے لے کر ہی تو نکاح پڑھاتا ہے اور پھر ہم تو گھر سے بھاگے ہوئے ہیں۔ ہم سے تو کچھ زیادہ ہی پیسے مانگے گا۔" اسلم نے ایک اور حر

چھوڑا۔

وہ جانتا تھا کہ جلد یا بدیر ہاجرہ اس کے مطلب کی بات خود ہی کہہ دے گی۔

"اسلم اماں سے کہنا کہ میں راضی خوشی تمہارے ساتھ گئی ہوں۔ ہم شادی کر رہے ہیں اور بچوں کو بھی لے آنا۔"

"یہ ناممکن بات ہے ہاجرہ۔ یہ سب کچھ کبھی خوشی نہیں ہوسکتا۔"

"آخر کیوں؟" وہ جھلا گئی تب اسلم جھجکتے ہوئے بولا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ بڑے دولہا بھائی نے میرے خلاف تھانے میں پرچا کٹوا دیا ہے۔"

"کیا؟" ہاجرہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

"اس لیے ضرورت کی چیزیں چوری چھپے تو آسکتی ہیں، پر بھاگنے سے کہیں مل سکتیں۔"

"یہ بڑے دولہا بھائی خواہ مخواہ کیوں آگ لگائے جا رہے ہیں۔"

"اماں کی نظر میں اپنے نمبر بڑھا رہے ہیں۔ ساجدہ کے بعد اب اماں کی جمع پونجی اور مکان میں صرف تم دونوں بہنوں کا حصہ رہ گیا ہے۔ اس لیے شمیمہ آپا اور بڑے دولہا بھائی تجھے کاٹ کر یہ سب خود ہتھیانا چاہتے ہیں۔" اسلم نے جلتی دیکھ کر مزید تیل چھڑکا۔

"واہ...... میں کیوں ہتھیانے دوں گی اپنا حصہ نہیں۔ ٹھیک ہے جی...... ان چیزوں پر میرا حق ہے...... تم چوری کر لاؤ۔" یہی تو اسلم اس سے کہلوانا چاہتا تھا۔

اسلم کے لیے ایک دیکھے بھالے گھر میں چوری کرنا، دیوار پھلانگنا کون سا مشکل تھا۔ ادھر کئی دن سے تھکے ہوئے لوگوں کی آنکھیں کئی دن کی نیند پوری کر رہی تھیں لہٰذا صندوقوں کے کھولنے اور چیزیں نکالنے میں اگر تھوڑے بہت کھٹکے کی آواز ہوئی بھی تو گہری نیند کے خراٹوں میں دب گئی۔

☆☆☆

سناٹا جس قدر گمبھیر ہو، چور کے اندر اسی قدر شور برپا ہوتا ہے اور جب یہ شور اور سناٹا باہم ملتے ہیں تو پھر وحشت جنم لیتی ہے۔ ایک وحشت میں دھڑکتے دل کے ساتھ اسلم نے سائیکل گلی کے نکڑ پر روک کر پیدل ہی سفر شروع کر دیا، ہاجرہ کا مکان اس نکڑ سے پانچواں یا چھٹا ہوگا مگر یہ فاصلہ اسلم کو ایک لمبی مسافت لگ رہا تھا۔

کچھ وسوسے، اندیشے سوئیاں بن کر حلق میں چبھ رہے تھے اور ذہن مختلف سوچوں کی اور خیالات کی آماجگاہ ہوا تھا۔

پھر اسلم چار روز پہلے کی طرح آرام سے دیوار پھلانگ کر اندر کود گیا۔ سب سے پہلے اس نے دروازہ کی کنڈی اندر سے کھول کر فرار کا راستہ ہموار کیا، اس کے بعد گردوپیش پہ نظر ڈال کر اندر کمروں کی جانب بڑھ گیا۔

چاروں افراد الگ الگ چارپائیوں پر بے سدھ پڑے سوئے دکھائی دے رہے تھے صرف ان کے خراٹوں کی آواز انہیں زندہ تسلیم کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

ہاجرہ کے بھاگ جانے سے چوتھی چارپائی خالی ہو گئی تھی جس پر اب شمیمہ کا بیٹا شکیل سو رہا تھا۔

صندوقوں سے سامان نکالنے میں کوئی گھنٹا سوا گھنٹا تو لگا مگر خوف اور بوکھلاہٹ کے باوجود تمام مراحل بخیر و خوبی انجام پا گئے۔

وہ کبھی کبھی سوئے ہوئے افراد پر بھی نظر ڈالتا جا رہا تھا کہ یہ احتیاط چور کی فطرت ثانیہ ہوتی ہے۔

اس دوران ایک بار بڑے دولہا بھائی نے اپنی توند کو شاید کسی مچھر کے کاٹنے پر کھجایا تھا، اماں نے کروٹ بدلی تو ان کا دایاں ہاتھ چارپائی سے نیچے لٹک کر پاندان اور اگالدان سے ٹکرا گیا، کھٹکا ہوا تو اسلم کے ہاتھ سامان کی گٹھڑی باندھتے ہوئے لرز اٹھے سب کچھ چھوڑ کر وہ دروازے کے پیچھے دبک گیا۔

مگر مزید کچھ نہ ہوا۔

اسلم نے چند لمحے ساکت کھڑے رہنے کے بعد پھر ہمت کی اور کچھ دیر بعد جب زیور، نقدی اور کپڑوں کی اچھی خاصی وزنی گٹھڑی لیے وہ بیرونی دروازے کی سمت بڑھا جا رہا تھا اس وقت اچانک شکیل بیدار ہو کر رفع حاجت کے لیے اٹھنے لگا۔ معاً اس کی نظر اسلم پر پڑی، مگر اس سے قبل کہ وہ چیختا یا اپنے مفرور خالو کو شناخت کر کے کسی کو جگاتا اسلم نے گٹھڑی پھینک کر جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دوسرے ہاتھ کو شکیل کی نرم گردن پر جما دیا۔

یہ ایک غیر متوقع افتاد آ پڑی تھی۔

شکیل اسے اچھی طرح جانتا تھا اور اس وقت اسے چھوڑ جانے کا مطلب یہی تھا کہ کوئی چور کسی چٹ پر اپنا نام لکھ کر چھوڑ جائے...... صبح شکیل راز فاش کر دیتا۔

دوسری اہم بات یہ بھی تھی کہ اسلم ایک کباڑیہ تھا...... چیزوں کو توڑ مروڑ کر رکھنا اس کی فطرت ثانیہ بن چکا تھا۔

urdusoftbooks.com

اسے لاشعوری طور پر شکیل کی چپ مطلوب تھی اس لیے ایسی حرکت کر بیٹھا جس کا ارادہ نہ رکھتا تھا۔

دکت کر بیٹھا جس کا ارادہ نہ رکھتا تھا۔ بے دردی ہوا جو ایسی بدحواسی میں ہوا کرتا ہے شکیل کی گردن پر نادانستہ طور پر دباؤ بہت زیادہ بڑھ گیا۔ چند ہی لمحوں بعد اس کا معصوم وجود بے جان ہو کر اسلم کے بازوؤں میں جھول گیا۔

اسلم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

یہ کارروائی بے آواز ہوئی تھی۔ اسلم نے غیر معمولی حد تک اپنے اعصاب کو قابو میں رکھتے ہوئے لاش آہستگی سے زمین پر لٹائی پھر گری ہوئی گٹھڑی کو سمیٹا بھلا یہ مال غنیمت ایک قتل کے بعد بھی وہ کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ پھر وہ دبے پاؤں دروازے سے باہر نکل آیا۔

اس نے سوچ سمجھ کر سائیکل کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ اس سواری میں آواز نہیں ہوتی، رات کے گہرے سناٹے میں جاگتے ہوئے علاقائی کتے بھی اس پر نہ بھونکتے کیونکہ اسلم انہی گلیوں کا باسی تھا۔

برق رفتاری سے سائیکل دوڑانے کے لیے پوری قوت سے پیڈل چلاتے کوئی آدھا پون گھنٹا بعد جب وہ ڈربے نما گھر میں داخل ہوا تو اون لدے ہوئے گدھے کی طرح ہانپ رہا تھا۔

تھر تھر کانپتے ہوئے اس نے گٹھڑی ہاجرہ کو تھمائی اور بے سدھ ہو کر چارپائی پر گر پڑا۔

''کیا ہوا اسلم؟'' ہاجرہ نے سوال کیا تو جواب میں لرزتے لبوں سے بامشکل لفظ پانی نکل سکا۔ چوری سے نمٹ جانے کے بعد جسم کے مساموں سے چھوٹتے پسینے، ہاتھ پاؤں کا رعشہ اور دل کی تیز دھڑکن بڑی دیر میں ختم ہوتی ہے۔

ہاجرہ نے پانی پینے میں اسے اپنے بازوؤں کا سہارا دیا تھا۔

''کچھ تو بتاؤ جان...... آخر تمہاری حالت ایسی کیوں ہو رہی ہے؟ کیا کسی نے دیکھ لیا ہے؟'' اسلم کی کیفیت دیکھ کر ہاجرہ کے اعصاب جھنجلائے جا رہے تھے۔ سوکھے لبوں کو پانی کی تراوٹ محسوس ہوئی تو وہ مسکرا اٹھے۔ ''کسی نے نہیں دیکھا مگر میں کوئی پیشہ ور چور تھوڑی ہوں...... تیرے کہنے پر آج پہلی بار چوری کی ہے نا!''

بڑے خلوص سے اسلم نے بیوی کے قتل کی طرح چوری بھی تیرے کہنے پر کر کے یہ جرم بھی ہاجرہ کے سر منڈھ دیا تھا

مگر وہ معصوم نہ سمجھ سکی۔

''تم نے کون سی چوری کی ہے؟ یہ تو میری چیزیں تھیں جو میں نے منگوا لیں۔''

''تو کتنی اچھی ہے میری شہزادی...... میں مرتے دم تک تیرا ساتھ نبھاؤں گا اور زندگی کے کسی موڑ پر جان کی ضرورت پڑی تو میں تجھ پر سے اپنی جان کو صدقہ اتار کر پھینک دوں گا۔''

اسلم نے ہاجرہ کو بازوؤں میں بھرتے ہوئے پیار کی تمام تر شدت سے اس کی جانب دیکھا تو اس کی نظروں کی حدت ہاجرہ کے تن بدن کو گرما گئی۔ جب وہ شرم سے خود میں سمٹتے ہوئے اس کے بازوؤں کے حلقے سے آزاد ہو کر باہر بھاگ گئی۔

☆☆☆

صبح پھیکی پھیکی، اجڑی سی، ماتم کناں محسوس ہو رہی تھی۔

آج پھر دوسری بار اماں کے گھر کے آنگن میں کہرام برپا ہوا تھا۔ پھر عورتیں جمع ہوئی تھیں اور ایک بار پھر ایک جنازہ آنگن میں رکھا تھا۔

اس بار شمیسہ آپا کلیجہ پیٹ پیٹ کر رو رہی تھیں۔

بڑے دولہا بھائی مفتوح حاکم کی طرح لٹے لٹے دکھائی دے رہے تھے اور اماں کو تو اسے کی موت پر سکتہ سا ہو گیا تھا۔

اس چوری اور قتل کی بھی ایف آئی آر درج کروا دی گئی۔ لاش کے پوسٹ مارٹم کے بعد تدفین کی اجازت مل گئی تھی۔

چنانچہ ایک عظیم کہرام کے ساتھ بچے کی تدفین کے بعد ایک بار پھر سب مرزدہ دلوں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

''مجھے تو یہ حرکت بھی اسی مردود اسلم کی معلوم ہوتی ہے۔'' شمیسہ آپا نے سب سے پہلے شک کا اظہار کیا۔

''میرا شبہ بھی اسی پر ہے۔'' بڑے دولہا بھائی کے بعد اماں بولیں۔

''مجھے بھی یہی لگتا ہے اس لیے کہ صندوق باقاعدہ چابی سے کھولے گئے ہیں اور چابیاں کہاں رکھی ہیں یہ میرے اور ہاجرہ کے علاوہ اور کسی کو معلوم نہیں تھا۔ اسی جل جرگی نے پتا بتایا ہوگا۔''

''اس منحوس کا تو نام نہ لو اماں...... اس نے میری گود اجاڑی...... میرے سامنے آجائے تو خون پی جاؤں گی اس

چڑیل کا۔"

"صبر کرو شمیمہ...... میں پھر بھی کہوں گا کہ اصل خطا وار اسلم ہے...... ہاجرہ میں اتنی عقل کہاں کہ......" بڑے دولہا بھائی نے کہا تو شمیمہ آپا نے چڑ کر ان کی بات کاٹ دی۔

"واہ جی...... محبت کرنے، خصم کرنے اور گھر سے بھاگ جانے کی عقل ہے اس میں اور ویسے وہ بچی ہے...... ہونہہ...... یہ بھی ایک ہی رہی۔"

"اچھا بھئی جیسے تم کہو وہی ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک کیوں نہ ہوگا...... اچھا ہے جلدی سے دونوں نامراد گرفتار ہوں۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو شمیمہ...... میں تو ہاجرہ کی ضمانت قبل از گرفتاری کی کوشش کر رہا ہوں...... گھر کی عزت ہے...... وہ تھانے یا جیل جائے مجھے اچھا محسوس نہ ہوگا۔" شوہر کی اس بات پر شمیمہ آنکھیں نکال کر چیخی۔

"ایسی ہوتی ہے عزت!" اس نے کیا خیال کیا ہے ہمارا...... بہن کو اجاڑا، میری گود کو اجاڑا...... اور اب بھی اسے عزت کا خیال ہوتا تو واپس گھر آ جاتی۔" شمیمہ کی بات سن کر اماں سے چپ نہ رہا گیا۔

"نہیں نہیں بیٹی...... یہ میں بھی نہیں چاہتی کہ وہ حوالات یا جیل میں بند ہو، بس پولیس اسے بازیاب کر کے گھر پہنچا دے۔"

"اماں...... اگر اسے سزا نہ ملی تو وہ پھر کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی۔"

"ارے بیٹی تو کیا سمجھتی ہے میں اسے چھوڑ دوں گی؟ ایک بار ذرا میرے سامنے آنے دو حرافہ کو...... کم بخت کی کھال نہ ادھیڑ دی تو میرا نام نہیں مگر تھانہ کچہری ساری زندگی کے لیے کلنک کا ٹیکا بن جائے گا۔"

اماں کی فیصلہ کن بات سن کر شمیمہ نے گردن تو جھٹکی تھی مگر درحقیقت بہن کی بدخواہ وہ بھی نہ تھی۔

☆☆☆

یہ خون ناحق تھا، اور وہ بھی اولاد کا...... بڑے دولہا بھائی کو اسلم کی گرفتاری سے قبل کیسے چین آتا۔

وہ پاگل ہوئے جا رہے تھے کہ بس کسی طرح اسلم گرفتار ہو جائے۔ تب انہوں نے اسلم کی گرفتاری پر انعام رکھ دیا اور ادھر پولیس کی تفتیشی ٹیم کی جیبیں بھر بھر کر بڑی سرگرمی سے تلاش کر رہے تھے۔

آٹھویں دن ان کوششوں کا مثبت نتیجہ برآمد ہوا۔ اسلم اور ہاجرہ کے اس بوسیدہ اور بھینسوں کے باڑے نما گھر میں موجود ہونے کی مخبری کر دی گئی اور وہ مخبر بھی کون تھا؟

اسلم کا وہی دوست، جس کا وہ باڑہ نما گھر تھا۔ پولیس اسٹیشن آ کر اقبالی بیان دیتے ہوئے اس نے بتایا کہ بستی آبادی میں اس کا ایک باڑہ ہے، جس میں وہ دونوں روپوش ہیں۔ اپنا پیشہ اس نے گوالہ اور نام رحمت اللہ بتایا تھا پھر مخبری کے دو گھنٹے کے اندر اندر گرفتاری عمل میں آ گئی۔ رحمت اللہ چھاپہ مار ٹیم کے ہمراہ خود گیا تھا۔ اس نے انعامی رقم کے لالچ میں اسلم جیسے کباڑیے کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔

☆☆☆

اس وقت محلے کے تھانے میں اچھا خاصا ہجوم موجود تھا۔

باوردی سپاہیوں، دیگر عہدیداروں اور وحشت زدہ مجرموں کے علاوہ آنے جانے والے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔

ایس ایچ او کے کمرے میں اسلم پابہ زنجیر اور ہاجرہ ایک لیڈی پولیس کی حراست میں سر جھکائے کھڑے تھے۔ دو اے ایس پی دائیں بائیں متعدد تھے۔ ایس ایچ او کی دائیں طرف ایک انسپکٹر بیٹھا گرفتاری کی روداد سنا رہا تھا۔

کئی مردوں کا ذہن 'مجرم ذہن' ہوتا ہے جو بظاہر بڑی عام سی زندگی گزارتے ہیں مگر وقت پڑنے اور موقع ملنے پر بڑے کامیاب جرائم کر گزرتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ یہ کوئی سنجیدہ نوعیت کے بڑے جرائم ہوں چھوٹے اخلاقی یا سماجی جرائم بھی ہوتے ہیں۔

اسلم کا ذہن بھی ایسا ہی تھا مگر وہ کوئی سخت جان سم کا عادی مجرم نہ تھا اس لیے پولیس کے تشدد کے آگے نہ ٹھہر سکا۔

شاید چوری شدہ نقدی میں سے اس نے اپنے لیے عمدہ لباس خریدا تھا مگر پھٹے ہوئے ہونٹ، سوجی ہوئی آنکھ اور بدن کی چوٹیں، سرکاری مدارات کی گواہی دے رہی تھیں۔ ہاجرہ بھی جہیز کا ایک خوبصورت سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھی۔ دونوں کی عمدہ جامہ زیبی رنگ رلیوں کی چغلی کھا رہی تھی۔

اسلم کی آہ و بکا بتا رہی تھی کہ اس کا بور بور دکھ رہا ہے۔ دو چار وقت کی کڑی دھنائی نے محبت کا نشا ہرن کر دیا تھا۔

ہاجرہ کو البتہ کچھ نہ کہا گیا اس لیے وہ بہ دستور محبت کا راپ الاپے جا رہی تھی۔ حالانکہ بڑے دولہا بھائی نے

ڈولی کے بعد سامنا ہوتے ہی اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بہت سمجھایا تھا مگر وہ بیسویں صدی کی [illegible] رہی تھی۔

انسپکٹر نے پہلے ہاجرہ ہی کا بیان لیا اور وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی "سر...... ہم نے محبت کی ہے، کوئی جرم نہیں کیا۔"

"ہوئے انارکلی کی بچی...... ادھر کوئی مغل اعظم فلم چل رہی ہے؟ سیدھے سیدھے الفاظ میں بات کرو۔" انسپکٹر نے ڈانٹا مگر ہاجرہ پر کوئی اثر نہ ہوا اور گرفتار ہونے کے بعد سے اسلم کو پورے چوبیس گھنٹوں بعد دیکھ رہی تھی لہٰذا سوچے سمجھے بغیر اسلم کو نگاہوں میں جذب کرکے دوبارہ گویا ہوئی۔

"آپ کچھ بھی کہیں یہ شخص میری محبت ہے۔ اب جو اس کا حشر ہوگا وہی میرا بھی ہوگا۔ میں اپنا جرم محبت قبول کرتی ہوں۔ اب تو اس کے ساتھ میرا جینا مرنا ہے۔ جہاں یہ رہے گا وہیں میں بھی رہوں گی۔" اتنا کہہ کر وہ فخریہ انداز میں اسلم کو دیکھنے لگی جیسے اپنے کلمات کی ستائش اور اداؤں پر داد و تحسین مانگ رہی ہو، مگر اسلم بے چارہ اپنی سوجی ہوئی آنکھ کو قمیص کے دامن سے سینک رہا تھا۔ جب وہ کچھ نہ بولا تو ہاجرہ نے ایک بار پھر کہنا شروع کیا۔

"اسلم میرا پیار ہے۔ اپنی بڑی بہن کی حادثاتی موت کے بعد میں نے انہیں اپنانے کا فیصلہ کرلیا ہے اور اس پر قائم رہوں گی۔ میں بالغ ہوں اور اپنی پسند سے شادی کرنے کا مجھے پورا حق ہے اگر ایک روز اور ہماری گرفتاری نہ ہوئی ہوتی تو ہمارا شرعی نکاح ہو چکا ہوتا، بس مجھے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا۔" وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"لے بھئی لے...... بھلا ہو اس ٹی وی، وی سی آر کا جس نے جاہلوں کو بھی قانون سکھا دیے...... ہاں بے...... آ ادھر، مجنوں کی اولاد! اب تو بول کیا کہتا ہے؟" (اس وقت سوشل میڈیا آیا نہیں تھا اس لیے ٹی وی، وی سی آر پر الزام دھر کر سب ہی سرخرو ہو گئے)

انسپکٹر نے اسلم کو مخاطب کیا تو پیچھے کھڑے اے ایس آئی نے اس کی پسلیوں پر ڈنڈا رسید کرتے ہوئے آگے بڑھا دیا۔

وہ زور سے کراہ کر رہ گیا۔

ہاجرہ کو یقین اور بڑے دولہا بھائی کو بھی کسی حد تک توقع تھی کہ اسلم اس موقع پر ہاجرہ سے بھی بڑے زبردست اور طوفانی انداز میں اظہار وفا اور اقرار محبت کرے گا، مگر اسلم نے اب تک تھانہ کچہری نہ جھانکا تھا۔ اس کی معلومات بھی کہاں تک محدود تھیں یوں بھی وہ نرا جاہل تھا لہٰذا سمجھا کہ اپنا جرم اگر دوسرے کے سر تھوپ دیا جائے تو سزا میں نرمی ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی شک کا فائدہ دیتے ہوئے رہا بھی کر دیا جاتا ہے۔ شاید پولیس اسے بھی معصوم گردانتے ہوئے رعایت برت لے اس لیے جب وہ بولا تو پہلے ہی جملے نے ہاجرہ اور بڑے دولہا بھائی دونوں کو چونکا دیا۔

"نہ جی انسپکٹر صاحب...... میں کوئی مجنوں مجھوں کی اولاد نہیں ہوں...... میں تو جی بس اپنی بیوی کا دیوانہ تھا...... اس کا عاشق تھا مگر اس ہاجرہ کی بچی نے مجھے بہکایا، اسی کلموئی نے مجھے ساجدہ کو قتل کرنے کی ترغیب دی اور اسی نے کرنٹ سے ہلاک کرنے کا طریقہ بھی بتایا...... پھر جی...... میں اس کو بھگانے پر بھی راضی نہ تھا...... اسی نے مجھے اپنی اداؤں کے جال اور بے شرمی میں کچھ ایسا پھنسایا کہ میں بہک گیا...... آپ سمجھنے کی کوشش کریں ناں جی...... اگر آپ چھ بچوں کی ماں کے شوہر ہوں اور ایک کنواری سالی آپ کو اپنا سب کچھ دینے پر بار بار تیار ہو تو آخر آپ کب تک برداشت کریں گے...... کب تک پارسا رہیں گے؟"

"یہ...... کک...... کیا کہہ رہے ہو اسلم...... میری جان...... تم نے تو وفا کے ہزاروں وعدے کیے تھے، میرے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھاتی تھیں اور آج...... میرا صدقہ اتار کر اپنی جان پھینک دینے کے دعوے کرنے والا......" شدت جذبات سے ہاجرہ کی آواز کانپ اٹھی اس پر حسرت اور دکھ کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے اور ہر تھپڑ، ہر ذرہ اسلم کے الفاظ تکبیر اسے زخموں سے چور کر رہا تھا۔ وہ تڑپتی روح کے ساتھ بڑی وارفتگی سے اسلم کا ہاتھ پکڑ کر کچھ اور کہنے لگی تھی کہ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر تیزی سے چیخ کر بولا۔

"چپ رہ کالی بلا...... تو نے میرا گھر تباہ کرکے مجھے آج اس جگہ تک پہنچا دیا ہے...... میرا یقین کیجیے انسپکٹر صاحب...... اسی نے مجھے چوری پر بھی راضی کیا تھا۔"

"اوئے ہوئے ہوئے ہوئے...... چوری پر بھی اسی نے راضی کیا تھا کیا بولا تھا بھئی؟" انسپکٹر اسلم کی عیاری کو سمجھ کر مضحکہ اڑانے والے انداز میں پچکار کر بولا۔

"میں نے [illegible] کو بہت سمجھایا کہ یہ تو بہت [illegible] ہوگی کہ میں تمہارے گھر سے [illegible] چوری کروں۔ واپس چل کر اماں سے معافی مانگ کر ان سے تھوڑا سا مانگ لیتے ہیں، میں کما کر واپس کردوں گا تو یہ کہنے لگی کہ اماں نے سب کچھ

میرے جہیز کے لیے ہی تو جمع کیا ہے۔ واپس جانے پر اماں مجھے روک لیں گی اور بہن بہنوئی جو پہلے ہی آگ بگولا بنے ہیں ہماری شادی نہیں ہونے دیں گے۔"

ہاجرہ نے اس بیان پر بڑے دولہا بھائی کی طرف دیکھ کر تیز تیز نفی میں گردن ہلائی تھی اور بڑے دولہا بھائی محض سر ہلا کر رہ گئے تھے وہ پھر اسلم کی جانب متوجہ ہو گئے جو کہہ رہا تھا۔

"اسی نے مجھے چیزوں کے ٹھکانے اور چابی کی خفیہ جگہ بتائی تھی ہاں البتہ قتل کو میں نے قتل نہیں کیا...... یقین کریں جی میں بالکل بے قصور ہوں۔ جو کچھ بھی کیا اسی کے کہنے پر کیا۔"

"ہاں جی...... عورت ذات کو سمجھنا بہت مشکل ہنر ہے وہ چاہے تو کیا نہیں کر سکتی اور کیا نہیں کروا سکتی۔" انسپکٹر نے بیان مکمل ہونے کے بعد ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں طنزیہ کہا تو بڑے دولہا بھائی تیزی سے بولے۔

"نہیں انسپکٹر صاحب۔ یہ انتہائی عیار اور مکار شخص ہے۔ میری سالی ایسی ہرگز نہیں، میں اس کو بچپن سے جانتا ہوں، یقیناً اسی چالباز نے اسے ورغلایا اور اپنا الزام اس وقت میری بھولی بھالی سالی پر تھوپ رہا ہے...... مجھے مجھے......" بڑے دولہا بھائی اتنا کہہ کر یوں اٹک گئے جیسے الفاظ نہ مل رہے ہوں پھر وہ بجائے انسپکٹر سے مخاطب ہونے کے ہاجرہ پر الٹ پڑے۔

"دیکھ لیا تم نے اس ذلیل شخص کا اصل چہرہ؟ اسی کے پیار میں تم نے ماں کی عزت کو روندا...... اسی پر اعتماد کیا تھا ناں...... بولو اب کیا کہتی ہو؟ کیا اب بھی جہاں یہ رہے گا وہیں تم بھی رہو گی، کیا اب بھی تم اسی کے ساتھ جینا مرنا چاہتی ہو؟"

ہاجرہ جواباً کچھ کہنے کے بجائے بلک بلک کر رو پڑی۔

اسلم نے جب ایک اور زخم لگایا، وہ اپنے بیان پر کافی مطمئن نظر آ رہا تھا۔

"انسپکٹر صاحب ان مگرمچھوں کے آنسوؤں پر نہ جایئے گا یہ بڑی چالباز لڑکی ہے جی۔"

اس جملے پر بڑے دولہا بھائی کو ایک مرتبہ پھر غصہ آ گیا اور وہ اسلم پر چڑھ دوڑے، پھر دونوں دامادوں میں گالم گلوچ کا [illegible] کہ بات ہاتھا پائی پر پہنچ گئی جب ایس ایچ او نے ڈنڈا میز پر مار کر اور سپاہیوں نے درمیان میں آ کر انہیں اس وقت تھانے میں ہونے کا احساس دلایا۔

دونوں الگ الگ کھڑے ہو گئے مگر ایک دوسرے کو کھا جانے والی کینہ توز نگاہوں سے گھورے جا رہے تھے۔

اس سے قبل جب بڑے دولہا بھائی نے ضمانت کے کاغذات ہاجرہ کے سامنے رکھے تھے تو اس نے مسترد کر دیے تھے مگر اب اتنا کچھ دیکھنے، اتنا کچھ سننے کے بعد اس میں پیار کا مزید دم بھرنے کی ہمت نہ تھی اس لیے اب جیسے ہی دولہا بھائی نے دوبارہ ضمانت کے کاغذات اسے دیے تو ہاجرہ نے خاموشی سے اس پر انگوٹھا لگا دیا۔

☆☆☆

رات اندھیری اور بے تحاشہ سناٹا سمیٹے ہوئے تھی۔

وہ اپنی برباد تمناؤں کا ماورائی جنازہ لیے خاموش ماتم کر رہی تھی۔ نجانے کون سا پہر تھا مگر وہ جھلنگا سی چارپائی پر لیٹی سوچوں کی لامحدود بیکراں وسعتوں میں محو پرواز تھی۔

اس وقت بھی خیالات کا مرکز گزرے ہوئے واقعات ہی تھے۔ ایک فیصلہ تھا جو ہاجرہ نے تھانے ہی میں کر لیا تھا۔ البتہ اس فیصلے پر عمل درآمد سے قبل وہ سوچنا چاہتی تھی۔

سب کچھ......

گلی ڈنڈا اور کنچے کھیلنے سے جوانی تک......

حجاب سے بے پردگی تک......

اور پھر اسلم کی بے وفائی سے رسوائی تک اپنی پوری ذہنی رفتار سے سوچ رہی تھی۔

پھر سوچ کی اسکرین پر وہ ان چہروں کو ہوا دیتے دیکھ کر چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی جن پر اس کی معصوم اور شدید محبت نے تکیہ کیا تھا۔ ضمیر کی عدالت نے اسے مجرم قرار دیا۔

محبت کی پاکیزگی اور جذبوں کی صباحت نے اسے ملامت کیا کہ اس نے ایک قدر نا شناس کو منتخب کیا تھا۔

بہن اور بھانجے کی روحیں دور آسمانوں میں تڑپ تڑپ کر اس سے اس کے خون کی بلی مانگ رہی تھیں۔

پھر ہاجرہ کسی تنویم زدہ کی سی چال چلتی ہوئی باورچی خانے کی سمت بڑھنے لگی۔

کیونکہ......

اسے معلوم تھا کہ کھٹمل، لال بیگ اور دیگر حشرات الارض کو مارنے والی دوا باورچی خانے ہی میں ایک جگہ رکھی تھی۔

پیار کے اجلے سمندر میں تیرتے تیرتے وہ شل ہو چکی تھی۔ کنارہ بھی مل چکا تھا مگر یہ پیار کے اجلے سمندر کا تاریک کنارہ تھا۔

اس گھر کے در و دیوار کو تیسری موت کی خبر سننی تھی۔

++

گھائل

جناب مدیر اعلیٰ سرگزشت
السلام علیکم!
تنویر نامی نوجوان میری دکان پر اکثر آیا کرتا تھا۔ بقول اس کے، وہ راج شاہی کا رہنے والا ہے اور یہ توہم پرستی کی کہانی اسے اس کے والد نے سنائی تھی جو اس کے چشم دید گواہ تھے۔

عمران قریشی
(کوئٹہ)

ٹرین کی وسل نے مجھے بیدار کردیا۔ وہ پہاڑی علاقے سے نکل کر میدانی علاقے میں داخل ہورہی تھی۔ دور دور تک گرد سے اٹی خشک زمین پھیلی ہوئی تھی جس پر جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ کہیں کہیں چرواہوں کی جھونپڑیاں دکھائی دے رہی تھیں جن کے آگے بکریوں کے ریوڑ کھڑے تھے۔ احاطے کو خشک جھاڑیوں کے ذریعے بند کردیا گیا تھا۔ اس بنجر میدان میں جنگلی جانور نہ ہونے کے برابر تھے۔ بھیڑیوں کی کچھ تعداد تھی جو پہاڑی علاقے تک محدود تھی۔

ٹرین نے دو بار وسل دی۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ راج شاہی کا قصبہ تیزی سے قریب آ رہا تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ زمینوں پر سبزہ دکھائی دے رہا تھا۔ غالباً گندم کی کاشت کی تھی لیکن جب میں نے راج شاہی کو چھوڑا تھا تب قصبے کی زمینیں خالی پڑی تھیں۔ میرے والد صاحب نے ان زمینوں پر کاشت کاری کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن زمینوں کو سوکھا لگا ہوا تھا۔ ان کی مٹی کمزور ہو گئی تھی اس لیے پھر بھی کاشت نہیں ہو سکا۔ والد صاحب کی ناکامی کے بعد کچھ اور زمینداروں نے بھی قسمت آزمائی کی لیکن زمینوں کو آباد نہیں کر سکے۔ پھر نا جانے کیسے اب وہاں گندم کی فصل اگ آئی ہے؟

اسٹیشن قریب آیا تو میری آنکھوں کے سامنے رجی کا چہرہ نمودار ہوا جس کا اصل نام رضیہ تھا لیکن قصبے والے اسے رجی کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ خوبصورت نہیں تھی لیکن نا جانے کیوں مجھے اس کی معمولی شکل میں جہان دکھائی دیتا تھا۔ وہ بالوں میں چنبیلی کا تیل لگا کر رکھتی تھی۔ جسم لاغر تھا لیکن آنکھیں بڑی بڑی تھیں جن میں وہ سرمہ لگاتی تھی۔ وہ ہمیشہ سرخ رنگ کی شلوار قمیص پہنا کرتی تھی۔ مجھے ان کپڑوں میں وہ بہت اچھی لگتی تھی۔ اور جب سیاہ رنگ کی پھٹی پرانی چادر اوڑھ کر بازار سے گزرا کرتی تھی تو میں کتنی دیر ساکت و جامد کھڑا اسے ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتا تھا۔ ان دنوں میرے والد صاحب کے پاس لکڑی کا ٹال تھا۔ چونکہ راج شاہی قصبے کی زمینیں بنجر و ویران تھیں اس لیے قصبے والے جلانے کے لیے لکڑیاں والد صاحب کی ٹال سے لے جایا کرتے تھے اور پھر جب قصبے کے دوسرے سرے پر مولا بخش نے والد صاحب کے مقابلے میں ٹال کھولا تو لوگوں نے وہاں جانا شروع کر دیا لیکن اس کی لکڑی انہیں پسند نہیں آئی۔ والد صاحب جو لکڑیاں شہر سے منگواتے تھے۔ وہ اچھی کوالٹی کی مہنگی لکڑی ہوا کرتی تھی۔ جسے وہ مناسب داموں فروخت کر دیا کرتے تھے اس لیے بچت بہت کم ہوا کرتی تھی۔ تاہم گزر بسر اچھی ہو جایا کرتی تھی۔ مولا بخش زیادہ بچت حاصل کرنے کے لیے سستی لکڑی منگوایا کرتا تھا اور اسے مہنگے داموں فروخت کرتا تھا۔ اس کے تول میں بھی گڑبڑ تھی۔ اس طرح اسے اچھی بچت ہو جایا کرتی تھی لیکن کچھ ہی دنوں میں رہائشی اس سے بدظن ہو گئے اور انہوں نے واپس ہمارے ٹال پر آنا شروع کر دیا۔ مولا بخش کو یہ بات بہت بری لگی اس لیے اس نے والد صاحب کے خلاف باتیں کرنا شروع کر دیں۔ مجھے ان دنوں رجی کے علاوہ اور کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں اس کی محبت میں پاگل ہو گیا تھا۔ وہ بھی مجھے پسند کرتی تھی۔ اس نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اس کی کاجل بھری آنکھیں دل کا حال بیان کر دیا کرتی تھیں اور پھر ایک دن جب وہ ٹال پر لکڑیاں لینے آئی تو والد صاحب کی غیر موجودگی میں، میں نے اپنا حال دل اس کے سامنے بیان کر دیا۔ وہ شرما کر بھاگنے لگی تو میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی کے ساتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں جواب دیے بغیر جانے نہیں دوں گا اور اگر ہاں کہو گی تو کل ہی والد صاحب کو تمہارے گھر بھجوا دوں گا اور اگر انکار کرو گی تو قصبے کو چھوڑ کر شہر چلا جاؤں گا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ہاتھ چھڑا کر ٹال سے باہر بھاگ گئی۔ اس کی ادا نے میرا دل موہ لیا۔ رات کو میں نے والد صاحب سے بات کی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"مجھے رجی بہت پسند ہے۔ تاہم اگر نہ بھی پسند ہوتی تو میں انکار نہ کرتا کیونکہ مجھے تمہاری خوشی مقصود ہے میں کل ہی اس کے باپ سے بات کرتا ہوں۔"

میں مطمئن ہو گیا۔ اگلے دن والد صاحب رجی کے گھر گئے۔ اس کے باپ کا نام اللہ دتہ تھا۔ اس کی قصبے میں نائی کی دکان تھی جو اچھی چلتی تھی لیکن وہ مطمئن نہیں تھا وہ رجی کی شادی کرنے کے بعد شہر جا کر طبع آزمائی کرنا چاہتا تھا۔ والد صاحب نے جب بات چیت کی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ان دنوں چونکہ راج شاہی میں لڑکیاں کم تھیں اس لیے شادی کے لیے اچھی خاصی رقم مانگی جاتی تھی۔

اسے سوچتا دیکھ کر والد صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ "مجھے راج شاہی کی یہ رسم بالکل پسند نہیں ہے۔ لڑکیوں کے نام پر رقم مانگنا کوئی اچھی بات نہیں ہے لیکن چونکہ میرے لڑکے کی خوشی اسی میں ہے اس لیے میں انکار نہیں کروں گا۔"

اللہ دتہ کے چہرے پر خوشی کے تاثرات پیدا ہوئے۔ تاہم وہ انہیں چھپاتے ہوئے بولا۔ "میں خود اس کے خلاف ہوں لیکن کیا کروں میری دکان اچھی نہیں چل رہی ہے۔ اس لیے شہر جا کر کام کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے اچھی خاصی رقم کی ضرورت ہے۔ یہ زیادہ نہیں ہے مجھے صرف دس ہزار روپے چاہیے۔"

والد صاحب کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات پیدا ہوئے۔ میں جن دنوں کی بات کررہا ہوں ان دنوں یہ رقم بہت زیادہ تھی۔ وہ اس رقم میں ایک نہیں دو دکانیں کھول سکتا تھا۔

والد صاحب کو پریشان ہوتا دیکھ کر وہ بولا۔ "آپ کے آنے سے پہلے شرفو اپنے لڑکے کا پیغام لے کر آیا تھا۔ تب اس نے دس ہزار دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اگر دو تین دنوں تک رقم لے آیا تو میں انکار نہیں کروں گا۔"

والد صاحب نے اسے جلد جواب دینے کا وعدہ کیا اور اٹھ کر گھر سے باہر آگئے۔ مجھے معلوم تھا کہ اللہ دتہ نے جھوٹ بولا تھا۔ شرفو کا لڑکا رجی سے آٹھ دس سال تو ضرور چھوٹا تھا۔ ہر چند راج شاہی میں ایسی بہت سی شادیاں ہوئی تھیں جن میں لڑکا چھوٹا اور لڑکیاں بڑی تھیں لیکن ایسے بے جوڑ رشتوں کے لیے اتنی تگڑی رقم دینے کے متعلق میں نے کبھی نہیں سنا تھا۔

والد صاحب نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مجھے دلاسہ دیا۔ "تم فکر نہ کرو۔ میں رقم کا بندوبست کرلوں گا۔ تمہاری شادی کے لیے اگر مجھے ٹال بھی فروخت کرنا پڑا تو میں دریغ نہیں کروں گا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور ہم گھر آگئے۔ اگلے ہفتے والد صاحب نے رقم کا انتظام کرلیا۔ انہوں نے ٹال فروخت نہیں کیا تھا۔ ان کے پاس قصبے سے باہر کچھ زمین موجود تھی جو بنجر پڑی تھی لیکن مناسب داموں فروخت ہوگئی۔ کچھ جمع پونجی گھر میں پڑی تھی۔ اس لیے انہوں نے اگلے ہفتے رقم اللہ دتہ کے میل سے بھرے ہوئے ہاتھوں پر رکھ دی۔

اس نے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے والد صاحب کو بتایا کہ یہ رقم اس کے پاس ان کی امانت کے طور پر پڑی رہے گی اور جیسے ہی شہر میں اس کی دکان چل نکلی تب وہ رقم واپس کردے گا اور اس رقم کی طرح رجی بھی امانت کی طرح اس کے گھر میں رہے گی۔ والد صاحب جب چاہیں اسے لے جاسکتے ہیں۔

میں والد صاحب کے ساتھ خوشی خوشی گھر آگیا اور اگلے دن میں نے رجی کو چاندی کی انگوٹھی تحفے میں دی۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ اتنا مہنگا تحفہ اسے پہلے کسی نے نہیں دیا تھا۔ ہماری یہ ملاقات ریلوے اسٹیشن کی سنسان عمارت کے سامنے رکھے ہوئے بنچوں پر ہوئی تھی۔ وہاں کوئی نہیں آتا تھا

لیکن یہ میری خام خیالی تھی۔ مولا بخش نے مجھے انگوٹھی پہناتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس عرصے کے دوران اس کا ٹال دیوالیہ ہوچکا تھا اور وہ اسے فروخت کرنے کے بعد کچھ اور کرنے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ ٹال کے تباہ ہونے کا قصور وار والد صاحب کو گردان رہا تھا اور اس کا لڑکا حضور بخش بھی خفا خفا سا تھا۔ تمام راج شاہی میں یہ بات گردش کررہی تھی کہ میری بات رجی کے ساتھ طے پاچکی ہے اس لیے مجھے انگوٹھی پہناتے ہوئے دیکھ کر وہ جل بھن کر رہ گیا اور پاؤں پٹختا ہوا قصبے کی طرف چلا گیا۔ یہ اس ملاقات سے چند دنوں بعد کی بات ہے۔ رات کو جب ہم کھانا کھانے کے لیے دسترخوان کے گرد بیٹھے تو اچانک ہی دروازہ کھٹکا۔ میں نے جاکر دیکھا تو اللہ دتہ ہاتھوں میں سیاہ تھیلا پکڑے ہوئے کھڑا تھا۔ میں چونک کر رہ گیا کیونکہ والد صاحب نے اسی تھیلے میں رقم ڈال کر اللہ دتہ کے حوالے کی تھی۔ میں نے کانپتے ہوئے دل کے ساتھ آنے کی وجہ دریافت کی۔

وہ سرد لہجے میں بولا۔ "میں رقم واپس کرنے آیا ہوں۔ رجی شادی کے لیے تیار نہیں ہے اور میں زور زبردستی کا قائل نہیں ہوں اور پھر تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں شہر جانے والا ہوں تو وہ بھی میرے ساتھ ہی جائے گی۔ میں اس کی شادی وہیں کروں گا۔"

والد صاحب کے کانوں میں اس کی آواز پہنچ گئی تھی اس لیے وہ باہر آگئے اور اللہ دتہ سے مخاطب ہوئے۔ "اللہ دتہ امانت میں خیانت کیوں کررہے ہو، رجی اب میری بہو ہے۔ تم اسے شہر نہیں لے جاسکتے۔"

اللہ دتہ پھٹ پڑا۔ "ابھی صرف بات چیت ہوئی ہے نکاح نہیں ہوا، اس لیے رشتے سے انکار سمجھو۔ میں رقم واپس دینے آیا ہوں یہ میری شرافت ہے۔ اگر شہر لے جاتا تو مجھے ڈھونڈتے رہتے۔"

والد صاحب غصیلے لہجے میں بولے۔ "تمہیں شاید اپنی عزت کا کوئی لحاظ نہیں ہے لیکن مجھے ہے۔ تمام راج شاہی جانتا ہے کہ میرے لڑکے اور تمہاری لڑکی کی بات چیت طے ہوگئی ہے اور اب تم کہہ رہے ہو کہ رجی کو رشتہ منظور نہیں ہے۔ کیا وہ یہ بات جرگے کے سامنے کہہ سکتی ہے۔"

اللہ دتہ نے ڈھٹائی کے ساتھ کاندھے اچکائے۔ "اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے کہ بات چنڈال میں جائے اور تمام قصبہ دونوں خاندانوں پر تھو تھو کرے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں اپنی لڑکی کی خوشی کے لیے یہ ذلت برداشت

کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "لیکن میں ایسا نہیں چاہتا ہوں۔ پنڈال میں جانے سے رجی کی عزت نیلام ہو جائے گی اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ رشتے سے انکاری نہیں ہے بلکہ اسے مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ انکار کر دے۔ تم اسے کل تین بجے ریلوے اسٹیشن لے آنا میں اکیلے میں اس سے بات چیت کروں گا۔"

اللہ دتہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تو پھر ٹھیک ہے میں اسے لے آؤں گا۔ اگر اس نے انکار کیا تو دوبارہ اس سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔" اس نے رقم کا تھیلا والد صاحب کے ہاتھوں میں پکڑایا اور اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

اگلے دن دوپہر کو تین بجے میری اور رجی کی ملاقات اسٹیشن پر ہوئی۔ اس کے ساتھ اللہ دتہ آیا تھا لیکن وہ اسٹیشن کے باہر ہی ٹھہر گیا تھا۔ رجی اکیلے پلیٹ فارم پر آئی تھی۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ اس نے چاندی کی وہ انگوٹھی پہن رکھی تھی جو میں نے اسے تحفے میں دی تھی۔

کچھ دیر چپ رہنے کے بعد میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھاما پھر پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "مجھے پورا یقین ہے کہ تم پر زور زبردستی کی جا رہی ہے ورنہ تم انگوٹھی کو اتار دیتیں۔"

وہ رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "ہم آج کے بعد دوبارہ نہیں ملیں گے۔ اگر تمہیں میری ذرا سی بھی پروا ہے تو یہاں سے دور چلے جاؤ اور آئندہ یہاں نہیں آنا۔"

مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ رٹے ہوئے طوطے کی طرح سبق پڑھ رہی ہے اس لیے میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "اللہ دتہ نے تمہارا سودا کتنے میں کیا ہے۔ اس سے کچھ زیادہ میرے والد بھی دے سکتے تھے۔ تمہارے باپ نے بات ہی نہیں کی۔"

اس دفعہ رجی سچ بولی۔ "مولا بخش نے پندرہ ہزار روپے دیے ہیں اور کل رات میرا نکاح بھی پڑھا دیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تم مجھے بھول جاؤ۔"

میں ہکا بکا رہ گیا۔ پندرہ ہزار کی رقم بہت زیادہ تھی۔ اگر والد صاحب ٹال کو فروخت کر دیتے تو بھی اتنی رقم کا بندوبست نہیں کر سکتے تھے۔ مولا بخش نے نا جانے کیسے بندوبست کر لیا تھا۔

میں نے افسردہ لہجے میں رجی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "مولا بخش کے لڑکے کو میں اچھی طرح جانتا ہوں وہ چرسی ہے۔ تمہاری زندگی تباہ کر دے گا۔"

رجی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرا دل پسیج گیا۔ میں نے اس کے دوسرے ہاتھ کو تھامنے کی کوشش کی لیکن وہ جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ پھر روتے ہوئے بولی۔ "اگلے ہفتے وہ مجھے رخصت کر کے اپنے گھر لے جائے گا۔ اس کے بعد شاید ہی کبھی ہماری ملاقات ہو اس لیے مجھے بھلانے کی پوری کوشش کرنا۔ بس میرے پاس اتنا ہی وقت تھا ورنہ تم سے اور بھی بات کرتی۔ خدا حافظ۔" اس نے سیاہ چادر کے ساتھ آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا اور اسٹیشن سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

ٹرین نے دوبارہ وسل دی اور میری سوچوں کے سلسلے کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ راج شاہی کے اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ وہی اسٹیشن جہاں میں چھپ چھپ کر رجی سے ملا کرتا تھا۔ جہاں میرے دل میں اس کے لیے محبت پیدا ہوئی تھی اور پھر جہاں چند سال پہلے میرا دل ٹوٹا تھا۔ میں اس کے بعد شہر چلا آیا، دوبارہ راج شاہی نہیں گیا۔ جب میں گاؤں سے جا رہا تھا تو میرے بچپن کا دوست، علاقے کے چودھری کا بیٹا جمال شاہ نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔ والد صاحب بھی ٹال فروخت کرنے کے بعد میرے ساتھ ہی شہر چلے آئے تھے یہیں گزشتہ سال ان کا انتقال ہو گیا اور میں اکیلا..... رہ گیا تھا۔ اب پرانی یادوں کی وجہ سے یہاں آیا تھا۔

ٹرین کا ڈبا اس بینچ کے بالکل سامنے جا کر رکا۔ جہاں میری اور رجی کی آخری ملاقات ہوئی تھی۔ میں بینچ پر بیٹھ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرے ساتھ ہی بیٹھی ہے اور اداس نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔

میرے کاندھے پر عقب سے کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ وہ فتح تانگے والا تھا جسے سب فتو کے نام سے پکارتے تھے۔ میں نے اٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ مجھے اسٹیشن سے باہر لے آیا جہاں اس کا تانگہ کھڑا تھا۔ میں فتو کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور تانگہ قصبے کی طرف بھاگنے لگا۔ تب میں نے فتو کے سراپے کا جائزہ لیا۔ وہ اپنے گھوڑے کی طرح بوڑھا ہو گیا تھا۔ حالانکہ اتنا وقت نہیں گزرا تھا۔ تب یکدم مجھے رجی کا خیال آیا۔ موسم نے اس پر بھی خزاں طاری کر دی ہوگی۔

میں نے فتو سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ "قصبے والے کیسے ہیں۔ اب تو سب کچھ بدل گیا ہوگا۔ بہت سے نئے پودے نکل آئے ہوں گے اور بہت سے پرانے درخت گر گئے ہوں گے۔"

اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "وہاں کچھ نہیں بدلا۔ سوائے جمال شاہ کی زمینوں کے۔ ان پر اتنی فصل لگتی ہے جتنی کہ کسی زرخیز زمین پر بھی نہیں لگتی ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "راج شاہی میں فصلوں کا کیا کام......! یہ تو بنجر علاقہ ہے۔ پانی کی بھی قلت ہے۔ شاہ جی نے فصل کیسے لگالی۔"

فتو نے کاندھے اچکائے۔ "کسی کو کچھ معلوم نہیں، تمہارے جانے کے بعد دو عجیب باتیں ہوئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کالی پہاڑی سے جھرنا پھوٹ گیا اور دوسرا یہ کہ جمال شاہ کی زمین فصل دینے لگی۔ پہاڑی کے قریب جو نیا تالاب خود بخود بنا ہے اچانک ہی وہ خونی ہوگیا ہے، وہاں سے آئے دن قصبے والوں کی لاشیں ملتی رہتی ہیں۔ پولیس والوں نے تحقیقات کیں تو معلوم ہوا کہ پہاڑی کے اوپر سے آبشار گرنے لگا ہے نیچے ایک تالاب بن گیا ہے حیرت کی بات ہے اس تالاب میں بھنور بنتا ہے جو کسی بھی انسان کو اپنے اندر کھینچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس تحقیق کے بعد پولیس والوں نے قصبے کے رہائشیوں کو وہاں جانے سے منع کردیا لیکن لاشیں اب بھی ملتی ہیں۔"

میں نے بیزاری کے عالم میں کہا۔ "مجھے اس معاملے سے کیا مطلب۔ تم یہ بتاؤ کہ مولا بخش اور اس کا لڑکا حضور بخش کیسے ہیں ان کا تال ہے یا نہیں؟"

فتو نے بتایا۔ "مولا بخش گزشتہ سال گردن توڑ بخار کی وجہ سے مرگیا۔ تال تو اس نے تب ہی فروخت کردیا تھا جب اللہ دتہ کی لڑکی کے لیے اس نے تھوڑی رقم دی تھی۔"

میں نے دوبارہ پوچھا۔ "میرے خیال میں حضور بخش نے اللہ دتہ کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ وہ دونوں اب کیسے ہیں؟"

فتو نے افسردہ لہجے میں بتایا۔ "کسی کا گھر اجاڑ کر کوئی اپنا گھر بھلا کیسے بسا سکتا ہے۔ تمام قصبے کو معلوم ہے کہ وہ تمہاری منگ تھی جسے اللہ دتہ نے تھوڑی سی رقم کے لیے مولا بخش کے ہاتھوں فروخت کردیا اور پھر مولا بخش کے مرنے کے بعد اس کے لڑکے حضور بخش نے اس کی کمائی کو دونوں ہاتھوں سے اڑا دیا۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ وہ چرس پینے کا عادی تھا اب بھی گلیوں میں گھوم پھر کر بھیک مانگتا ہے اور پھر چرس پی کر کہیں پڑ جاتا ہے۔"

میں نے رجی کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا۔ "وہ شاید اپنے باپ کے پاس شہر چلی گئی ہے کیونکہ کافی عرصے سے دکھائی نہیں دی۔"

میں مایوس ہوگیا۔ جس کے لیے شہر سے قصبے میں آیا تھا۔ وہ قصبہ چھوڑ کر شہر چلی گئی تھی۔ میں تانگے سے باہر دیکھنے لگا۔ راج شاہی سے بہت پہلے شاہ جی کی زمینوں کی شروعات ہوئی۔ میری آنکھیں حیرت کے مارے پھٹے گئیں۔ وہاں گندم کاشت کی گئی تھی اور ہریالی کا یہ عالم تھا کہ خشک زمین دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ نا جانے اس نے بنجر زمین کو کیسے آباد کیا تھا۔ تاہم ان زمینوں کے علاوہ قصبے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ سوائے اس کے کہ اب قصبے سے کچھ ہٹ کر جمال شاہ کی وسیع وعریض حویلی موجود تھی۔ جس کا دروازہ قلعے کے پھاٹک جیسا تھا۔ نوکروں نے اسے کھول دیا اور فتو کا تانگہ پکی سڑک پر سے ہوتا ہوا حویلی کے مہمان خانے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ وہاں جمال شاہ میرا منتظر تھا۔ میرے آنے کا سن کر اس نے فون پر وعدہ لیا تھا کہ میں اس کی حویلی میں ٹھہروں گا تاکہ ہم گزرے ایام کو یاد کرسکیں حالانکہ بچپن میں ہم دوست نہیں تھے۔ وہ بڑے

"ہر زبان کی لٹریچر میں زیادہ نثر کو دخل ہے۔ شاعری کو اگر اس کی شکل وصورت اور نازکی کی وجہ سے محض جی بہلانے کے لیے چاہیے تو نثر کی قدر بیاہی عورت کی طرح زیادہ سمجھے کہ اس سے گھر کی آبادی ہے۔ ہماری زبان کی بربادی کی وجہ یہی ہے کہ ہم نے شاعری کو اس طرح چاہا جس طرح اہلِ عشق شاہدانِ بازاری کی محبت میں گھر کی عورتوں سے غافل ہوجاتے ہیں۔ اردو نثری کی طرف توجہ بہت کم کی گئی ہے۔ کچھ سوچا، نظم کی طرف جھکا۔ ہر زبان کے لٹریچر میں پہلے نثر کو ترقی دینی چاہیے۔ تمام کلاسیکل زبانیں اس لیے لاجواب سمجھی جاتی ہیں کہ انھوں نے نثر میں کمال کردیا۔ نثر زبان کی حسنِ صورت ہے اور نظم محض زیور۔ پہلے شکل اچھی چاہیے پھر زیور کا بھی لطف ہے۔ اچھی صورت پر انسان کا مرنے کو جی چاہتا ہے اور زیور چرانے کے لیے ہے مرنے کے لیے نہیں۔"

(صلائے عام "شمارہ اول" 1908ء)

urdunovels.com

باپ کا بیٹا تھا اس لیے وہ اکڑ کر چلتا اور میں اس گھمنڈ کو توڑتا رہتا۔ ہم ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ ساتھ اسکول جاتے میں اسے کسی نہ کسی بات پر نیچا دکھا دیتا۔ لیکن صبح ملتے ہی اس نے مجھے گلے سے لگا لیا اور ہم بیٹھک کی طرف آ گئے۔ وہاں دسترخوان لگا ہوا تھا۔ ہم نے سرسری بات چیت کے دوران کھانا کھایا اور پھر سبز چائے پیتے ہوئے میں نے تجسس بھرے لہجے میں اس سے اس کی سرسبز زمینوں کے متعلق پوچھا تو اس نے فخریہ لہجے میں بتایا۔

"مجھے ان پر فصل لگانے کے لیے سو جتن کرنا پڑے ہیں۔ تب جا کر کہیں انہوں نے سونا اگلنا شروع کیا۔"

"مگر یہ ہوا کیسے کون سے جتن کیے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ایک راز ہے۔" اس نے ٹالنے کی کوشش کی مگر میرے اصرار پر وہ مذاق میں بولا کہ میں نے بزرگوں سے سنا تھا کہ پہلے کے لوگ کھیتوں میں انسانی بلی دیتے تھے۔ انسانی خون چھڑکتے تھے تاکہ فصل اچھی ہو، میں نے بھی یہی کیا ہے۔" اس نے ایک آنکھ دبا کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نے بھی سنا ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے قبل کھیتوں میں انسانی بلی چڑھائی جاتی تھی۔ صرف خون ہی نہیں گوشت اور ہڈیاں بھی کھیتوں میں ڈالتے تھے۔"

"صحیح سنا ہے۔ میں نے بھی یہی کیا ہے۔" جمال شاہ ہنستے ہوئے بولا۔ "مگر کھاد بھی خصوصی استعمال کرتا ہوں۔"

مجھے اس کی باتوں پر قطعی یقین نہیں آیا لیکن میں فضول کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا تھا اس لیے چپ رہا۔ سبز چائے پینے کے بعد وہ مجھے لے کر ساتھ والے کمرے میں آ گیا جہاں میرے لیے بستر لگا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بستر پر بٹھاتے ہوئے بتایا۔

"میں صبح تمہیں تمہاری محبوبہ سے ملواؤں گا۔ میں نے چند دن قبل اس سے شادی کی ہے۔ اس سے ملاقات کر لو۔ وہ تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔" وہ فاتحانہ قدموں کے ساتھ چلتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں ہکا بکا بیٹھا سوچتا رہا کہ اس نے کہا کیا ہے اور پھر مجھے اندازہ ہو گیا کہ رجی کے شوہر حضور بخش نے اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے اسے جمال شاہ کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہوگا۔ یعنی رجی دوسری دفعہ بک چکی تھی۔ اگر میں راج شاہی کو چھوڑ کر نہ جاتا تو کچھ رقم خرچ کر کے اسے حاصل کر سکتا تھا۔ انہی سوچوں کی وجہ سے رات کو مجھے دیر سے نیند آئی۔

☆☆☆

صبح میں نے عجلت کے عالم میں ناشتا کیا۔ میں جلد از جلد رجی سے ملنا چاہتا تھا لیکن جمال شاہ نا معلوم کیوں اسے ملانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ میری دماغی کیفیت کے متعلق پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا اس لیے جان کر دیر کر رہا تھا۔ معاملہ جب میرے اختیار سے باہر ہوا تب میں نے خود ہی بات چھیڑ دی۔

"تم نے رجی سے شادی کر کے دوستی کا لحاظ نہیں کیا۔ مجھے اطلاع ہی کر دیتے۔ میں تمہیں منع نہیں کرتا۔"

اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "اس سے شادی کر کے میں نے کون سا گناہ کر دیا ہے۔ وہ تمہاری محبوبہ نہیں بلکہ حضور بخش کی بیوی تھی۔ میں نے اس پر بہت پیسا خرچ کیا۔ اس کے شوہر کو چرس لا کر دی۔ اسے اچھی خاصی رقم دی۔ رہنے کے لیے گھر بھی دیا۔ تب کہیں جا کر رجی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔"

وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہوا پھر دوبارہ بولا۔ "میں تمہیں شادی میں ضرور بلاتا لیکن مجھے سب کچھ عجلت میں کرنا پڑا۔ حضور بخش کسی بھی وقت مکر سکتا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بدمزگی ہو۔"

"کیسی بدمزگی؟" میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ "ظاہر ہے کہ تم نے رجی سے شادی کرنے سے پہلے اسے حضور بخش سے طلاق دلوائی ہوگی۔ تمہیں تو عجلت میں نہیں بلکہ دھوم دھام سے شادی کرنا چاہیے تھی۔"

اس دفعہ شاہ جی سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "وہ رجی کو طلاق دینے کے لیے آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ تب مجھے مجبوراً سختی کے ساتھ بات کرنا پڑی۔ اس دوران میں نے اس پر ہاتھ بھی اٹھایا۔ تب کہیں جا کر وہ مانا۔"

میں نے دوبارہ پوچھا۔ "اب رجی کہاں ہے؟ ٹھیک تو ہے نا۔ مجھے فتو تانگے والے نے بتایا ہے کہ بہت کمزور ہو گئی ہے۔"

جمال شاہ ہنستے ہوئے بولا۔ "محبت واقعی زہر ہے مگر نہیں ہے جو بہت آہستہ آہستہ اثر کرتی ہے لیکن مرنے نہیں دیتی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم آج بھی اس سے پہلے کی طرح محبت کرتے ہو اور شاید ہمیشہ کرتے رہو گے۔ میں اسے کمرے میں بھیجتا ہوں تم بات چیت کر لو۔" وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں انتظار کرنے لگا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ جمال شاہ جھوٹ بول رہا تھا۔ رجی اتنی خوبصورت نہیں تھی کہ اسے

حاصل کرنے کے لیے جتن کیے جاتے۔ جمال شاہ نے اس سے شادی صرف دولت کے نشے میں چور ہو کر کی ہوگی۔ وہ صرف یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ سب کچھ حاصل کر سکتا ہے۔

☆☆☆

کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھلا۔ مجھے بالکل بھی آواز نہیں آئی اور وہ میرے سامنے آگئی۔ میری توقع کے مطابق وہ گڑیوں کا ڈھانچا بن چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی چھائی ہوئی تھی اور ہونٹوں پر پپڑی جم گئی تھی۔ وہ دو دفعہ بچے کے بعد اب شاید اس کا زندگی پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔

وہ خاموشی سے دری پر بیٹھ گئی۔ تب میری نگاہ اس کے ہاتھ پر پڑی۔ اس نے انگلی میں چاندی کی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی جو میں نے اسے دی تھی۔ یعنی اس نے بھی مجھے بھلایا نہیں تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں پکڑنے کی کوشش کی وہ بھڑک کر پیچھے ہٹ گئی۔ پھر سرد لہجے میں بولی۔

"میری اس سے شادی ہو چکی ہے اس لیے مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ اس نے صرف پندرہ منٹ کا وقت دیا ہے۔ تم نے جو بھی پوچھنا ہے۔ جلد پوچھ لو۔"

میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "کیا واقعی اس نے تم سے شادی کی ہے۔ جھوٹ نہ بولنا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس نے تمہیں قید کر کے رکھا ہے۔"

رجی کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "حویلیوں میں شادی نہیں کی جاتی۔ جو پسند آتا ہے اسے چھین لیا جاتا ہے۔ میں اسے پسند آگئی اس لیے اس نے مجھے رکھ لیا۔"

میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "یقیناً اس نے حضور بخش کو بھی رقم نہیں دی ہوگی۔ وہ تھوڑی سی چرس کے عوض ہی مان گیا ہوگا۔ اس سے بہتر تو مولا بخش تھا جس نے تمہارے باپ کو رقم تو دی تھی۔ جمال شاہ صرف نام کا چوہدری ہے ورنہ اس کا دل چیونٹی سے بھی چھوٹا ہے۔"

رجی نے افسردہ لہجے میں بتایا۔ "اس نے حضور بخش کو یقین دلایا تھا کہ وہ اسے روزانہ چرس دیا کرے گا لیکن پھر وعدے سے مکر گیا۔ کل اس نے حضور بخش کو بے دردی سے پٹوایا۔ اتنا کہ وہ لہولہان ہو گیا۔ پھر اسے دھمکی دی کہ اگر وہ دوبارہ حویلی کی طرف آیا تو اسے پولیس کے حوالے کر دے گا۔"

میں نے اس کی انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی کی جانب

انفراریڈ (شعاعیں)

شعاعوں کی ایک خاص قسم جن کا طول موج بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اسے غیر مرئی روشنی بھی کہتے ہیں۔ کیوں کہ انسانی آنکھ ان شعاعوں کو نہیں دیکھ سکتی۔ ان سے حرارت خارج ہوتی ہے اور ان کی موجودگی کا اندازہ حرارت ناپنے والے آلات یا فوٹو گرافی کی حساس پلیٹوں کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ یہ شعاعیں سالموں (Molecules) کی ترتیب اور ساخت کا پتا چلانے، انسانی آنکھ کی رسائی سے دور کے فاصلوں سے تصاویر لینے اور مختلف امراض کے علاج کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔

مرسلہ: نعمان اصغر۔ جہلم

الیگزینڈر بانومگارٹین

کانٹ کے عہد سے پہلے کا جرمن فلسفی جس نے پہلی بار فلسفے کی اس شاخ کو جو حسن اور فن سے تعلق رکھتی ہے جمالیات کا نام دیا۔ اس کی ایک کتاب "جمالیات" (ایستھیٹیا) کافی مشہور ہوئی۔ اس میں اس نے حسن کے مسئلے کا تجزیہ کیا ہے جو اس کے نزدیک کلیت اور جامعیت کی شناخت کا دوسرا نام ہے۔

Bicycle

دو پہیوں کی وہ ہلکی سواری جسے پاؤں سے چلایا جاتا ہے۔ بائیسکل کی یہ ترقی یافتہ صورت کئی مدارج طے کرنے کے بعد اس کو میسر آئی ہے۔ سب سے پہلی بائیسکل 1816ء میں پیرس کے ایک شخص نے بنائی۔ یہ لکڑی کی تھی اور سوار اس کو پاؤں سے دھکیل کر چلاتا تھا۔ 1840ء میں اسکاٹ لینڈ کے ایک لوہار کرک پیٹرک میکیلن نے اس میں کئی تبدیلیاں کیں اور اس کو ایک آرام دہ سواری بنا دیا۔ 1885ء میں اس میں فری ویل اور پیڈل کا اضافہ کر کے اس کو اور آرام دہ بنا دیا گیا۔ 1888ء میں اس کے لیے ربر کا ٹائر استعمال کیا جانے لگا۔ 1953ء میں پاکستان میں بھی بائیسکلوں کی تیاری شروع ہو گئی اور رستم، سہراب، ہیکو کے نام سے بائیسکل بننے لگے۔ چینی سائیکل فونکس کا شمار دنیا کے بہترین سائیکلوں میں ہوتا ہے۔

مرسلہ: اریبہ شکیل۔ سیالکوٹ

دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم بن بیاہے شاہ جی کی بیوی بن گئی ہو۔ میرا ہاتھ لگانا بھی تمہیں گوارا نہیں تو پھر اسے کیوں سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولی۔ "بس یہی میں نہیں کرسکتی ہوں۔ میں نے پہلی اور آخری محبت تم سے کی ہے اور آج بھی کرتی ہوں۔ شاید ہمیشہ کرتی رہوں گی لیکن اس کے بعد ہماری دوبارہ ملاقات نہیں ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ میں کالی پہاڑی والے تالاب میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرلوں۔ اس ذلت کی زندگی سے موت لاکھ درجے بہتر ہے۔"

میں نے اسے سینے سے لگانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے آپ کو چھڑا کر کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جمال شاہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات تھے۔ میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اسے اب بھول جاؤ۔ وہ حویلی کی عزت بن گئی ہے اور عزت کے اوپر ہم جان قربان کردیتے ہیں۔"

میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ "نہ میں اسے بھولوں گا اور نہ ہی وہ مجھے بھولے گی۔ تم پیسوں سے جسم خرید سکتے ہو لیکن کسی کے دل سے محبت کو نکالنا تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔ اس ملاقات کے بعد میں اب حویلی میں رہنا نہیں چاہتا ہوں۔ آج کا دن میں قصبے میں گزاروں گا اور کل واپس شہر چلا جاؤں گا۔"

جمال شاہ نے مجھے روکنے کے لیے اصرار کیا لیکن میں اس سے بدظن ہوچکا تھا اس لیے اٹھ کر حویلی سے باہر آگیا۔ راج شاہی کا قصبہ میرے سامنے تھا۔ والد صاحب کے ٹال میں کوئی اور بیٹھا لکڑیاں بیچ رہا تھا۔ ہمارے گھر کو گرا کر وہاں پکا مکان بنادیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ باقی کا قصبہ پہلے جیسا ہی تھا۔ وہ رات میں نے فتو تانگے والے کے گھر میں گزاری۔

اس نے مجھے بتایا کہ حضور بخش کی طبیعت بہت خراب ہے۔ شاہ جی کے نوکروں نے اسے بیدردی کے ساتھ پیٹا ہے۔ وہ بمشکل تمام بچ پائے گا۔ اسے اسپتال بھجوادیا گیا ہے۔

میں نے فتو کی جانب بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو پھر اگلے دن ہی حضور بخش کی لاش بھی قبر سے غائب ہوجائے گی۔"

فتو مسکراتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کتنی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ قصبے والوں کو قبرستان میں قبریں کھدی ہوئی ملی ہیں لیکن شاید میں اللہ کہہ رہا ہوں قبروں کو کھود کر دوبارہ ہموار کردیا گیا تھا۔ تاہم قصبے والوں نے قبر کو کھول کر مردے کو نہیں دیکھا۔ ان میں اتنی ہمت نہیں تھی۔"

میں نے طنزیہ لہجے میں اسے بتایا۔ "اگر وہ کھول لیتے تو راز فاش ہوجاتا۔ مردے واقعی قبروں میں نہیں ہوں گے۔"

یہ اگلے دن صبح دس بجے کی بات ہے۔ میں انتظار میں بیٹھا تھا کہ کب حضور بخش کے مرنے کی اطلاع قصبے والوں کی طرف سے آتی ہے لیکن اس کے بجائے یہ خبر آئی کہ رجی کالی پہاڑی کے تالاب میں گر کر ہلاک ہوگئی ہے اور اس کی لاش کو وہاں سے نکال کر حویلی میں لایا جارہا ہے۔

میں فتو کے گھر سے باہر آگیا۔ پھر ننگے پاؤں ہی حویلی کی طرف بھاگا۔ راج شاہی کے رہائشی حویلی کی طرف جارہے تھے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑتی دکھائی دے رہی تھیں لیکن مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میری دنیا اب صحیح معنوں میں لٹ گئی تھی۔ جب میں نے حویلی کے پھاٹک میں قدم رکھا تب رجی کی لاش کو غسل دینے کے لیے زنان خانے میں بھجوادیا گیا تھا۔ جمال شاہ حویلی کے صحن میں چارپائی پر سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا تھا۔ میں نے تنقیدی نگاہوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ بہت رنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اگر وہ اداکاری کررہا تھا تو اس کی اداکاری بے مثال تھی۔ تاہم رجی سے گزشتہ روز ملاقات کے دوران ہی مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ خودکشی ضرور کرے گی۔ وہ غموں سے لڑ لڑ کر نڈھال ہوچکی تھی اور اسے مرنے کے بعد ہی سکون نصیب ہوسکتا تھا۔

مجھے سامنے دیکھ کر شاہ جی چارپائی سے اٹھتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا اور ہچکیاں لے کر روتے ہوئے بولا۔ "میں نے کتنی دفعہ ارادہ کیا کہ اس خونی تالاب کو پہاڑی پتھروں سے بھردوں لیکن مصروفیت کی وجہ سے ایسا نہیں کرسکا اور آج اس نے میری رجی کی جان لے لی۔"

مجھے اپنے دل میں رقابت کی جلن محسوس ہوئی۔ وہ رجی کو اپنا کہہ رہا تھا اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے میری ہوچکی تھی۔

شاہ جی نے میرے دل میں اٹھنے والی رقابت کو محسوس کرلیا۔ اس لیے آنکھوں میں آتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بولا۔ "اس پر جتنا حق میرا تھا اس سے کچھ زیادہ تمہارا

چین بہت اب ختم ہو چکی ہے۔ آؤ اس سے آخری ملاقات کر لو۔ وہ زنان خانے میں ہے۔"

شاہ جی اندر کی طرف چل دیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ زنان خانے کے سامنے برآمدے میں اس کی لاش چارپائی پر پڑی ہوئی تھی۔ جسم میں پانی بھر جانے کی وجہ سے چہرہ سوج گیا تھا۔ آنکھیں باہر نکلی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے احساس ہوا وہ مجھے دیکھ رہی ہو۔ میں نے فوراً آگے بڑھ کر انہیں بند کر دیا۔ جب میری نگاہ سفید چادر میں سے باہر نکلے ہوئے اس کے ہاتھ پر پڑی۔ وہاں چاندی کی انگوٹھی جھلملا رہی تھی چونکہ ہاتھ سوج کر موٹے ہو چکے تھے اس لیے انگوٹھی انگلی میں پھنس کر رہ گئی تھی ورنہ غسل دینے والی عورتیں اسے ضرور نکال لیتیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس بیچاری عورت نے آخر کار دردوں بھری زندگی سے نجات حاصل کر لی تھی اور اس نے ٹھیک کہا تھا کہ گزشتہ روز ہماری آخری ملاقات تھی۔ میں نے آنسو پونچھے اور جمال شاہ کے پاس آ گیا۔ کچھ دیر بعد جنازہ اٹھا لیا گیا۔ قبرستان حویلی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اسے وہاں دفن کر دیا گیا۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ اب دوبارہ راج شاہی نہیں آؤں گا۔ وہاں میرے لیے اب تلخ یادوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں بچا تھا لیکن پھر مجھے اچانک ہی ایک خیال آیا۔ میں نے ایک دو دن مزید وہاں رکنے کا ارادہ کر لیا۔ فتو نے پوچھا تو میں نے بتایا میں قصبے والوں کو کالی پہاڑی میں واقع خونی تالاب سے نجات دلوانا چاہتا ہوں۔

وہ پریشان لہجے میں بولا۔ "چوہدریوں سے ٹکر لینا موت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ پولیس والے اس کے جیب میں ہیں۔"

میں نے سرد لہجے میں بتایا۔ "وہ سب اپنے ہی جال میں پھنس کر رہ جائیں گے لیکن اس سے پہلے مجھے پڑتال کرنا ہے کہ جن خطوط پر میں سوچ رہا ہوں وہ درست بھی ہے یا نہیں۔"

فتو چپ ہو گیا اور کمرے سے نکل کر باہر آ گیا۔ شام کو ہماری ملاقات ایک دفعہ پھر جمال شاہ سے ہوئی اور میں نے اسے جھوٹ بتایا کہ میں صبح واپس شہر جا رہا ہوں۔ اس نے مہمان رکنے کے لیے اصرار کیا لیکن میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"نہیں۔ میری چھٹیاں ختم ہو گئی ہیں اس لیے شہر تو جانا ہی پڑے گا۔ شاید اس کے بعد میں دوبارہ راج شاہی بھی دیتا ہوں۔"

جمال شاہ مجھے ہاتھ سے پکڑ کر حویلی میں لے آیا۔ رات کا کھانا میں نے اس کے ساتھ کھایا۔ اس دوران رکی کے متعلق بات چیت ہوتی رہی۔ پھر رات گئے میں واپس فتو کے گھر آ گیا۔ تمام رات میں سو نہیں سکا۔ آنکھیں بند کرتے ہی مجھے رکی کا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گلہ شکوہ تھا کہ اگر میں اسے بھگا کر اپنے ساتھ شہر لے جاتا تو شاید اس کی موت اتنی جلدی نہ ہوتی۔ وہ مجھ سے ملنے کے بعد راج شاہی میں تنہا تنہا سی ہو کر رہ گئی تھی۔

رات سوتے جاگتے گزر گئی۔

☆☆☆

صبح میں راج شاہی کے قریب واقع اس گاؤں میں آ گیا۔ جہاں میرا دوست احمد رہتا تھا۔ میں شہر میں جس کمپنی میں کام کرتا تھا وہ وہاں کلرک لگا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے پہلے گاؤں آیا تھا اور اس نے مجھے اپنے گھر آنے کے لیے مدعو کیا تھا۔ مجھے سامنے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ دو دن میں نے احمد کے گھر میں گزارے جہاں وہ اپنی ماں اور بہن کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی ماں بہت خوش اخلاق اور پُرخلوص عورت تھی۔ اس نے مجھے کھانا کھلا کھلا کر تقریباً پاگل کر دیا۔ جب مجبوراً مجھے وہاں سے فرار ہونا پڑا۔ میں شام کو بس پکڑ کر فتو کے گھر آ گیا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ قصبہ سنسان پڑا ہوا تھا۔ فتو بھی سو چکا تھا۔ میں اسے جگانا نہیں چاہتا تھا لیکن جگانے کے علاوہ چارہ نہیں تھا۔ مجھے سامنے دیکھ کر وہ خوش ہوا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا تمہارے پاس کدال اور بیلچہ ہے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ "فوراً لے آؤ۔ میں آگے گلی میں جا کر بیٹھتا ہوں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور مکان کے اندر چلا گیا۔ میں قریب ہی درخت کے نیچے بندھے ہوئے گھوڑے کی طرف آ گیا۔ اسے گاڑی سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ جلد ہی فتو ہاتھوں میں کدال اور بیلچہ پکڑے ہوئے آ گیا۔ اس نے انہیں زمین پر رکھا اور گھوڑے کو گاڑی کے ساتھ باندھنے لگا۔ قصبے میں تاریکی چھائی ہوئی تھی اس لیے ہمیں وہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے باوجود بھی میں نے اپنے چہرے کو سیاہ کپڑے سے ڈھانپ لیا اتنی دیر میں فتو نے

گھوڑے کو گاڑی میں لگا دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”تمہارے پاس لالٹین ہے تو وہ بھی لے آؤ۔ ہمیں زمینوں پر بہت کچھ تلاش کرنا ہے۔“

فتو اثبات میں سر ہلاتا ہوا دوبارہ مکان کی طرف چلا گیا اور میں تانگے میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جلد ہی وہ لالٹین لے آیا۔ میں نے اسے کدال اور بیلچے کے پاس رکھ دیا اور فتو نے تانگے کو آگے بڑھا دیا۔ تمام دن موسم گرم رہا تھا لیکن رات کو اچھی خاصی ٹھنڈ ہوگئی تھی اور میں نے گرم کپڑے نہیں پہن رکھے تھے اس لیے جسم میں کپکپی کی لہر اٹھنے لگی۔ لیکن فتو تانگے کو بھگائے چلا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم سنسان قصبے سے نکل کر زمینوں کی طرف آ گئے اور جہاں شاہ جی کی سرسبز زمینوں کا اختتام ہوا اور جہاں سے خشک زمینوں کی ابتدا ہو رہی تھی۔ میں نے فتو کو وہاں تانگہ روکنے کے لیے کہا۔ اس نے رسیاں کھینچ دیں۔ میں کدال اور بیلچہ لے نیچے اتر آیا۔ فتو نے لالٹین روشن کر دی۔ اس کی زرد روشنی مختصر حصے کو روشن کرنے لگی۔ یہ تمام زمینیں شاہ جی کی تھیں لیکن ابھی تک یہاں ہریالی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں نے بنجر زمین کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہاں کچھ زمین ایسی تھی جیسے چند دن پہلے کھودا گیا ہو۔ میں نے اس پر کھدائی شروع کر دی۔ فتو بیلچے کے ساتھ مٹی ہٹا رہا تھا۔ کھیتوں میں خاموشی طاری تھی لیکن جھینگروں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ ہمیں وہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ پھاوڑا چلانے کی وجہ سے جسم میں گرمی آ گئی اور مجھے سردی لگنا بند ہو گئی، پسینا آنے لگا لیکن مجھے پروا نہیں تھی۔

کچھ ہی دیر میں ہمارے اردگرد مٹی کا انبار لگ گیا تھا۔ میں نے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کو صاف کیا اور فتو کے ہاتھوں سے بیلچہ لے کر مٹی میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ فتو قریب ہی کھڑا تھا۔ کچھ دیر مجھے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے ہاتھوں کے ذریعے مٹی ادھر ادھر کرنے لگا پھر جیسے یکلخت کالے سیاہ بادلوں میں بجلی چمکتی ہے اسی طرح مجھے مطلوبہ شے نظر آ گئی۔ پھاوڑے سے مٹی زیادہ نکل رہی تھی لیکن ہاتھوں سے مٹی نکالنے کی وجہ سے وہ نظر آ گئی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ بیلچے کو زمین پر رکھا اور آگے بڑھ کر گڑھے میں موجود مٹی کو ایک طرف ہٹانا شروع کیا پھر اچانک میرے ہاتھوں میں انسانی گوشت آ گیا۔ میں نے اس پر سے مٹی ہٹائی تو انگوٹھی چمکنے لگی۔ میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ وہ کٹی ہوئی انگلی تھی۔ جس میں چاندی کی انگوٹھی پھنسی ہوئی تھی اور وہ انگلی رجی کی تھی۔ تو ہم پرستی کی انتہا تھی کہ کھیتوں میں لاش کے ٹکڑے دبائے گئے تھے۔ اگر میں اور کھدائی کرتا تو شاید اور بھی ٹکڑے مل جاتے لیکن مجھے ان کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ میری پڑتال مکمل ہو گئی تھی۔ میں جو سوچ رہا تھا اب کچھ ویسے ہی ہوا تھا۔ میں نے رجی کی انگلی کو دوبارہ زمین میں دفن کر دیا اور گڑھے کو برابر کرنے کے بعد فتو کے تانگے میں بیٹھ کر واپس قصبے میں آ گیا۔

☆☆☆

راج شاہی سے شہر جانے کے لیے ٹرین صبح گیارہ بجے چلتی تھی۔ میں نے ٹکٹ پلیٹ فارم کے قریب واقع کمرے سے حاصل کیا اور ڈبے میں آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اب بھی چہرے کو ڈھاٹا میں چھپا رکھا تھا لیکن جب ٹرین نے پلیٹ فارم کو چھوڑا تو میں نے کپڑا اتار دیا۔ ٹرین قصبے سے نکل کر لہلہاتی فصلوں میں سے ہو کر اس پہاڑی علاقے کی طرف بڑھنے لگی جہاں خونی تالاب موجود تھا۔ تب میں نے وہاں پولیس والوں کو کھڑے دیکھا اور میرے چہرے پر اطمینان کے تاثرات پیدا ہو گئے۔ انہیں جمال شاہ کی لاش مل گئی تھی جسے میں نے پانی میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ جمال شاہ روزانہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد پیدل اپنی زمینوں کی طرف جاتا تھا۔ میں وہاں اس کا منتظر تھا۔ میں نے اسے جھوٹ بتایا کہ خونی تالاب میں رجو کی لاش تیر رہی ہے۔ اس نے مجھ سے راج شاہی واپس آنے کے متعلق بہت سے سوالات پوچھے لیکن میں نے ان کے جواب نہیں دیے اور اسے زبردستی تالاب کی طرف لے آیا۔ اس کے بعد میں نے جو کیا اس کے متعلق آپ اچھی طرح اندازہ لگا سکتے ہیں۔

میں نے سر پر پتھر مارا۔ وہ چکرا کر گرا تو اسے تالاب میں دھکیل دیا۔ پانی حلق کے ذریعے اس کے جسم میں داخل ہو گیا اور وہ ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔ اب پولیس والے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ جمال شاہ کو قتل کیا گیا ہے کیونکہ تمام قصبے کو معلوم تھا کہ تالاب میں لوگ گر کر ہلاک ہوتے رہتے ہیں۔ میرے چہرے پر افسردگی کے تاثرات پیدا ہوئے کیونکہ میں نے رجی کو کھو دیا تھا لیکن اس کے قاتل سے اس کی موت کا بدلہ لے لیا تھا۔ گاڑی پہاڑی علاقے کے درمیان سے ہو کر شہر کی طرف بھاگنے لگی اور میں نے سیٹ کے ساتھ سر ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔

++

بہکاوا

مدیر محترم
سلام شوق!
ایک اور سچی کہانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ لوگ بہکاوے میں آکر غلط قدم اٹھا لیتے ہیں جس کا پچھتاوا تمام عمر رہتا ہے۔ اس نے بھی ایک غلط کام کیا تھا جس سے سبق حاصل کرنے کے لیے آپ بھی پڑھیں۔

عاطر شاہین
(ملتان)

مجھے اعظم صاحب کے پاس ملازمت کرتے ہوئے تین سال ہو گئے تھے۔ میرے ساتھ ایک اور ملازم بھی کام کرتا تھا جس کا نام جبار تھا۔ اسے ملازمت کرتے دو سال ہو گئے تھے۔ اعظم صاحب بے حد نیک، مخلص اور ملنسار انسان تھے۔ ان کا اپنا بہت بڑا جنرل اسٹور تھا۔ ان کا گھر جنرل اسٹور سے نصف کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

اعظم صاحب کا ایک بیٹا اور بیٹی تھی۔ بیٹا سات سال کا جبکہ بیٹی چار سال کی تھی۔ ان کی بیوی بہت خوب صورت مگر تیز مزاج کی تھی۔ غصہ ہر وقت اس کی ناک پر دھرا ہوتا لیکن اعظم صاحب کو اپنی بیوی سے بے حد محبت تھی۔ وہ اکثر

ویٹرز اس کا اظہار ہم ملازموں کے سامنے کرتے رہتے تھے۔

کریانہ جنرل اسٹور گھر کے قریب تھا لیکن اعظم صاحب دوپہر کا کھانا اسٹور میں ہی کھاتے تھے۔ ہمارے لیے بھی کھانا ان کے گھر سے ہی آتا تھا۔ جب کھانا تیار ہو جاتا تو اعظم صاحب کی بیگم انہیں فون کر دیتیں، جبار جا کر کھانا لے آتا اور ہم تینوں اکٹھے ہی کھانا کھاتے۔

میری عمر اکیس سال کی تھی جبکہ جبار اٹھارہ سال کا تھا۔ وہ معمولی شکل و صورت کا تھا۔ اس کی رنگت بھی سانولی تھی۔ وہ دبلا پتلا اور درمیانے قد کا نوجوان تھا جبکہ میں اس سے قدرے مختلف تھا۔ میری رنگت گوری، قد لمبا، شانے چوڑے اور سر کے بال گھنے تھے۔ بلاشبہ میری مردانہ وجاہت جاذب نظر تھی۔

میرا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ میرا ایک بڑا بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ وہ تینوں ہی شادی شدہ تھے لیکن میرا کہیں بھی رشتہ طے نہیں ہوا تھا۔ امکان یہی تھا کہ میری والدہ میری شادی اپنی یتیم بھانجی سے کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ بہرکیف میں اس بارے میں نہیں سوچتا تھا۔ جب شادی ہونی ہوگی تو ہو جائے گی۔

میں کبھی اعظم صاحب کے گھر نہیں گیا تھا۔ اعظم صاحب کو جو بھی کام ہوتا تو وہ جبار کو ہی بھیج دیتے تھے۔ ایک دن جبار کی طبیعت خراب تھی اور اس نے اسٹور سے چھٹی کر لی تھی۔ اس دن جب دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو اعظم صاحب نے مجھ سے کہا۔

"زین بیٹے! آج تم میرے گھر سے کھانا لے آؤ۔ کیا تم نے میرا گھر دیکھا ہوا ہے؟"

"نہیں جناب۔" میں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ "میں کبھی آپ کے گھر گیا ہی نہیں۔"

"چلو اس بہانے آج تم میرا گھر بھی دیکھ لو۔" اعظم صاحب نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں ایڈریس سمجھا دیتا ہوں۔" کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے اپنے گھر کا ایڈریس سمجھا دیا۔ میں نے اپنی سائیکل اٹھائی اور کھانا لینے چلا گیا۔

اعظم صاحب نے اپنے گھر کے دروازے کا مخصوص رنگ بتایا تھا اس لیے مجھے ان کا گھر تلاش کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ میں نے سائیکل کھڑی کر کے دروازے کی گھنٹی بجائی تو دو منٹ کے بعد اندر سے ایک نسوانی آواز آئی۔ شاید وہ اعظم صاحب کی بیگم تھیں۔

"کون ہے؟"

"جی میں زین ہوں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "مجھے اعظم صاحب نے کھانا لینے کے لیے بھیجا ہے۔"

اعظم صاحب کی بیگم نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے جھجکتے ہوئے ان کی طرف دیکھا اور سلام کر دیا۔ وہ ایک پینتیس چھتیس سالہ انتہائی خوب صورت اور تیکھے نین نقش والی خاتون تھیں۔ وہ اعظم صاحب سے قدرے چھوٹی دکھائی دیتی تھیں۔ میرے سلام کا جواب دینے کے بعد انہوں نے بغور میرا جائزہ لیا۔ میں نے نظریں جھکا لی تھیں۔

"اچھا یہیں ٹھہرو، میں ٹفن لے آتی ہوں۔" کہنے کے ساتھ ہی وہ دروازہ بند کیے بغیر واپس مڑ گئیں اور میں وقت گزاری کے لیے قرب و جوار میں دیکھنے لگا۔ وہ ایک نسبتاً سنسان علاقہ تھا۔ اِکا دُکا ہی لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ گرمی بھی اپنے عروج پر تھی تاہم ہلکی ہلکی ہوا بہت بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد ہی اعظم صاحب کی بیگم ایک بڑا سا ٹفن لے کر آ گئیں۔ ٹفن دینے سے پہلے انہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"جی...... زین۔"

"اعظم صاحب کے پاس کب سے ملازمت کر رہے ہو؟"

"تقریباً تین سال سے۔" میں نے نظریں جھکا کر ہی جواب دیا۔

"ارے لڑکے ہو کر شرما رہے ہو۔" وہ حیرت سے بولیں۔ "اچھا یہ بتاؤ آج جبار کیوں نہیں آیا۔"

"آج وہ چھٹی پر ہے، اس کی طبیعت خراب ہے۔" میں نے جبار کی آج چھٹی کرنے کی وجہ بتائی تو انہوں نے ہنکاری بھرنے پر اکتفا کیا۔ پھر ٹفن میری طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

"تم بہت خوب صورت لڑکے ہو۔ آئندہ سے تم ہی کھانا لینے آیا کرنا۔ میں اعظم صاحب سے کہہ دوں گی۔"

ان کا مجھے بہت خوب صورت لڑکا کہنا کچھ عجیب سا لگا تھا۔ مجھ میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ جس سے وہ متاثر ہو گئی تھیں۔ میں نے ان سے ٹفن لیا اور سائیکل پر بیٹھ کر اسٹور کی طرف بڑھ گیا۔ دماغ میں مختلف خیالات کسمسا رہے تھے۔ یہ پہلی خاتون تھیں جنہوں نے مجھے بہت خوب صورت لڑکا کہا

تھا۔

انہوں نے اعظم صاحب کو کیسے شیشے میں اتارا کہ اس دن کے بعد اعظم صاحب مجھے ہی کھانا لینے کے لیے بھیجنے لگے۔ میں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اعظم صاحب مالک تھے۔ ان کی بیگم حسب معمول ٹفن دینے آتیں اور چند باتیں کرتیں پھر میں اسٹور آجاتا۔ بیگم صاحبہ سے اب میری خاصی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ میں انہیں بیگم صاحبہ ہی کہتا تھا۔

ایک دن میں حسب معمول کھانا لینے پہنچا تو بیگم صاحبہ نے دروازہ کھولا۔ میں انہیں دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ وہ بجی سنوری ہوئی تھیں۔ انہوں نے خوب صورت لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ پرفیوم کی خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ علیک سلیک کے بعد وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

''اندر آجاؤ زین۔ ابھی کھانا بن رہا ہے، تھوڑی دیر لگے گی۔''

''میں باہر ہی ٹھیک ہوں بیگم صاحبہ۔'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ارے تو کیا اتنی دیر گرمی میں باہر کھڑے رہو گے۔'' وہ خفگی سے بولیں۔ ''آجاؤ اندر۔''

بادل نخواستہ مجھے ان کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ وہ مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد کچن میں چلی گئیں اور میں ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا۔ ڈرائنگ روم قدرے بڑا اور خوب صورت انداز میں سجا ہوا تھا۔ اے سی کی ٹھنڈی ہوا سے ڈرائنگ روم کی ہر چیز ٹھنڈی ہوئی پڑی تھی۔ اے سی کی یہ ٹھنڈک نہ صرف جسم بلکہ دل کو بھی ایک عجیب سی تازگی اور سکون بخش رہی تھی۔ گھر میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ شاید بیگم صاحبہ کے بچے گھر پر نہیں تھے۔ تبھی میرے سیل فون کی گھنٹی بجی تو میں نے دیکھا۔ اعظم صاحب فون کر رہے تھے۔

میں نے فون اٹھانے کے بعد سلام کیا تو جواب دینے کے بعد انہوں نے استفسار کیا۔ ''میاں! کہاں رہ گئے۔ ابھی تک کھانا لے کر نہیں پہنچے۔''

''اعظم صاحب۔'' میں انہیں اعظم صاحب ہی کہتا تھا۔ ''بیگم صاحبہ نے بتایا ہے کہ ابھی کھانا بن رہا ہے، اس لیے تھوڑی دیر لگے گی۔''

''اوہو بھوک سے میرا برا حال ہو رہا ہے۔'' وہ بولے۔ ''اچھا ٹھیک ہے، جیسے ہی کھانا بن جائے تو لے کر جلدی پہنچنے کی کوشش کرنا۔''

''ٹھیک ہے اعظم صاحب۔'' میں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ فون بند کرنے کے بعد میں ایک بار پھر ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ بیگم صاحبہ آگئیں اور میں ان کے احترام میں صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''ارے کھڑے کیوں ہوگئے ہو۔'' وہ مجھے اٹھتے دیکھ کر بولیں۔ ''بیٹھو۔''

میں صوفے پر بیٹھ گیا تو وہ بھی اسی صوفے پر بیٹھ گئیں جس پر میں براجمان تھا البتہ ہمارے درمیان ایک فٹ کا فاصلہ ضرور تھا۔ میں نے کہا۔ ''بیگم صاحبہ! اعظم صاحب کا فون آیا تھا۔ وہ کھانے کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔''

''بس تھوڑی دیر مزید لگے گی۔'' وہ بولیں۔ ''میں اعظم صاحب کو بتا دوں گی، وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ میرے قریب بیٹھی تھیں، مجھے بہت ہی عجیب لگ رہا تھا۔ میں نے ارادی طور پر ان کی طرف دیکھا تو وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھیں۔ ان کے لبوں پر مسکان تھی اور ان کی نظروں میں ایسا کچھ تھا جس سے میرے اندر اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ میں نے گڑبڑا کر نظریں قالین پر جما دیں۔ لمحاتی توقف کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا۔

''زین! میری طرف دیکھو۔''

میں نے جھجکتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ بدستور موجود تھی۔ میں بدحواس ہو رہا تھا تاہم میں نے اپنی حالت پر قابو پانے کی سعی کی۔

''میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟'' بیگم صاحبہ نے دریافت کیا تو میں اس غیر متوقع سوال پر مزید گڑبڑا گیا۔

''آپ...... آپ بہت اچھی ہیں بیگم صاحبہ۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''وہ تو میں ہوں۔'' وہ اٹھلا کر بولیں۔ ''میں تمہیں کیسی لگتی ہوں، صرف تمہیں۔''

''مجھے۔'' میں بدستور بدحواس تھا۔

''ہاں۔''

''آپ میرے مالک اعظم صاحب کی بیگم ہیں اس لیے آپ میرے لیے قابل احترام ہیں۔'' میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی تو ان کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے ناگواری پیدا ہوئی تاہم انہوں نے کمال مہارت سے اپنے تاثرات چھپا لیے اور خفگی بھرے لہجے میں بولیں۔

"ارے تم تو نرے بدھو ہو۔ ایک عورت تم سے کیا کہنا چاہ رہی ہے، تم سمجھ ہی نہیں رہے۔"

میں خاموش رہا، وہ چند لمحے مجھے محبت پاش نظروں سے دیکھتی رہیں پھر اٹھ کر کچن میں چلی گئیں تو میں نے سکون کی ایک طویل سانس لی۔ اے سی کی ٹھنڈک کے باوجود میرا وجود پسینا پسینا ہو رہا تھا۔ بیگم صاحبہ کا محبت پاش نظروں سے میری طرف دیکھنا مجھے عجیب سا لگا تھا۔ بہر کیف، کھانا بن گیا اور وہ ٹفن تیار کر کے لے آئیں۔ انہوں نے اس بار مجھ سے کوئی بات نہ کی اور مجھے باہر تک چھوڑنے آئیں۔ جیسے ہی میں نے سائیکل باہر نکالی تو انہوں نے پیچھے سے دروازہ بند کر دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے قید سے آزادی مل گئی ہو۔ بیگم صاحبہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی تھیں، میں سارا راستہ اس بارے میں سوچتا رہا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

بیگم صاحبہ چار پانچ دن مجھ سے خفا رہیں، میں جب بھی کھانا لینے جاتا تو وہ کوئی بات کیے بغیر مجھے ٹفن پکڑا دیتیں اور میں اسٹور آ جاتا۔ لیکن ان چار پانچ دنوں میں میری اپنی حالت بھی عجیب ہو گئی تھی۔ میں بیگم صاحبہ کے بارے میں سوچتا رہتا تھا کہ وہ مجھ سے کس بات پر خفا تھیں، مجھ سے بات کیوں نہیں کرتی تھیں۔ آخر ایک دن میں نے ان سے پوچھ ہی لیا۔

"بیگم صاحبہ! کیا آپ مجھ سے کسی بات پر خفا ہیں؟"

"ہاں۔" انہوں نے بھی زبان کھول دی تو میں شاک میں رہ گیا۔

"ک..... کیوں بیگم صاحبہ؟"

"میری آنکھوں میں دیکھو۔"

میں نے بے اختیار ان کی آنکھوں میں دیکھا، بعد ازاں میں نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

"تمہیں میری آنکھوں میں کیا دکھائی دیا ہے؟" انہوں نے استفسار کیا۔

"پ..... پتا نہیں۔"

"بدھو! میری آنکھوں میں تمہارے لیے محبت ہے۔ کیا تمہیں دکھائی نہیں دے رہا۔" وہ صاف گوئی سے بولیں تو گویا مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ میں انہیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ مزید کہنے لگیں۔ "زین! جب سے تمہیں دیکھا ہے، مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ میں مانتی ہوں کہ میں تم سے عمر میں بڑی ہوں لیکن دل پر کس کا زور چلتا ہے۔"

میرے رونگٹے کھڑے ہو چکے تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی فلم چل رہی ہو۔ یہ بالکل فلمی منظر ہی تھا۔ میں اپنی حالت پر قابو پانے کی حتی الامکان کوشش کر رہا تھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بیگم صاحبہ۔" میں نے کہا۔

"جو سچ ہے میں نے کہہ دیا۔" وہ ڈھٹائی سے بولیں۔ "یقیناً تم سوچ رہے ہو کہ میں شادی شدہ ہوں اور دو بچوں کی ماں ہوں، میں ایسا کیسے سوچ سکتی ہوں تو یہ سچ ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے اور یہ جو میں بنی سنوری رہتی ہوں نا، یہ میں صرف تمہارے لیے کرتی ہوں۔"

مجھ سے وہاں مزید رکنا محال ہو رہا تھا۔ اس لیے میں نے ٹفن لیا اور اسٹور کی راہ لی۔ سارا راستہ میرے دماغ میں بیگم صاحبہ کے الفاظ گونجتے رہے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ بیگم صاحبہ کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے اور انہوں نے برملا اس کا اظہار بھی کر دیا تھا۔

میں اسٹور کب پہنچا مجھے اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ اعظم صاحب ظہر کی نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے اور جبار اسٹول پر بیٹھا اپنے سیل فون میں گم تھا۔ میں نے ٹفن میز پر رکھا اور دوسرے اسٹول پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لے کر خود کو پُرسکون کرنے کی سعی کرنے لگا۔ جبار نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور مستفسر ہوا۔

"کیا ہوا زین بھائی! آپ کی حالت دیکھ کر لگ رہا ہے جیسے آپ سائیکل پر نہیں بلکہ دوڑ کر آئے ہیں۔"

"نہیں، کچھ نہیں۔" میں نے اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔ "گرمی بہت ہے نا، تو سائیکل چلاتے ہوئے تھک گیا ہوں۔"

جبار نے ہنکاری بھری اور دوبارہ سیل فون میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اعظم صاحب بھی آ گئے اور پھر ہم کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ درحقیقت مجھے بہت دکھ ہو رہا تھا کہ اعظم صاحب کی بیگم انہیں دھوکا دے رہی ہیں۔

☆☆☆

رات کے بارہ بج رہے تھے جب میں سونے کے لیے اپنے بستر پر لیٹا تھا۔ اعظم صاحب رات دس بجے ہی اسٹور بند کرتے تھے۔ اسٹور سے گھر آتے آتے مجھے گیارہ بج جاتے تھے۔ رات کا کھانا میں اپنے گھر ہی کھاتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دیر سوشل میڈیا اور یوٹیوب دیکھتا پھر جب نیند آنے لگتی تو میں سو جاتا تھا۔

لیکن اس رات مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میرے حواسوں پر بیگم صاحبہ سوار تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا

urdunovels.com

دل بھی ان کی باتوں کے حصار میں جارہا ہے۔ میں جتنا بیگم صاحب کے عکس کو اپنے دل ودماغ سے جھٹکنے کی کوشش کرتا وہ اتنا ہی زیادہ سوار ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ تبھی میرے سیل فون پر واٹس ایپ ٹون بجی تو میں نے تکیے کے نیچے سے سیل فون نکال کر دیکھا۔ اسکرین پر ایک انجان نمبر موجود تھا۔ میں نے میسج کھولا تو لکھا تھا۔

”زین! کیا جاگ رہے ہو؟“

میرے دل میں کھٹکا پیدا ہوا کہ کہیں یہ بیگم صاحبہ کا میسج نہ ہو۔ تاہم تصدیق کی خاطر میں نے پوچھ لیا۔

”جی۔ میں جاگ رہا ہوں۔ آپ کون؟“

”رخشندہ۔“

یہ نام پڑھتے ہی میں لیٹے لیٹے... اچھل پڑا۔ رخشندہ اعظم صاحب کی بیگم کا نام تھا۔ اسی وقت ایک اور میسج آگیا۔

”زین! میں نے اعظم صاحب کے فون سے تمہارا نمبر نکالا ہے۔ کیا کروں، میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں اس لیے مجبوراً تمہیں میسج کر دیا۔ اگر تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے تو کوئی مسئلہ نہیں، لیکن یاد رکھنا تم مجھ سے محبت نہ کر کے خوشگوار زندگی گزارنے کا موقع گنوا رہے ہو۔“

بیگم صاحبہ کے میسج نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اب میں بھی خودغرض ہوتا جارہا ہوں۔ میں نے اعظم صاحب کی شفقت ومحبت کو پس پشت ڈال دیا اور مستفسر ہوا۔

”وہ کیسے بیگم صاحبہ۔“

”تم کل مجھ سے ملو۔ میں تمہیں تفصیل بتاؤں گی۔ اتنی لمبی بات فون پر نہیں ہو سکتی۔“

”ٹھیک ہے بیگم صاحبہ۔“

بیگم صاحبہ بھی انگوٹھے والا ایموجی بھیج کر آف لائن ہو گئیں اور میں فون تکیے کے نیچے رکھ کر سوچنے لگا کہ آخر بیگم صاحبہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہیں۔ آخر انہوں نے مجھ میں کیا دیکھا کہ انہیں مجھ سے پہلی ہی نظر میں محبت ہوگئی۔ میں تو ایک سیدھا سادا اور متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہوں۔

اگلے دن میں حسب معمول کھانا لینے اعظم صاحب کے گھر پہنچا تو بیگم صاحبہ میری ہی منتظر تھیں۔ انہوں نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ”میں نے اعظم صاحب کو فون کر دیا ہے کہ کھانا بننے میں آدھا گھنٹہ دیر ہے اس لیے تم بے فکر ہو کر بیٹھو۔“

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ کھاتی

اسما قادری کے سحر انگیز قلم سے

نیا شاہکار

جانباز

امارت کے نشے میں چور..... کمزوروں پر ظلم اور اپنے زیردست لوگوں کی عزتوں کو پامال کرنے والے ظالموں کی خودسری و دیدہ دلیری......

ظلم کے خلاف سینہ سپر نوجوان کی داستان

اسے اپنی محبت کو حاصل کرنے کا جنون بھی تھا اور مجرموں سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی۔ تہلکہ خیز واقعات کا سلسلہ......

سسپنس کے صفحات پر جلد آرہا ہے

وقت کے بعد وہ دوبارہ بولیں۔ ''دیکھو زین! میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ دل پر کسی کا زور نہیں ہوتا۔ یہ سچ ہے کہ مجھے پہلی ہی نظر میں تم سے محبت ہو گئی تھی۔ میں کیا کروں میں خود کو روک نہیں پا رہی۔ میں تم سے دور ہونے کی کوشش کرتی ہوں لیکن کامیاب نہیں ہوتی۔ میں مانتی ہوں کہ شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں ہونے کے ناتے مجھے یہ سب زیب نہیں دیتا لیکن میں اعظم صاحب سے چھٹکارا پانا چاہتی ہوں۔ مجھے کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی لیکن جب تمہیں دیکھا اور تم سے محبت ہوئی تو میرے اندر اُمید کی کرن پیدا ہو گئی۔''

مجھے بیگم صاحبہ کی باتیں سن کر حیرت در حیرت ہو رہی تھی۔ ان کے خاموش ہوتے ہی میں نے استفسار کیا۔

''آپ اعظم صاحب سے کیوں چھٹکارا پانا چاہتی ہیں۔ وہ تو بہت ہی اچھے اور نیک انسان ہیں۔''

''ہونہہ۔ بہت ہی اچھے اور نیک انسان۔'' بیگم صاحبہ نے ہنکارا بھر کر کہا۔ ''وہ کتنے اچھے اور نیک انسان ہیں، مجھ سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا۔ میں نے ان کے ساتھ آٹھ سال گزارے ہیں۔ وہ بہت ظالم اور سنگ دل انسان ہیں، جب وہ غصے میں ہوتے ہیں تو ان کی آنکھوں پر پٹی بندھ جاتی ہے، وہ یہ نہیں دیکھتے کہ میں کون ہوں، مجھ پر تشدد کی انتہا کر دیتے ہیں، میں اب ان کے ساتھ مزید نہیں رہنا چاہتی۔'' کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے سسکنا شروع کر دیا۔ آنکھوں سے موٹے موٹے دو آنسو ان کے رخسار پر پھسل آئے اور اس لیے مجھے ان سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ عورت کے آنسو اس کے بہترین ہتھیار ہیں یہ مجھے اسی دن ہی معلوم ہوا تھا۔ دوسری طرف اعظم صاحب کی ''اصلیت'' جان کر بھی میں انگشت بدنداں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس لیے کیا کروں، تاہم میں نے انہیں دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

''بیگم صاحبہ! صبر کریں۔''

''بہت کر لیا صبر۔'' وہ جیسے پھٹ پڑیں۔ ''اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں ان کے ساتھ ایک لمحہ مزید نہیں گزار سکتی۔ پلیز میری مدد کرو۔ مجھے ان سے چھٹکارا دلاؤ۔'' کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے آنسو صاف کر لیے۔

''میں کیسے چھٹکارا دلا سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کو خلع لینے کا حق ہے۔ آپ عدالت میں خلع کا دعویٰ دائر کر سکتی ہیں۔''

''اس صورت میں مجھے پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی۔''

وہ بولیں۔ ''اگر میرے گھر والوں کو علم ہو گیا تو وہ بھی یہ قبول نہیں کریں گے۔ اگر اعظم صاحب مجھے خود طلاق دے دیں تو اس صورت میں مجھے یہ گھر مل سکتا ہے۔ نکاح نامے میں اعظم صاحب نے لکھ دیا تھا کہ اگر انہوں نے مجھے طلاق دی تو یہ گھر میرا ہو گا لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے کبھی طلاق نہیں دیں گے۔''

''پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''اعظم صاحب کو راستے سے ہٹانا ہو گا۔'' وہ بلا جھجک بولیں تو میں چونک پڑا۔

''کیا مطلب۔''

''دیکھو زین۔ میرے دماغ میں ایک منصوبہ ہے جو میں کہہ رہی ہوں اسے غور سے سنو۔'' کہنے کے ساتھ ہی بیگم صاحبہ اپنا منصوبہ بتانے لگیں اور میں ہق دق سا بیٹھا سنتا رہا۔ جب انہوں نے اپنی بات مکمل کر لی تو آخر میں بولیں۔ ''تم فکر مت کرو، تمہارا نام درمیان میں نہیں آئے گا، جیسے ہی میری عدت پوری ہو گی، میں تم سے خفیہ نکاح کر لوں گی، میں اسٹور تمہارے حوالے کر دوں گی، اس طرح کسی کو کچھ معلوم نہیں ہو سکے گا۔ کیا کہتے ہو؟''

میں گم صم سا بیٹھا رہا۔ میرے دل و دماغ کی جنگ جاری تھی۔ بیگم صاحبہ نے مجھے سہانے مستقبل کے خواب دکھائے تھے۔ شیطان بھی مجھے اپنی گرفت میں لینے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ تاہم میں نے کہا۔

''بیگم صاحبہ! مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی بولیں۔ ''تم کل تک اچھی طرح سوچ لو۔ اگر تم نے ہاں نہ بھی بھری تو تب بھی میں تم سے محبت کرنا نہیں چھوڑوں گی۔ لیکن یہ بات یاد رکھنا، قسمت بار بار موقع نہیں دیتی۔ تمہیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔''

جواب میں، میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

میں نے بیگم صاحبہ کے منصوبے پر کافی سوچا تھا۔ جیسے جیسے میں سوچتا جا رہا تھا میرے دل میں بھی بہتر مستقبل کے حوالے سے لالچ پیدا ہو چکا تھا۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھ گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ پھر کیا ہوا اگر میں بیگم صاحبہ سے خفیہ نکاح کر لوں گا۔ بیگم صاحبہ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر میرے والدین اپنی پسند سے میری شادی کرنا چاہیں تو میں شادی کر لوں، انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بہرکیف میں نے

بیگم صاحبہ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ خفیہ نکاح کے بعد بیگم صاحبہ اسٹور میرے حوالے کردیں گی اور اس طرح میں اس اسٹور کا بلاشرکت غیرے مالک بن جاؤں گا۔ چنانچہ دوسرے دن میں نے بیگم صاحبہ کو بتادیا کہ مجھے ان کی شرائط منظور ہیں۔ چنانچہ بیگم صاحبہ نے اپنے منصوبے پر عمل درآمد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میرے دل میں کوئی قلق نہیں تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے روشن مستقبل موجود تھا جسے میں کسی صورت نہیں ٹھکرانا چاہتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں، میں سنگدل ہو چکا تھا۔

منصوبے کے مطابق بیگم صاحبہ نے مجھے رات سوا گیارہ بجے فون کردیا اور بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ”زرین! جلدی سے گھر آجاؤ، اعظم صاحب نیند کی گولیاں کھا کر سو رہے ہیں۔“

”جی اچھا! میں ابھی آرہا ہوں۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے فون بند کیا اور گھر سے جانے لگا تو میری اماں نے پوچھا۔

”زرین، بیٹا! اس وقت کہاں جارہے ہو؟“ ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

”اماں! اعظم صاحب کو کچھ ہو گیا ہے۔ بیگم صاحبہ نے فون کرکے مجھے بلایا ہے۔ شاید اعظم صاحب کو اسپتال لے جانا پڑے۔“

”بیگم صاحبہ تمہیں کیوں بلا رہی ہیں۔“ اماں نے استفسار کیا۔ ”کیا ان کا کوئی بھائی یا رشتے دار نہیں ہے، وہ ان کو کیوں نہیں بلا رہیں۔“

”اماں! بیگم صاحبہ نے بتایا ہے کہ انہوں نے اپنے بھائی کو فون کیا ہے لیکن ان کا فون بند جارہا ہے اسی لیے انہوں نے مجھے فون کردیا۔“ میں نے جھوٹی وجہ بیان کی۔ اس بار اماں نے کوئی بات نہ کی، میں نے جلدی سے سائیکل نکالی اور اعظم صاحب کے گھر روانہ ہو گیا۔

آدھے گھنٹے تک میں اعظم صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ اعظم صاحب اپنے بیڈ روم میں عالم بے ہوشی میں پڑے تھے۔ میرا پورا وجود لرز رہا تھا۔ بیگم صاحبہ نے انہیں نیند کی گولیاں کھلا کر بے ہوش تو کردیا تھا لیکن وہ انہیں مار نہ سکی تھیں۔ بہرکیف میں نے تکیہ اٹھایا اور لرزتے ہاتھوں کے ساتھ اعظم صاحب کے منہ پر رکھ دیا۔ اعظم صاحب تڑپے لیکن مجھے ان کی حالت پر ذرا بھی رحم نہ آیا اور بالآخر انہیں موت کے منہ میں پہنچا کر ہی دم لیا۔ اس کے بعد میں جلدی سے وہاں سے نکل گیا۔ میں قاتل بن گیا تھا لیکن مجھے اس کا کوئی قلق نہیں تھا۔

میں گھر کے قریب پہنچا تو مجھے جبار کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ بیگم صاحبہ نے اسے فون کرکے بتایا ہے کہ اعظم صاحب ہارٹ اٹیک کے باعث فوت ہو گئے ہیں۔ یہ سن کر میں نے سائیکل موڑی اور اعظم صاحب کے گھر پہنچ گیا۔

بیگم صاحبہ نے اپنے رشتے داروں، اعظم صاحب کے بھائیوں اور اپنے میکے والوں کو بھی بلا لیا تھا۔ وہ بے تحاشا رو رہی تھیں۔ ان کے بچے بھی رو رہے تھے۔ وہاں محلے داروں کے علاوہ جبار بھی آیا ہوا تھا۔ میں بھی ان کے غم میں شریک ہو گیا۔ جبار کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ اعظم صاحب کو دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے تھے۔

بیگم صاحبہ تو یوں رو رہی تھیں جیسے واقعی اعظم صاحب کی موت کا انہیں بے حد دکھ ہوا ہو۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب ڈراما ہے۔ اگلے دن نو بجے تک اعظم صاحب کی تجہیز و تکفین ہو گئی۔ اعظم صاحب کے انتقال کے باعث اسٹور تین دن تک بند رکھا گیا۔ پھر بیگم صاحبہ نے مجھے بلا کر اسٹور کی چابی دی اور کہنے لگیں۔

”اب یہ اسٹور تم دونوں ہی چلاؤ گے۔ تم دونوں کو باقاعدہ تنخواہ ملتی رہے گی۔“

میں نے جبار کے ساتھ مل کر اسٹور کا انتظام و انصرام سنبھال لیا۔ بیگم صاحبہ عدت میں تھیں اس لیے میں ان سے ملنے نہیں جاتا تھا کیونکہ بیگم صاحبہ نے بھی کہا تھا کہ جب تک معاملات اور حالات معمول پر نہیں آجاتے ہمارا ملنا ٹھیک نہیں تھا۔

میں نے بیگم صاحبہ کی ہدایات پر من و عن عمل کیا اور ان کی عدت کے گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے احساس ہوا تھا کہ مجھے بھی بیگم صاحبہ سے محبت ہو گئی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے ملتے نہیں تھے لیکن رات کو واٹس ایپ پر بات چیت ضرور کیا کرتے تھے۔ بیگم صاحبہ اعظم صاحب سے چھٹکارا پا کر بے حد خوش تھیں اور بدستور مجھے سہانے سپنے بھی دکھا رہی تھیں۔

وقت گزرتا رہا اور بالآخر ان کی عدت کی مدت بھی گزر گئی۔ اسی رات واٹس ایپ پر میں نے خفیہ نکاح کے حوالے سے بات کی تو وہ بولیں۔

”یار زرین! اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ اگر میں نے فوری طور پر تم سے نکاح کیا تو لوگوں کو شک پڑ جائے گا۔ تھوڑا صبر کرو۔“

”کتنا صبر کروں بیگم صاحبہ۔“

”کم از کم تین چار مہینے صبر کرو۔“ وہ بولیں۔

میں نے دل پر پتھر رکھ لیا۔ اعظم صاحب کے قتل کے بعد میں دوبارہ ان کے گھر نہیں گیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے میری اور جبار کی تنخواہ بھی بڑھا دی تھی۔ اس دوران میں جبار کے ہاتھ اسٹور کا بھاری منافع بیگم صاحبہ کو بھیج دیتا تھا۔

جب اگلا مہینا قریب آیا تو میں نے سوچا کہ اس بار میں خود ہی بیگم صاحبہ کو منافع کی رقم دینے جاؤں گا چنانچہ جیسے ہی اگلے مہینے کی دو تاریخ کو پیسے جمع ہو گئے تو میں رقم لے کر بیگم صاحبہ کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر بیگم صاحبہ کو پہلے تو حیرت ہوئی پھر انہوں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”تمہیں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ جبار کو ہی بھیج دیتے۔“

”کیا مجھے اندر آنے کو نہیں کہیں گی؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ آ جاؤ۔“ بیگم صاحبہ نے کہا اور میں اندر چلا گیا۔

مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر بیگم صاحبہ میرے لیے چائے بنا لائیں۔ میں نے کہا۔

”بیگم صاحبہ! آپ کے کہنے پر میں نے اعظم صاحب کو راستے سے ہٹا دیا ہے اب ہمیں نکاح کر لینا چاہیے۔“ میں نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔“ بیگم صاحبہ مسکرائیں۔ ”تم نکاح خواں اور گواہان کا انتظام کرو۔“

ان کی بات سن کر میں خوشی سے اچھل ہی پڑا۔ بیگم صاحبہ بھی مسکرا رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے کہا۔

”ٹھیک ہے بیگم صاحبہ۔ میں چند دنوں میں نکاح خواں اور گواہوں کا انتظام کرتا ہوں۔“

وہاں سے روانہ ہونے کے بعد میں نے اپنے ایک قریبی دوست فراز سے رابطہ کیا اور ساری بات اس کے گوش گزار کر دی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یار! یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے، ایک نکاح خواں صاحب میرے جاننے والے ہیں۔ گواہان کا بھی بندوبست ہو جائے گا لیکن تمہیں پیسے خرچ کرنے پڑیں گے۔“

”تم پیسوں کی فکر نہ کرو۔“ میں نے کہا۔ ”بس جو کہا ہے وہ کرو۔“

فراز نے اپنے جاننے والے نکاح خواں سے بات کی۔ وہ نکاح خواں اعظم صاحب کا جاننے والا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اعظم صاحب کی بیوہ اپنے شوہر کے ملازم زین سے نکاح کرنا چاہتی ہیں تو انہوں نے ہامی بھر لی۔ دس ہزار میں معاملات طے ہو گئے۔

نکاح کے لیے شام کا وقت مقرر کیا گیا تھا۔ میں بیگم صاحبہ کو لے کر نکاح خواں کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ بیگم صاحبہ اپنے بچے ہمسائے میں چھوڑ آئی تھیں۔ ہم دونوں بے حد خوش تھے۔ اس سے پہلے کہ نکاح خواں نکاح پڑھانا شروع کرتا، اعظم صاحب کا چھوٹا بھائی مزمل پولیس کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ پولیس کو دیکھ کر ہم بھی گھبرا گئے۔

”مجھے پہلے ہی شک تھا کہ میرے بھائی کو میری بھابی نے قتل کیا ہے۔“ مزمل نے غصے سے کہا۔ ”لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ بھائی صاحب کا قابل اعتماد ملازم بھی اس میں ملوث ہوگا۔“

”یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو مزمل۔“ بیگم صاحبہ چلائیں۔ ”میں کیوں اپنے شوہر کو قتل کروں گی۔ انہیں تو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔“

”انہیں ہارٹ اٹیک نہیں ہوا، تم دونوں نے مل کر مارا ہے۔“ مزمل لفظوں کو گویا چباتے ہوئے بولا۔ اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور اسے آن کیا تو ویڈیو ریکارڈنگ چلنے لگی۔ اس میں میری اور بیگم صاحبہ کی گفتگو کی نہ صرف ریکارڈنگ تھی بلکہ ویڈیو بھی تھی جس میں ہم دونوں صوفوں پر پاس پاس بیٹھے تھے اور میں چائے سپ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”بیگم صاحبہ! آپ کے کہنے پر میں نے اعظم صاحب کو راستے سے ہٹا دیا ہے اب ہمیں نکاح کر لینا چاہیے۔“

بیگم صاحبہ اور میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اعظم صاحب کے بھائی مزمل کو بیگم صاحبہ کے کردار پر شک تھا اور اس نے ان کے گھر میں خفیہ کیمرا لگا دیا تھا۔ اب ہمارے پاس صفائی میں کچھ کہنے کے لیے الفاظ نہ تھے۔ پولیس ہمیں گرفتار کر کے تھانے لے گئی۔ ہم دونوں پر کیس چلا اور ہم دونوں کو اعظم صاحب کے قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا ہو گئی۔

اب میں پچھلے چار سال سے جیل میں ہوں اور بہت پچھتا رہا ہوں کہ کیوں میں بیگم صاحبہ کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔ انہوں نے اعظم صاحب کے حوالے سے جو کچھ بتایا تھا میں نے کیوں یقین کر لیا تھا۔ میں اپنے رشتہ داروں اور عزیز و اقارب کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہ رہا تھا۔ کاش کہ میں بیگم صاحبہ کے بہکاوے میں نہ آتا اور نہ اپنی زندگی برباد کرتا لیکن پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت کے مصداق کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

++

سراب

مدیر سرگزشت

السلام علیکم!

میں اردو لکھ پڑھ لیتی ہوں۔ میری ایک مسلمان دوست نے میرا بھرپور ساتھ دے کر میری زندگی کے سب سے بڑے المیہ کو لکھوایا ہے۔ امید ہے یہ روداد آپ کو بھی پسند آئے گی۔

رابعہ

(لندن، یوکے)

میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گئی اور ذرا سی دیر کے لیے میرا دل بھی دھڑکنا بھول گیا۔ میرے پاؤں زمین سے چپک گئے تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں کہ میرا بچھڑا ہوا محبوب آگیا ہے مگر دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ میں اسے دیکھ

کر سوچنے لگی کہ کیا ایک شخص جو اس دنیا سے سدا کے لیے رخصت ہوگیا ہو وہ واپس اس دنیا میں آسکتا ہے؟ ہاں، آتو سکتا ہے...... دوسرے جنم میں، لیکن اسے تو دوسرے جنم میں آنے کے لیے ایک صدی درکار تھی، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مرنے کے تھوڑے عرصے بعد ہی وہ ایک بھرپور جوان کی

UrduNovels.com

صورت میں دنیا میں آ گیا ہو۔

"گوپال! یہ واقعی تم ہو؟" میرے دھڑکتے ہوئے دل کے کسی کونے میں ایک ان جانی صدا گونجی۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ کسی اور سمت میں دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ وہ ایک شناسا چال چلتا ہوا میری ہی طرف آ رہا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔ میں نے خود سے پوچھا۔ "رادھا! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ گوپال کیسے ہو سکتا ہے؟ جب گوپال کی چتا کو آگ لگائی گئی تھی، اس وقت تو بھی تو وہیں موجود تھی۔"

میں نے بغور دیکھا وہی چال تھی۔ وہی دراز قد جس کی وجہ سے وہ کسی یونانی کہانیوں کے شہزادے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ وہی خوب صورتی اور مردانہ وجاہت جسے دیکھ کر لڑکیاں اور شادی شدہ عورتیں بھی اپنے آپ کو بھول جاتی تھیں اور ان کے دل دھک دھک کرنے لگتے تھے۔

جب وہ میرے قریب آیا تو اس کا پورا چہرہ واضح طور پر میرے سامنے تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اس سے میری نظریں ملیں۔ وقت کی نبض جیسے رک گئی۔ وہ مجھے دزدیدہ نظروں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں حیران نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ گوپال سے اس کی حیرت انگیز مشابہت نے مجھے ششدر کر دیا تھا۔ گوپال کا کوئی بھائی نہ تھا۔ یہ دیکھنے میں گوپال کا جڑواں بھائی لگ رہا تھا۔ میں نے اس لیے سوچا کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ دو مختلف..... عورتیں ایسے بچوں کو جنم دیں جو جڑواں بھائی کی طرح ہوں؟ میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ایک خالی بنچ پر جا کر اداس سا بیٹھ گیا تھا۔

میں ہائیڈ پارک رجنی کی تلاش میں آئی تھی۔ ہندوستان سے اس کی بڑی بہن کا ایک خط میرے پتے پر آیا تھا۔ رجنی شیام سے ملنے ہائیڈ پارک آتی رہتی تھی۔ وہ دونوں یہاں آ کر آزادی کا لطف اٹھاتے تھے۔ مجھے رجنی کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ میں واپس جا رہی تھی کہ اس شخص پر میری نظر پڑ گئی تھی۔ پارک میں رنگینی اور رونق اپنے پورے شباب پر تھی۔ بڑی گہما گہمی تھی۔ کہیں جوڑے چہک رہے تھے، چہک رہے تھے۔ فضا میں ایک عجیب سکون تھا۔ اسے دیکھنے سے پہلے میرے دل کے نہاں خانوں میں بھی ایسا ہی سکون تھا۔ اب وہ سکون لٹ چکا تھا۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات ہلچل مچا رہے تھے۔ معلوم نہیں یہ کون سا نشہ تھا جو میرے وجود پر چھا گیا تھا۔ گوپال میرا خواب تھا، میری پہلی محبت تھا۔ میری زندگی اور میرا وجود تھا۔ دولت کی ہوس نے اسے مجھ سے چھین لیا تھا۔ وہ بہت بڑا آدمی بننا چاہتا تھا۔ بڑا آدمی بننے کے لیے اس نے منشیات فروشی کا سہارا لیا تھا۔ وہ ایک بین الاقوامی منشیات فروشوں کے گروہ میں شامل ہو گیا تھا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا تھا لیکن اس پر تو دولت مند بننے کا اندھا جنون سوار تھا۔ وہ پولیس سے مقابلے میں مارا گیا اور میرے دل کی دنیا اجڑ گئی۔

اس شخص کو دیکھ کر پرانی یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ زخم پھر سے ہرے ہو گئے تھے۔ زخموں میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ چند لمحوں بعد میں نے اپنے آپ کو اس کی بنچ پر پایا۔ اس میں کوئی جادو تھا جس نے بے اختیار مجھے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ میں نے حیرت سے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اس کے لباس پر شکنوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ بالوں پر گرد جمی ہوئی تھی۔ چہرہ سخت تھا۔ کئی دنوں کا شیو تھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ وہ نڈھال اور کمزور سا لگ رہا تھا۔ آنکھیں بند کیے نجانے کیا سوچ رہا تھا۔ معاً اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ہندوستانی زبان میں پوچھا۔ "آپ کے پاس سگریٹ ہے؟"

"سگریٹ؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں...... میرے پاس نہ تو سگریٹ ہے اور نہ ہی میں کوئی نشہ کرتی ہوں۔"

"نشہ تو میں بھی نہیں کرتا ہوں۔" وہ بے جان لہجے میں بولا۔ "سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی، اس لیے آپ سے سگریٹ کے لیے درخواست کی۔"

"آپ نشہ نہیں کرتے ہیں؟" مجھے اس کا جواب سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ اس کی حالت ایک نشے باز کی سی ہو رہی تھی۔ لباس بھی میلا کچیلا تھا۔ وہ ایک گداگر کی طرح ہی لگ رہا تھا۔ میں کہے بغیر نہ رہ سکی کہ "یہ آپ کی حالت تو نشے کے عادی کی سی ہو رہی ہے۔ آپ جھوٹ بول کر کسی کو دھوکا نہیں دے سکتے ہیں۔"

"میں تین دن سے بھوکا ہوں۔" اس نے گہری سانس لی۔ "اس لیے میری حالت نشے کے عادی کی سی ہو رہی ہے۔"

"آپ تین دن سے بھوکے ہیں؟" میں چونک پڑی۔ "ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ لندن میں ایک آدمی نے تین دن سے کچھ کھایا پیا نہ ہو؟"

urdusoftbooks.com

"آپ میری بات کا یقین کریں یا نہ کریں، یہ حقیقت ہے۔ میں کوئی ایک مہینے سے بھوک اور افلاس سے گزر رہا ہوں۔" وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا۔

میں نے اس کی طرف تذبذب سے دیکھا۔ میری سانسیں الجھنے لگیں۔ وہ اپنی زبان ہی سے سچ نہیں کہہ رہا تھا، اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں اور اس کی زبوں حالی بھی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ وہ واقعی بھوکا ہے۔ پھر اس کا لہجہ اتنا دکھی تھا کہ میرا سارا بدن جھن جھنا اٹھا۔ میں نے دل میں کہا۔ اگر میرا گوپال زندہ ہوتا تو کیا میں اسے ایک وقت بھی بھوکا دیکھ سکتی تھی؟ میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ میں نے غیر اختیاری طور پر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے چونک کر میری طرف حیرت سے دیکھا۔ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "چلو...... میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں کھانا کھلاتی ہوں۔"

میں نے اسے اپنے ساتھ لیا۔ ٹیکسی میں لے کر گھر پہنچی۔ میرا ایک کمرے کا فلیٹ تھا۔ میرے پاس گوپال کی بہت ساری چیزیں بطور نشانی تھیں جو اس کی آخری رسوم کے بعد میں اس کے فلیٹ سے لے آئی تھی۔ ان میں اس کے کپڑے، جوتے وغیرہ تھے۔ جتنی دیر میں وہ شیو کر کے اور نہا کر کپڑے بدل کر آیا اتنی دیر میں، میں نے اس کے لیے کھانا تیار کر لیا۔ وہ کھانے پر جیسے ٹوٹ پڑا۔ وہ واقعی بھوکا تھا۔ اس نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ اس نے کافی پیتے ہوئے میری طرف بڑی ممنونیت سے دیکھا اور بولا۔

"میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔ کیا میں اپنی محسن کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"اس میں احسان کی کیا بات ہے؟ میں نے تو انسانی فرض ادا کیا ہے۔" میں مسکرائی۔ "میرا نام رادھا کوشل ہے۔"

"میرا نام فیاض احمد بیگ ہے۔" اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ ہم نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ "سچ پوچھیے تو آپ نے مجھے ایک نئی زندگی دی ہے۔ یہ احسان عظیم ہے۔ اس برے وقت میں میرے ہم وطنوں اور دوستوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ جب کہ آپ سے میرا کوئی رشتہ ناتا نہیں اور نہ ہی آپ میری ہم مذہب ہیں اس کے باوجود انسانیت کا ثبوت دیا۔ کاش، میں آپ کا یہ احسان اتار سکتا۔"

"اب آپ کسی اور موضوع پر بات کریں۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "انسان کی مصیبت میں انسان ہی کام آتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

"اچھا یہ کپڑے وغیرہ کس کے ہیں؟ کیا آپ کے بھائی کے ہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ "[illegible] میرے باپ کا ہے۔"

"میرے ایک سورگ باشی دوست کے ہیں۔" میں نے اسے بتایا۔ "اس کی ایک حادثے میں موت واقع ہو گئی تو میں اس کے کپڑے اور بہت ساری چیزیں یہاں لے آئی۔"

میں نے اسے دانستہ طور پر نہیں بتایا کہ وہ گوپال کا ہم شکل ہے۔ میں نے ایسا کیوں کیا یہ بات میں خود بھی نہیں جانتی تھی۔ البتہ میں نے اسے اپنے بارے میں بڑی تفصیل سے بتایا کہ میرے ماتا پتا ہندوستان کے شہر الہ آباد کے رہنے والے ہیں۔ وہ تیس برس پہلے یہاں آئے تو یہیں کے ہو کر رہ گئے، مگر وہ ایک سال میں دو تین مہینے کے لیے ہندوستان ضرور جاتے تھے اس لیے کہ میں الہ آباد میں نانی کے پاس رہ کر تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ جب میں میٹرک کر رہی تھی تو انہی دنوں میری نانی کا انتقال ہو گیا مجبوراً مجھے ان کے ساتھ مستقل طور پر لندن آنا پڑ گیا۔ دو سال پہلے وہ دونوں کار کے ایک حادثے میں چل بسے۔ میں نے ان کی زندگی ہی میں اقوام متحدہ کے لندن دفتر میں ملازمت کر لی تھی۔ وہ آج تک جاری ہے۔ میں اس دفتر میں ایک مناسب عہدے پر تعینات ہوں۔ زندگی بڑے سکون و اطمینان سے گزر رہی ہے۔

فیاض احمد بیگ نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کہ اس کا تعلق ہندوستان کے شہر حیدرآباد دکن سے ہے۔ اس کے والدین ملک تقسیم ہونے کے بعد کراچی میں جا کر بس گئے اور حیات ہیں۔ وہ اپنا مستقبل بنانے کے لیے ماں کے زیورات بیچ کر کسی نہ کسی طرح یہاں کا ویزا حاصل کر کے پہنچا ہے۔ ایک سال تو اس نے جیسے تیسے کاٹ لیا مگر اب پریشان ہے۔ کوئی ڈیڑھ مہینے سے اسے ایسی ملازمت نہیں مل رہی ہے جس سے آسانی سے گزر بسر ہو۔ ایک مہینے کی بے کاری نے اسے اس حال کو پہنچا دیا تھا۔

میں نے اسے سو پاؤنڈ کی رقم دی اور اس سے وعدہ کیا کہ اس کی نوکری کے لیے پوری پوری کوشش کروں گی۔ وہ رات دس بجے تک میرے فلیٹ میں میرے ساتھ رہا۔ اس کی شخصیت گوپال سے کہیں زیادہ پر وقار اور سحر انگیز تھی۔ اس کے خیالات بہت بلند تھے۔ وہ اپنا مستقبل بنانے کے لیے

گوپال کی طرح شارٹ کٹ راستہ اختیار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایسے شارٹ کٹ اس کے ذہن میں بھی تھے لیکن اس نے اپنے ضمیر کو بیچنا گوارا نہیں کیا۔

جب میں سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو فیاض کے بارے میں سوچنے لگی۔ میں نے اسے ایک نفیس اور خوددار شخص پایا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اس کی ذات کی اسیر ہو چکی ہوں۔ گوپال کی موت سے میری زندگی میں جو خلا پیدا ہوا تھا اسے فیاض پُر کر سکتا ہے۔ وہ بھی میرے احسان اور سلوک سے بہت متاثر ہوا تھا اور دو چار ملاقاتوں میں، مجھ سے بھی متاثر ہو سکتا تھا میں نے اسے کئی مرتبہ دزدیدہ نظروں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تھا۔

صبح دفتر پہنچی تو اس کا خیال میرے دل و دماغ پر چھایا رہا تھا۔ میں نے دو ایک مرتبہ سوچا بھی تھا کہ فیاض نہ صرف پاکستانی ہے بلکہ مسلمان بھی ہے۔ میں ہندوستانی ہوں اور ہندو مذہب کی ہوں۔ کیا ہم دونوں کی دوستی اور محبت پروان چڑھ سکتی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مذہب کی دیوار ہم دونوں کے درمیان کھڑی ہو جائے؟ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ ہندوستان اور پاکستان نہیں ہے۔ یہ لندن ہے۔ یہاں ہندو مسلمان لڑکے اور لڑکیاں سول میرج کر کے گھر بسا چکے ہیں۔ یہاں کوئی روک ٹوک اور پابندی نہیں ہے۔

ایک ہفتے کے اندر اس سے میری دو تین ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے اس کی مزید مالی مدد کی۔ پھر اسے میری کوشش سے بہت اچھی جگہ نوکری مل گئی تھی۔ اس کے حالات بالکل بدل گئے۔ فیاض کی آمدورفت میرے ہاں بڑھ گئی۔ اب کوئی شام ایسی نہ گزرتی تھی کہ وہ مجھ سے ملنے میرے فلیٹ پر نہ آتا ہو۔ پھر ہم دونوں سیر و تفریح اور ہوٹل بازی کے لیے نکل جاتے تھے۔ وہ اتوار کی صبح بھی میرے ہاں آ جاتا تھا۔ اب تک ہم دونوں نے ایک دوسرے سے اظہار محبت نہیں کیا۔ محبت کے اظہار کے لیے الفاظ کی ضرورت تو نہیں ہوتی ہے۔ اس کی باتوں اور حرکات و سکنات سے میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے شدید محبت کرنے لگا ہے۔ میں اس کی کمزوری بن گئی ہوں۔

میری عمر اکیس برس کی تھی۔ میں برہمن خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ میری رنگت سرخ و سپید تھی۔ میرا شمار خوب صورت لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ بہت سے ہندوستانی لڑکے اور مرد میری دوستی اور مجھ سے شادی کے خواہش مند تھے لیکن گوپال کی موت کے بعد میں نے دل میں عہد کر لیا تھا کہ اب میں نہ تو کسی سے محبت کروں گی اور نہ ہی شادی، مگر فیاض نے میرے اس عہد کو توڑ دیا تھا۔ وہ میرے دل کے نہاں خانے میں سدا کے لیے بس چکا تھا۔ اس کی عزت میرے دل میں اس لیے بھی بڑھ گئی تھی کہ اس نے ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی جس کی وجہ سے مجھے شکایت کا موقع ملتا۔ فلیٹ میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ تنہائی ہوتی تھی۔ دو جوانیاں یک جا ہوتی تھیں۔ وہ اپنی حدود سے بڑھنے کی کوشش کر سکتا تھا مگر اس نے میرے ساتھ ریستوران میں جانے یا کلب میں جا کر رقص کرنے تک اپنے آپ کو محدود کر رکھا تھا۔

میں اسے اپنے ساتھ رجنی کی برتھ ڈے پارٹی پر لے گئی تھی۔ اس پارٹی میں زیادہ تر ہندوستانی لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ سرلا رانی بھی آئی تھی۔ وہ یہاں ایک کلب میں ڈانس کرتی تھی۔ خوب صورت اور وجیہ مرد اس کی کمزوری تھے۔ اس نے اب تک نہ جانے کتنے مردوں کو ان کی عورتوں سے چھین لیا تھا۔ وہ رجنی کی کزن تھی۔ اس روز وہ ایسے لباس میں آئی تھی کہ جس نے اسے حد سے زیادہ نمایاں کر دیا تھا۔ پارٹی میں شریک مرد اسے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی عورت نہیں دیکھی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں کشش تھی۔ اس نے فیاض کو جو دیکھا تو اس پر ریشہ خطمی ہو گئی۔ وہ پارٹی کے اختتام تک اس کے ساتھ چپکی رہی۔ اس کے ساتھ رقص بھی کیا تھا۔ اس روز فیاض گوپال کا سب سے اچھا اور نفیس سوٹ پہن کر آیا تھا۔ ڈیڑھ دو مہینے کے عرصے میں وہ اور دل کش دکھائی دینے لگا تھا۔ اس روز تو ایسا غضب ڈھا رہا تھا کہ ہر کسی کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ وہ خود بھی سرلا سے اس قدر متاثر ہو گیا تھا کہ مجھے لفٹ ہی نہیں کرا رہا تھا۔ اسے سرلا پر مہربان دیکھ کر میرے دل میں خنجر سا اتر گیا۔ اچانک دونوں پارٹی سے غائب ہو گئے۔ نروپا نے مجھے اشارے سے بتایا کہ وہ دونوں ہوٹل کے بیڈ روم میں ہیں۔ میں نے اس کے بیڈ روم کے پاس جا کر اندر جھانکا تو سن سی ہو کر رہ گئی اور خاموشی سے لوٹ آئی۔

میں پارٹی کے اختتام پر اسے اپنے ساتھ لے کر فلیٹ پر آئی۔ پھر اس پر برس پڑی دل کا غبار چھٹ گیا تو میں نے اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔ اپنی انگلیوں سے اس کے سینے کے سیاہ بالوں کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ”فیاض! میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

”شادی؟ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟“ وہ میری

زبان سے شادی کی بات سن کر اس قدر خوش، اتنا سرشار ہوا کہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ مجھے میری منزل اتنی جلد مل جائے گی۔ میں اس وقت اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا ہوں مگر رادھا......" اس کے الفاظ دم توڑ گئے۔ لہجہ بجھ گیا چہرے پر اداسی کی گھٹا سی چھا گئی۔

"مگر کیا......؟" میں نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ اس کی پریشانی کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔

"اس شادی کے بیچ ایک دیوار ہے جسے گرانا نہ تمہارے بس میں ہے اور نہ میرے۔" وہ افسردگی سے بولا۔

"کون سی دیوار؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔ میرے بدن میں خون برف کی طرح سرد ہو رہا تھا۔

"مذہب کی دیوار......" اس نے جواب دیا۔ "تم ہندو ہو اور میں مسلمان ہوں، تمہارے اور میرے مذہب والے اس بات کو بالکل پسند نہیں کریں گے۔"

"ہماری محبت ہمارا پہلا امتحان لے رہی ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "محبت اندھی ہوتی ہے۔ اس کا کوئی مذہب اور ملک نہیں ہوتا ہے۔ یہ دنیا کے ہر خطے اور ہر قوم میں پیدا ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں جب پہلی مرتبہ دیکھا تو ایک انسان کی نظر سے۔ تمہیں پسند کیا چاہا ایک انسان کی طرح، میں نے یہ نہیں سوچا کہ میں ہندو ہوں اور تم مسلمان ہو۔ بس تم سے محبت ہو گئی۔ تم میرا خواب، میری محبت اور میری زندگی بن گئے۔ اب تو تم میرا وجود ہو فیاض!"

"میرے دل نے کبھی بھی یہ نہیں سوچا کہ تم کون ہو؟ تم سے میرا محبت کا رشتہ قائم ہو گیا۔ ایک گہرا اور پاکیزہ......"

"کیا تم میری خاطر، میری محبت کی خاطر اپنا مذہب چھوڑ سکتے ہو؟ مجھے پانے کے لیے ہندو بن سکتے ہو؟"

"میں تمہاری محبت کی خاطر اپنی جان دے سکتا ہوں۔ بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہوں مگر اپنا مذہب نہیں چھوڑ سکتا۔"

"کیوں فیاض؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا تمہارے نزدیک محبت کوئی حقیقت نہیں رکھتی ہے؟"

"اس لیے کہ مجھے بہر حال ایک روز اپنے وطن واپس جانا ہے۔" وہ کہنے لگا۔ "وہاں میرے والدین میرے بھائی بہن اور رشتے دار ہیں۔ وہاں سب ہی مسلمان ہیں۔ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ میں نے ہندو مذہب اختیار کر لیا تو مجھے میرے وطن میں داخل ہونے نہیں دیا جائے گا۔ اس تبدیلیٔ مذہب کی سزا قانون دے یا نہ دے میرے، رشتے دار اور دوست احباب دیں گے مجھے چھوں کیا اپنی دو بہنوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ بوڑھے والدین کا سہارا بننا ہے اس لیے وطن واپس جانا پڑے گا۔"

"اگر میں تمہاری خاطر، اپنی محبت کی خاطر مسلمان ہو جاؤں تو کیا تمہارے گھر والے مجھے قبول کر لیں گے؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔" فیاض بہت خوش ہوا۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ آنکھیں چمکنے لگیں۔ "میرے گھر والے بہت خوش ہوں گے کہ ایک غیر مذہب لڑکی نے اسلام قبول کر لیا۔ وہاں تمہیں بڑی عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔ تم...... تم مسلمان ہو جاؤ گی رادھا؟"

"کیوں نہیں فیاض!" میں نے اس کے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کر دیں۔ "میں اپنی محبت اور تمہاری خاطر جب جان دے سکتی ہوں تو مذہب بھی چھوڑ سکتی ہوں۔"

"تم...... میرے لیے اتنی بڑی قربانی دو گی؟ تمہارے رشتے دار اور خاندان والے کچھ نہیں کہیں گے؟ وہ تمہارے دشمن تو نہیں ہو جائیں گے؟"

"کیوں نہیں فیاض!" میں نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھا۔ "عورت جب محبت کرتی ہے تو قربانی بھی دیتی ہے۔ اس لیے کہ مرد جسم ہوتا ہے اور عورت روح ہوتی ہے، روح کے بغیر جسم کچھ نہیں ہوتا۔"

تھوڑی دیر بعد فیاض چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں کتنی ہی دیر تک سرور رہی۔ فیاض کی تصویر میں نے ایک ہفتہ پہلے ہائیڈ پارک میں اپنے کیمرے سے اتاری تھی، اسے چومتی آنکھوں اور سینے سے بار بار لگاتی رہی۔ میں خوشی سے پاگل اور بے قابو ہوئے جا رہی تھی کہ فیاض میرا ہے، صرف میرا ہے۔ میں نے اس کے سر پر چڑھا ہوا سر لا رامائی کا جادو اتار دیا تھا۔

جب میں سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو میرے دل کے کسی کونے میں ایک نادیدہ آواز نے کہا۔ "پگلی! تو نے اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ جذبات کی رو میں بہہ کر کر لیا؟ تو نے کیسے سوچ لیا کہ تیری اس سے شادی ہو جائے گی؟ کیا تیرے رشتے دار اور خاندان والے اس شادی پر چپ رہ جائیں گے؟ اگر تیری شادی کسی انگریز سے ہو جائے تو یہ قابلِ اعتراض بات نہیں لیکن کسی مسلمان سے شادی کرنا کتنا

بڑا پاپ ہے کیا تو نہیں جانتی؟ اور پھر تو مسلمان ہو رہی ہے؟ وہ مذہب اختیار کر رہی ہے جس سے ہر ہندو نفرت کرتا ہے؟ جو ہندو دھرم کا سخت دشمن ہے؟ تو اپنے پتاجی کی وہ بات بھول گئی جو انہوں نے تجھ سے کئی مرتبہ کہی تھی کہ ملک کی تقسیم کے وقت ان کے دو بھائیوں کو مسلمانوں نے قتل کر دیا تھا۔ آج بھی ہندو مسلمان تیرے باپ دادا کے دیس میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ کیا تجھے تیرے دھرم کے لوگ زندہ چھوڑ دیں گے؟ احمق! اب بھی وقت ہے۔ تو اس سے شادی کرنے سے انکار کر دے۔ انکار کے ہزار حیلے بہانے مل جائیں گے۔ تو محبت کے لیے اتنی بڑی قربانی مت دے۔ صرف تیری ہی نہیں اس دھرم کی بھی ناک کٹ جائے گی۔ پھر تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ خوب اچھی طرح سوچ لے۔"

جوانی تو آنکھوں سے دیکھتی ہے اور دل اس کی بات مان لیتا ہے پھر عورت، عورت ہوتی ہے۔ اس کا دل اور اس کی محبت بھی اندھی ہوتی ہے۔ اس کے دل میں ایسے ایسے ارمان بھرے ہوتے ہیں کہ مرد اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہر عورت یہ سوچتی ہے کہ دوسری عورتوں کی طرح اس کا اپنا بھی ایک گھر ہو اور وہ اس گھر کو جنت کا نمونہ بنا دے۔ جب سے فیاض نے میری زندگی میں قدم رکھا تھا۔ میری سوچ بھی ایک عام عورت کی سوچ بن گئی تھی۔ گوپال کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کا وجود مجھے فیاض کی صورت میں ملا تھا۔ میں اس کے وجود کو کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو جو باغی اور سرکش ہو گئی تھی، سمجھایا کہ اب میں اتنی دور آ گئی ہوں کہ میرے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ وہ میرا دھرم بن گیا ہے۔ میری خوشی ہے۔ میں اسے کسی قیمت پر چھوڑ نہیں سکتی ہوں اس لیے کہ جس کے لیے عورت ساری زندگی بھٹکتی ہے، وہ محبت کی منزل ہے۔ وہ اس منزل کو پانے کے لیے نہ صرف اپنے گھر، ماں باپ بلکہ ساری دنیا کو چھوڑ دیتی ہے۔ تہذیب کے بندھنوں کو توڑ دیتی ہے۔ تاریخ کے صفحات عورت کی ایثار اور قربانی سے بھرے پڑے ہیں۔ آخر میں بھی تو ایک عورت ہوں۔ کیا میں اپنی محبت کی خاطر اپنے دھرم کو چھوڑ نہیں سکتی ہوں؟

جمعے کے روز فیاض مجھے اپنے ساتھ بریڈ فورڈ لے گیا۔ وہاں ایک عالم دین رہتے تھے۔ ان کا نام چوہدری فتح محمد تھا۔ ان کی عمر ساٹھ ستر برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ بڑی بارعب اور پروقار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے نورانی چہرے پر ایسا جاہ و جلال تھا کہ میں ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آئے۔ جب انہوں نے اچھی طرح سے اس بات کی تسلی کر لی کہ میں بغیر کسی لالچ، دھونس اور دھمکی کے برضا و رغبت اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے مجھے کلمہ پڑھایا۔ اس طرح میں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور مسلمان ہو گئی۔ انہوں نے میرا اسلامی نام رابعہ رکھا۔ یہ نام مجھے بہت پسند آیا۔ مجھے مسلمان ہونے سے بڑی خوشی ہوئی۔ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میں نے اپنے آپ کو سیدھے راستے پر ڈال دیا ہے۔ میں نے دنیا کی کوئی بہت ہی انمول شے پالی ہو۔ میرے دل کے کسی کونے میں اپنا دھرم چھوڑنے پر، ذرا بھی دکھ نہیں تھا۔ نہ اس بات کا صدمہ تھا کہ یہ میرے ماں باپ کا دھرم تھا۔ میں نے اس دھرم کو کیوں چھوڑ دیا۔

میں نے شادی کرنے میں پندرہ بیس دنوں کی تاخیر کر دی اس لیے کہ میں شادی کرنے کے بعد ہنی مون منانے کے لیے انگلینڈ سے باہر جانا چاہتی تھی۔ میرے دل میں فرانس، جاپان اور جرمنی کی سیر و سیاحت کی بڑی خواہش تھی۔ میں دو تین مرتبہ فرانس گئی تھی۔ صرف پیرس میں دو ایک دن رہی تھی۔ میں یہ چاہتی تھی کہ سیر و سیاحت کے لیے جاؤں تو میرے پاس رقم اتنی ہو کہ دل کھول کر خرچ کروں۔ فائیو اسٹارز ہوٹل میں رہوں۔ انواع و اقسام کے کھانے کھاؤں۔ فیاض کے اخراجات بھی مجھے ہی ادا کرنے تھے۔ اس غریب کے پاس تھا ہی کیا۔ میرے پاس دس بارہ ہزار پاؤنڈ تھے جو بینک میں، میں نے ڈپازٹ کر رکھے تھے۔ دس ہزار پاؤنڈ میرے خیال میں ناکافی تھے اس لیے کہ ہم دونوں کو خریداری بھی کرنا تھی۔ میں نے بہت سوچ بچار کے بعد اپنے والد کا وہ فلیٹ جو میں نے کرائے پر اٹھا رکھا تھا بیچنے کا فیصلہ کر لیا۔ بس میرے سر پر ایک دھن سوار ہو گئی تھی۔ میں اسے ہر قیمت پر پورا کرنا چاہتی تھی۔ ادھر میرے اسلام قبول کرنے کی خبر میرے رشتے داروں، دوستوں اور ملنے والوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ دوستوں نے ناک بھوں چڑھائیں۔

..... سب سے زیادہ رشتے داروں نے برا منایا۔ انہوں نے مجھ سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میں ایک خود مختار لڑکی تھی۔ یہ انگلینڈ ہے میرا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔

پھر ایک جمعے کو ایک چھوٹی اور پروقار تقریب میں

فیاض سے میری شادی ہو گئی۔ میرا نکاح بھی چوہدری فتح محمد نے ہی پڑھایا تھا۔ سنیچر کے دن سہ پہر کی فلائٹ سے ہم دونوں پیرس کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہنی مون کا آغاز میں نے پیرس سے کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ فیاض کی بھی بڑی خواہش تھی کہ سب سے پہلے پیرس چلا جائے۔ پیرس کے ایک انتہائی اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں ہمارے لیے کمرا بک تھا۔ یہ کمرا کسی بھی شاہی محل کی خواب گاہ سے کم نہیں تھا۔ میں نے اپنی سہاگ کی پہلی رات اپنے آپ کو ایک روایتی مشرقی دلہن کی طرح سنوارا۔ میں مشرقی دلہن کی طرح پلنگ پر لمبا سا گھونگھٹ نکال کر بیٹھ گئی۔ فیاض نے میرا گھونگھٹ اٹھانے کے بعد مجھے منہ دکھائی میں ایک خوب صورت سی سونے کی انگوٹھی دی۔

ہم جاپان گئے تو وہ اس قدر پسند آیا کہ وہاں سے کسی اور ملک کو جانے کو جی نہیں چاہا۔ وہ فرانس سے بھی زیادہ خوب صورت تھا۔ مجھے اپنی اس نئی زندگی کا آغاز بہت حسین اور دل کش لگا تھا۔ شاید اس لیے کہ دنیا کا سب سے خوب صورت اور وجیہہ مرد میرا شوہر تھا۔ ہمارے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ میں اسے پا کے اتنی خوش تھی کہ اس کے اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں تھے۔ اس کی قربت میں جب میں دیکھتی تھی تو اطراف میں مجھے رنگ ہی رنگ نظر آتے تھے۔ جو چیزیں میں دیکھتی تھی وہ بدلی بدلی سی نظر آتی تھیں۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا وجود میرا نہیں رہا ہے۔ میں اپنے آپ سے جیسے بیگانہ ہو چکی تھی۔ فیاض کے بازوؤں میں مدہوش ہو جاتی تھی۔ اس کی محبت کا خمار تھا کہ ذہن سے اترتا نہیں تھا۔

دو مہینے کے بعد ہم واپس لندن آ گئے تھے۔ یہاں آ کر ہم نے ایک عملی زندگی کا آغاز کیا۔ فیاض تو مجھ سے بھی کہیں زیادہ خوش تھا۔ میں اس کی محبت میں روز ہی ایک نئی گرم جوشی اور اس کے جذبات میں شدت محسوس کرتی تھی۔ ہماری زندگی پر جیسے بہار کے سارے رنگ چھا گئے تھے۔ ہر طرف دھنک کے رنگوں کا گماں سا ہوتا تھا۔ میں نے خواب وخیال میں سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی اتنی حسین اور اتنی پیاری ہو جائے گی۔ فیاض میرے لیے ایک بہترین ہم سفر ثابت ہوگا۔

چھ مہینے کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ فیاض ابھی باپ بننے کا خواہش مند نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ دو تین برس ہم آزادی سے گزاریں اور زندگی کا لطف اٹھائیں۔ بچوں کی پیدائش کے بعد ہماری زندگی گھر کی حد تک محدود ہو کر رہ جائے گی۔ میں نے اس خیال سے اتفاق کیا۔ مجھے بچوں کی ایسی جلدی بھی نہیں تھی۔

میں نے فیاض کو جس کمپنی میں ملازمت دلوائی تھی وہ کمپنی مالی مشکلات کا شکار ہونے کی وجہ سے دیوالیہ ہو گئی اور اس کی ملازمت جاتی رہی۔ وہ ایک بار پھر بے روزگار ہو گیا۔ اسے نوکری کی بڑی فکر تھی۔ نوکری چھوٹ جانے کا اسے بہت غم ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ اسے ہر مہینے اپنے والد کو گھر کے اخراجات کے لیے رقم بھیجنا ہوتی تھی۔ ... تنخواہ ملتی تھی اس میں سے وہ ... حصہ اپنے پاس رکھ کر باقی رقم گھر بھیجتا تھا۔ اسے زیادہ رقم کی یوں ضرورت نہ ہوتی تھی کہ

موسم

کسی مقام کے خاص وقت یا مدت میں درجۂ حرارت، ہواؤں کے رخ اور بارش کے اثر سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، موسم کہلاتی ہے۔ موسم کو رُت اور فصل بھی کہتے ہیں۔ موسم کسی خاص مدت کی موسمی کیفیات کا نام ہے اور آب و ہوا اس علاقے کے موسموں کی مجموعی سالانہ اوسط کو کہتے ہیں۔

عام طور پر دنیا میں چار قسم کے موسم پائے جاتے ہیں۔ بہار، گرما، خزاں اور سرما۔ یہ موسم سورج کی تپش کی مختلف صورتوں سے، زمین کی دوری و گردش سے پیدا ہوتے ہیں۔ 21 مارچ کو جب سورج خطِ استوا پر عموداً چمکتا ہے تو شمالی کرّے میں بہار کا موسم شروع ہوتا ہے۔ 21 جون کو جب سورج خطِ سرطان پر عموداً چمکتا ہے تو اس کرّے میں گرمیوں کا موسم شباب پر ہوتا ہے۔ 23 ستمبر سے موسم خزاں شروع ہوتا ہے اور 22 دسمبر کو سردیوں کا موسم۔ ہمارے ملک میں ایک موسم زائد ہے جسے برسات کا موسم کہتے ہیں۔ یہ جون، جولائی اور اگست کے مہینے ہوتے ہیں۔ شمالی نصف کرے کے موسم جنوبی نصف کرے کے موسموں سے مختلف ہوتے ہیں۔ یعنی جب شمالی حصے میں گرمیوں کا موسم ہوتا ہے تو اس وقت جنوبی کرے میں سردیوں کا موسم ہوتا ہے۔

مرسلہ: ریحانہ منیر۔ کراچی

سارے اخراجات میں اضافی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جب تک اسے کہیں نوکری نہیں مل جاتی وہ کسی ہوٹل میں جا کر کوئی نہ کوئی کام کرے گا۔ بس کنڈکٹر یا چھوٹے موٹے کام کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ وہ لیبر جاب کرے۔ بہر حال میں ایک مشرقی عورت تھی۔ میری نس نس میں مشرقی خون تھا۔ وہ میرا شوہر تھا۔ ایک مشرقی عورت کے لیے اس کا شوہر جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ وہ میری محبت بھی تو تھا۔ لہٰذا میں نے اسے لیبر جاب کرنے نہیں دیا۔

لندن میں بے روزگاری روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اچھی ملازمت کا ملنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں باہر سے لوگ تلاش معاش کے لیے روز ہی آ رہے تھے۔ لیبر جاب کی کمی نہ تھی۔ وہ کوئی چار مہینے تک بے کار رہا۔ اس عرصے میں، میں اسے ہر ماہ گھر بھیجنے کے لیے ڈیڑھ سو پاؤنڈ دیتی رہی اور اس کے ذاتی اخراجات بھی برداشت کرتی رہی۔ کبھی اسے اس بات کا احساس ہونے نہیں دیا کہ وہ اور میں الگ الگ ہیں۔ میری ہر چیز اس کی ہے میں اس کی ملکیت ہوں۔ میرے لیے اس کے اور اس کے گھر کے اخراجات برداشت کرنا مشکل نہ تھا۔ میری تنخواہ بہت اچھی تھی۔ میں ہر مہینے دو سو پاؤنڈ بڑی آسانی سے بچا لیتی تھی۔ اس کے علاوہ میرا اچھا بینک بیلنس بھی تھا۔ پھر اسے میری ہی کوششوں سے بہت اچھی جاب مل گئی۔ تنخواہ بھی اچھی تھی۔ سہولتیں توقع سے زیادہ تھیں۔

ادھر لندن میں نسلی فسادات زور پکڑ گئے۔ کسی نہ کسی واقعے پر نسلی فسادات شروع ہو جاتے۔ میں اسی لیے اسے تاکید کرتی تھی کہ وہ دفتر سے جلد گھر پہنچ جایا کرے۔ ہم دونوں نے شام کو نکلنا بند کر دیا تھا۔ ایک روز تو ایسا ہوا کہ گورے بدمعاشوں نے مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی۔ پولیس کی وجہ سے ان کی کوشش ناکام ہو گئی۔ اس واقعے نے مجھے ہراساں کر دیا تھا۔ میرے دل کے کونے میں خوف بیٹھ گیا تھا۔ بہرکیف اس روز سے میں بہت محتاط ہو گئی تھی۔

چند دنوں سے نسلی فسادات کچھ زیادہ ہی بھڑک اٹھے تھے۔ نیگرو اور ایشیائی لوگ بہت مارے گئے تھے۔ لڑکیوں کو اغوا کر کے انہیں ہوس کا نشانہ بنایا گیا تھا اور بچوں کو بھی وحشیانہ پن سے قتل کر دیا گیا تھا۔ گورے غنڈے بھی مارے گئے تھے۔ یہ صورت حال بڑی تشویش ناک تھی۔ پورے شہر اور خاص کر کے ویسٹ اینڈ میں بڑا خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ کشیدگی بدستور بڑھتی جا رہی تھی۔ حالات دگرگوں تھے اس لیے

نہیں آ رہے تھے کہ پولیس جانب داری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ان حالات کے پیش نظر فیاض نے یہ تجویز پیش کی کہ کیوں نہ ہم پاکستان جا کر مستقل طور پر سکونت اختیار کر لیں۔ وہاں ایک اشتہاری کمپنی یا ایک چائنیز ریسٹورنٹ کھول لیں گے۔ اس سے میری کوئی بات چھپی ہوئی نہیں تھی۔ میں اسے بتا چکی تھی کہ میری تنخواہ کتنی ہے۔ بینک بیلنس کتنا ہے۔ میرا فلیٹ کس مالیت کا ہے۔ میری مالی پوزیشن بہت مستحکم تھی۔ اس کے خیال میں دس بارہ لاکھ روپے میں ہم بڑی آسانی سے اپنا مستقبل بنا سکتے تھے۔ یہ رقم پاکستان جیسے ملک میں بہت بڑی تھی۔ میں نے فیاض کی خوشی کی خاطر اس کی تجویز مان لی۔ یوں بھی میں یہاں کی زندگی سے اکتا چکی تھی۔ اس کی وجہ میرے رشتے دار تھے جو میرے مسلمان ہونے اور ایک مسلمان سے شادی کرنے پر نالاں تھے۔ مجھے نفرت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ میں نے اپنا فلیٹ بیچا۔ ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ مسٹر برنارڈ کو جو اس دفتر کے اعلیٰ افسر تھے، ملازمت چھوڑنے کا بڑا دکھ تھا۔ تاہم انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اگر کسی وجہ سے واپس لندن آ جاؤں تو ان سے ضرور ملوں وہ مجھے پھر سے دوبارہ اسی ملازمت اور عہدے پر تعینات کر دیں گے۔

میں پاکستان جا رہی تھی تو بہت خوش تھی کہ ایک اسلامی ملک میں جا رہی ہوں۔ ایک اسلامی معاشرہ ہے اور پھر اسلام نے عورت کو بڑی عزت، اہمیت اور تحفظ دیا ہوا ہے۔ وہاں میری بڑی عزت کی جائے گی کہ میں نے ہندو دھرم چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے۔ میں ایک بھرے گھر میں رہوں گی جہاں میری ساس اور نندیں ہوں گی۔ دیور ہوں گے۔ ان سب کے ساتھ مل جل کر رہوں گی اور ہنسی خوشی زندگی گزاروں گی۔ اس زندگی سے مجھے ایک طرح سے روحانی خوشی حاصل ہو گی۔

کراچی پہنچ کر فیاض نے ہوٹل میں ایک ڈبل بیڈ روم لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنے گھر والوں کو اب تک اپنی شادی کی اطلاع نہیں دی تھی اس کی والدہ کے دل کو شدید قسم کا صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا کہ اس نے بتائے اور اجازت لیے بغیر ایک نو مسلم لڑکی سے شادی کر لی۔ وہ چاہتا تھا کہ پہلے میرے لیے اپنے گھر کی فضا ہموار کرے پھر اپنی ماں اور بہنوں کو اپنے اعتماد میں لے کر انہیں شادی کے بارے میں بتائے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کی والدہ نہ صرف پرانے خیالات کی عورت ہیں بلکہ بے حد ضدی مزاج

urdunovelist.com

۔۔۔ کسی بات پر وہ چڑ جائیں تو انہیں منانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس نے مجھے تسلی دی تھی کہ گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ انہیں بہنوں کی مدد سے راضی کرنے میں پندرہ بیس دن لگ جائیں گے۔ اسے کچھ دنوں تک راتیں اپنے ہاں گزارنا ہوں گی۔ وہ دن میں میرے پاس آ جایا کرے گا۔

دس بارہ دن پلک جھپکتے گزر گئے۔ فیاض رات دس گیارہ بجے اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ اس نے صرف دو تین راتیں ہوٹل میں میرے ساتھ گزاری تھیں۔ وہ صبح آٹھ نو بجے آ جاتا۔ ہم دونوں مل کر ناشتا کرتے۔ اس نے ایک پرائیویٹ گاڑی کرائے پر لے رکھی تھی۔ اس گاڑی میں صبح دس گیارہ بجے ہم دونوں کاروبار کے لیے جگہ دیکھنے نکل جاتے۔ ہمارا ارادہ اشتہاری کمپنی کا تھا۔ میں نے سولہ لاکھ روپے کی رقم کا ڈرافٹ اس کے نام بنا دیا تھا، اس لیے کہ کراچی میں اس کے نام ایک بینک میں اکاؤنٹ تھا۔ ہم لنچ کسی اچھے ہوٹل میں کر کے اپنے ہوٹل واپس آتے۔ شام چھ بجے تک آرام کرتے پھر تیار ہو کر سیر و تفریح کے لیے نکل جاتے۔

میں نے چودھویں دن اس سے پوچھا۔ "کیا تم نے اپنی ماں بہنوں سے میرے بارے میں بات چیت کی؟ آخر میں کب تک ہوٹل میں نظر بند رہوں گی۔"

"میری بہنیں بھی اس موضوع پر امی سے بات کرنے سے ڈرتی ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "کچھ دن اور صبر کر لو۔ میں امی کا موڈ دیکھ کر ان سے خود ہی بات کر لوں گا۔"

"ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم مجھے اپنے ساتھ گھر لے جاؤ اور انہیں صاف صاف بتا دو کہ ہم دونوں میاں بیوی کے رشتے میں بندھ چکے ہیں۔" میں نے کہا۔ "زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ وہ مجھے گالیاں دیں گی۔ میں ان کی گالیاں سن لوں گی۔ ذرہ برابر بھی برا نہیں مناؤں گی۔ جوتے ماریں گی تو جوتے بھی کھا لوں گی، اس لیے کہ وہ اب میری ماں کی جگہ ہیں۔"

"میری امی دل کی مریضہ ہیں۔" وہ بولا۔ "ایسا نہ ہو کہ صدمے سے ان پر دل کا دورہ پڑے اور وہ جان لیوا ثابت ہو۔"

میں نے جب سنا کہ وہ دل کی مریضہ ہیں تو خاموش ہو گئی۔ کوئی ایک ہفتے کے بعد میں نے پھر اس موضوع پر بات کی تو وہ حیلے بہانے کرنے لگا۔ اس کی ان باتوں سے میرے دل میں شک پیدا ہوا۔ ایسا لگا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ وہ کسی وجہ سے مجھے اپنے گھر لے جانا نہیں چاہ رہا ہے۔ وہ یا تو اپنی امی سے ضرورت سے زیادہ ڈرتا ہے یا پھر اس کی امی مجھے کسی وجہ سے قبول کرنا نہیں چاہتی ہیں۔ بہتر ہے کہ مجھے ہی اس کے گھر والوں سے مل کر بات کر لینا چاہیے اور انہیں صاف صاف بتا دینا چاہیے کہ میری اور فیاض کی شادی ہو چکی ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہم دونوں کو جدا نہیں کر سکتی پھر میں کوئی انگریز لڑکی نہیں ہوں۔ ایک ہندوستانی لڑکی ہوں۔ مسلمان بھی ہو چکی ہوں۔

دوسرے دن فیاض نے صبح دس بجے آ کر مجھے کہا کہ اس کی والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے انہیں اسپتال لے جانا ہے۔ وہ سہ پہر کے وقت آئے گا۔ میرے لیے یہ سنہرا موقع تھا۔ فیاض ہوٹل سے نکلا تو میں بھی چند لمحوں کے بعد اس کے پیچھے نکلی۔ جس وقت وہ ہوٹل سے نکل کر گاڑی میں جا بیٹھا، میں ہوٹل کی عمارت سے باہر آئی۔ اتفاق سے ایک خالی ٹیکسی آ کر رکی۔ میں اس میں بیٹھ گئی اور ٹیکسی ڈرائیور سے بولی کہ اس گاڑی کا تعاقب اس طرح سے کرو کہ اسے شک نہ ہو۔ فیاض کی گاڑی مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی ایک رہائشی علاقے میں داخل ہوئی تو ٹیکسی ڈرائیور نے میرے دریافت کرنے پر بتایا کہ اسے حیدرآباد کالونی کہتے ہیں۔ فیاض کا مکان میں نے دور سے دیکھ لیا تھا۔ یہ مکان ایک سو بیس گز پر بنا ہوا تھا اور خوب صورت تھا۔

شام کے وقت فیاض آیا تو میں نے اس پر ظاہر نہیں کیا کہ میں اس کا مکان دیکھ آئی ہوں۔ میں نے اس کی امی کی طبیعت کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ اب ان کی طبیعت قدرے بہتر ہے وہ گھر پر ہیں۔ وہ مجھے کلفٹن لے گیا۔ اس نے وہاں جا کر مجھ سے کہا کہ میرا خیال ہے امی شاید اس شادی کے بارے میں جان کر مجھے گھر میں قدم رکھنے بھی نہ دیں۔ ہم لاہور جا کر سکونت اختیار کر لیں اور وہاں کوئی بزنس شروع کر دیں۔ اس طرح ہم وہاں بڑے سکون و اطمینان سے اچھی زندگی گزار سکیں گے۔ امی شادی کے لیے کہیں گی تو انہیں ٹال دوں گا۔ میں امی کی زندگی تک اس شادی کو چھپا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ وہ زیادہ سے زیادہ دو ایک برس اور جی لیں گی۔ ان کی وفات کے بعد میری راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔ یہ تجویز بھی بری نہیں تھی مگر میں کراچی چھوڑ کر کسی اور شہر میں سکونت اختیار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کراچی شہر مجھے بہت پسند آیا تھا۔ یہ بڑا بارونق اور

بڑا شہر تھا۔ یہاں کی زندگی بڑی حسین اور رنگین تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے دو ایک دن سوچ بچار کے لیے دو۔ فیاض اس کے لیے تیار ہو گیا۔ رات دس بجے اس نے مجھے ہوٹل کے کمرے میں لے جا کر کہا کہ وہ ایک اور ضروری کام سے صبح سات بجے حیدرآباد شہر جا رہا ہے اور سہ پہر تک واپس آئے گا۔

میں دوسرے دن صبح دس بجے دھڑکتے دل کے ساتھ ہوٹل سے نکلی۔ ایک ٹیکسی لے کر حیدرآباد کالونی جا پہنچی۔ فیاض کے مکان پر اس کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو چند لمحوں کے بعد وہ دروازہ کھلا اور ایک حسین اور شاداب بدن کی عورت کا سراپا نمودار ہوا۔ وہ تیس برس کی دراز قد عورت تھی۔ گہرے بھورے رنگ کی سوتی شلوار قمیص میں ملبوس تھی۔ اس کے پیچھے سات آٹھ سال کی ایک لڑکی اور نو دس برس کی عمر کا ایک خوب صورت لڑکا بھی کھڑا تھا۔ اس عورت نے مجھے اوپر سے نیچے تک حیرت سے دیکھا۔ پھر اس نے شستہ لب و لہجے میں پوچھا۔ ”فرمایئے آپ کو کس سے ملنا ہے؟“

میں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ ”کیا فیاض احمد بیگ کا مکان ہے؟ وہ گھر پر ہیں؟“

”جی ہاں یہ مکان انہی کا ہے۔“ وہ زیر لب مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ بے حد پرکشش تھی۔ ”وہ گھر پر نہیں ہیں۔ رات دس گیارہ بجے تک آئیں گے۔“

”کیا میں اندر آسکتی ہوں؟“ میں نے اس کی حسین اور بڑی بڑی آنکھوں میں جوابی مسکراہٹ کے ساتھ جھانکا۔

”ضرور تشریف لائیں۔“ اس نے ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر جانے کا راستہ دیا۔

میں اندر داخل ہوئی تو اس نے دروازہ بند کر دیا پھر وہ اور دونوں بچے مجھے اپنے ساتھ نشست گاہ میں لے گئے۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ گئی تو وہ تینوں میرے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا فیاض صاحب کی والدہ تشریف رکھتی ہیں؟“

”فیاض صاحب کی والدہ؟“ وہ عورت چونکی پھر اس کے حسین چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ ”کیا آپ کو ان کے والدین کے بارے میں پتا نہیں ہے؟ ان کے انتقال کو چودہ برس ہو چکے ہیں۔ ان کا انتقال ہندوستان کے شہر حیدرآباد میں ہوا تھا۔ کہیں آپ کسی اور فیاض صاحب کے بارے میں تو نہیں پوچھ رہی ہیں؟“

”میں ان فیاض احمد بیگ کے بارے میں پوچھ رہی ہوں جو پچیس روز پہلے لندن سے آئے تھے۔“

”یہ گھر، انہی فیاض احمد بیگ کا ہے مگر ان کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔“

”اچھا تو ان کے بھائی بہن کہاں ہیں؟ وہ تو گھر میں ہوں گے؟“

”وہ سب امریکا میں ہیں یہاں کوئی نہیں ہے سوائے دور کے رشتے داروں کے۔“

”آپ کون ہیں؟“

”کون میں؟“ اس کے چہرے پر حیا امڈ کر رہ گئی۔ ”میں ان کی بیوی شاہدہ ہوں۔ یہ میرے دونوں بچے ہیں۔ نسیمہ اور عاصم۔“

”جی......؟“ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ مجھ پر جیسے بجلی سی آ گری۔ اس لیے میرا سر اس بری طرح چکرایا کہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا پھر میں کہیں میں ڈوبتی چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے ہوش آیا تو میں نے شاہدہ کو پریشان اور متفکر دیکھا۔ وہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ وہ پانی کے چھینٹے میرے چہرے پر مار کر مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے دونوں بچے اس کی پشت پر کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں سے خوف سا جھانک رہا تھا۔

شاہدہ نے مجھے ہوش میں دیکھا تو اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے پوچھا۔ ”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ کیا ہو گیا تھا؟“

”اب میں ٹھیک ہوں۔“ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”گرمی کی وجہ سے چکر آ گیا تھا۔ ہم لندن کے لوگ گرمی کے عادی نہیں ہیں۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔“

”آپ نے نہ تو اپنا تعارف کرایا اور نہ اپنے بارے میں کچھ بتایا؟“ وہ بولی۔ ”آپ تشریف رکھیں۔ چائے پی کر جائیں۔“

”میرا نام رابعہ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں لندن سے آئی ہوں۔ ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ میرے بارے میں مزید باتیں مسٹر فیاض آپ کو بتائیں گے۔“

پھر میں رکی نہیں اسے حیران اور پریشان چھوڑ کر مکان سے نکل پڑی۔ سارا راستہ میں نے اپنے آنسوؤں پر کس طرح قابو پایا، میرا دل ہی جانتا ہے وہ کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ ہر لمحے ایسے لگ رہا تھا کہ میرا

urdunovels.com

شی کر کے نکل آئے گا۔ میں بھی ایسی کرب ناک اذیت
سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔ سیٹ کی پشت سے لگی نڈھال سی
پڑی تھی میری حالت ایک مردے سے بھی بدتر تھی۔
واپس ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر میں بستر پر کسی کٹی پتنگ کی
طرح بکھر گئی۔ پھر میں تکیے میں منہ دے کر پھوٹ پھوٹ کر
رونے لگی۔ بہت دیر تک روتی رہی۔ اتنا روئی کہ تکیہ بھی
بھیگ گیا۔ دل کی بھڑاس تو نکل گئی لیکن میری دنیا میں جو
اندھیرا چھا گیا تھا وہ چھٹ نہ سکا۔ اب تو وہ دور بھی نکل ہو
چکا تھا۔ میرے خوابوں کے سارے محل اجڑ چکے تھے۔ فیاض
دغاباز نکلا تھا۔ اس نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ میرے ارمانوں کا
خون کر دیا تھا۔ میں نے خواب وخیال میں بھی سوچا نہیں تھا
کہ اس کے حسین چہرے کے پیچھے ایک گھناؤنا چہرہ چھپا ہو
گا۔ وہ اس قدر رذیل اور کمینہ شخص ثابت ہوگا۔

بہت سوچ بچار کے بعد مجھے ایک راستہ نظر آیا۔ وہ یہ
کہ فیاض اپنی بیوی کو دوسری شادی کے بارے میں نہیں
بتائے، وہ میرے ساتھ لندن چلے۔ ہم دونوں وہیں اپنی
زندگی گزار دیں گے۔ وہ دو ایک سال میں ایک مرتبہ اپنی
بیوی بچوں سے مل کر آجایا کرے۔ یہ سوچ کر میں نے کسی حد
تک اپنے دل کو راضی تو کر لیا تھا لیکن میرے سینے میں خلش
کا ایک خنجر پیوست ہو گیا تھا۔ مجھے کمرے میں وحشت اور
گھٹن کا سا احساس ہو رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو خالی برتن کی
طرح محسوس کر رہی تھی۔

فیاض شام کو آیا تو اس کے چہرے پر ندامت کے
بجائے غصہ چھایا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی تند لہجے میں
پوچھا۔ "تم میرے گھر گئی تھیں؟ تمہیں میرا گھر کیسے معلوم ہوا؟"

"ہاں۔ میں تمہارے گھر گئی تھی تاکہ تمہاری اصلیت
معلوم کرلوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے بڑے فریبی ہو۔
تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟" مجھے بھی غصہ آ گیا۔
"میں نے کل تمہارا تعاقب کر کے گھر دیکھ لیا تھا، اس لیے کہ
تمہاری حرکات وسکنات اور باتوں سے میرے دل میں
شکوک وشبہات پیدا ہونے لگے تھے۔"

"میں نے یہ سب کچھ اپنی بیوی بچوں کے مستقبل
کے لیے کیا ہے۔ ان کے لیے جھوٹ بولا ہے۔"
"ذلیل...... کمینے......" میں اپنے غصے پر قابو نہ
رکھ سکی۔ "آخر میں نے کیا قصور کیا تھا؟ تم نے میرے ساتھ
دھوکا کیوں کیا؟ کیا احسانوں کا بدلہ اسی طرح دیا جاتا ہے؟"

"میں نے تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا۔" وہ بے
غیرت بڑی ڈھٹائی سے بولا۔ "تمہیں ایک خوب صورت
اور وجیہ مرد کی ضرورت تھی جو تمہاری زندگی کی تنہائی ختم کرکے
سہارا دے سکے۔ میں نے تمہاری یہ آرزو پوری کر دی۔ تم
نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا ہے۔"

میرا جسم نفرت اور غصے سے کانپنے لگا۔ میں آپے سے
باہر ہو گئی۔ میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ میں کیا
کہہ رہی ہوں۔ میری زبان سے کیا الفاظ نکل رہے تھے۔
میرے اس آخری جملے نے اسے مشتعل کر دیا۔ اس
نے پاس آ کر میرے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ میرا
دماغ جھن جھنا گیا۔ سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ "اگر تم
نے گالیاں دیں تو گلا دبا دوں گا۔ کمینی...... ناخلف۔"

مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے نہ صرف میرے
وجود کو بہت بڑی گالی دی تھی بلکہ دنیا کی ان تمام شریف اور
نیک سیرت، باوفا شوہر پرست عورتوں کو گالی دی تھی جو محبت
کے نام پر مرنا اور مٹنا جانتی ہیں۔ میں نے لپک کر میز سے
پھل کاٹنے والی چھری اٹھالی۔ "اگر تم نے مجھے کوئی گالی دی تو
میں تمہارا خون کر دوں گی۔"

وہ میرے ہاتھ میں چھری دیکھ کر خوف زدہ نہیں ہوا
بلکہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "تم نے میرے
گھر جا کر اچھا نہیں کیا۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم
واپس لندن چلی جاؤ...... اب میں تمہیں یہاں نہیں رکھ سکتا۔"

"ٹھیک ہے میں واپس جا رہی ہوں۔" میں بھڑک
اٹھی۔ "تم میری رقم مجھے واپس کر دو۔ میں ساری زندگی
تمہاری شکل نہیں دیکھوں گی۔"
"رقم......؟" وہ استہزائی انداز سے ہنسا۔ "وہ رقم
میری ہے۔ البتہ میں تمہیں ایک ایسی چیز دے رہا ہوں جو
تمہیں مجھ سے سدا کے لیے آزاد کر دے گی۔ نجات دلا دے
گی۔ طلاق...... میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا
ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ اب شرعی طور پر تمہارا میرا رشتہ ختم ہو
گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے حرام ہو چکے ہیں۔"
وہ میرا جواب سننے کے لیے رکا نہیں کمرے سے نکل
گیا۔ میں اپنی جگہ سن ہو کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ میرے دل
کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے بند ہو گئی۔ مجھے طلاق اور
اسلام کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ میں صرف
اتنا جانتی تھی کہ تین مرتبہ طلاق دینے سے طلاق ہو جاتی ہے

لیکن اس کی کچھ شرائط ہیں۔ میرا دل نہیں مانتا تھا کہ اس طرح ہو سکتا ہے۔ ادھر ہوٹل کا بل چھ ہزار روپے ہو چکا تھا۔ فیاض نے میری چودہ سولہ لاکھ کی رقم ہڑپ لی تھی۔ ساری رات میں سوچتی رہی کہ کیا کروں۔ ایک تدبیر میری سمجھ میں آئی کہ کیوں نہ کسی وکیل سے مشورہ کروں۔ میں نے ہوٹل کے ایک بیرے کو ٹپ دے کر اس کے ذریعے ایک خاتون وکیل کا پتا معلوم کرایا۔ میں نے عدالت کے ذریعے دادرسی کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ میرے پاس نقد رقم صرف پانچ سو روپے تھی۔ فیاض سے ایک کوڑی بھی ملنے کی اُمید نہیں تھی۔ مجھے اپنے سونے کا لاکٹ تاپس اور کنگن کا خیال آیا۔ میں نے اسے فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسرے دن صبح میں نے اپنے سارے زیورات لے جا کر ایک جیولری کی دکان پر بیچ دیے۔ ان سے مجھے پچیس ہزار روپے ملے۔ میں نے چھ ہزار روپے سے تو ہوٹل کے بل کی ادائیگی کر دی۔ اب انیس ہزار کی رقم میرے پاس تھی۔ میں نے ڈبل بیڈ کا کمرا چھوڑ کر سنگل بیڈ کا کرا لے لیا۔ اس لیے کہ اب ڈبل بیڈ کی ضرورت نہ تھی۔

میں جا کر اس خاتون وکیل سے ملی اور دو ہزار روپے مشورے کی فیس طے کر کے اسے ساری کہانی سنائی۔ وہ میری دکھ بھری داستان سے بے حد متاثر ہوئی۔ عورت ہونے کے ناتے اس نے گہری ہمدردی کا اظہار کیا۔ پھر کہنے لگی۔ ”شرعی اعتبار سے تمہیں طلاق ہو چکی ہے لیکن قانوناً تمہارے شوہر کے لیے دوسری شادی کے لیے اپنی پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری تھا۔ اس کے لیے اس کی پہلی بیوی سے رابطہ کرنا ہوگا۔“

”میرے خیال میں اس کی بیوی کو اس شادی کا علم نہیں ہے۔“ میں نے اس کی قطع کلامی کی۔ ”یہ مجھے اس کی باتوں اور اس کے رویے سے اندازہ ہوا۔ اس صورت میں وہ بے قصور ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اسے اپنے شوہر کے کرتوت سے صدمہ پہنچے۔ آخر وہ دو بچوں کی ماں ہے۔“

”پھر تو تمہیں طلاق یافتہ ہونے پر صبر کرنا ہوگا۔“ خاتون وکیل نے کہا۔ ”البتہ اس شخص کو دی ہوئی رقم حاصل کرنے کے لیے کوشش کر سکتی ہو۔ وہ اس طرح کہ بینک ڈرافٹ واحد ثبوت ہے جو تم نے اسے دیا تھا لیکن اس سلسلے میں کارروائی لمبی ہو جائے گی۔ تمہیں لندن سے شواہد منگوانے ہوں گے کہ تم نے اپنا فلیٹ فروخت کر دیا تھا۔ تمہارا بینک بیلنس تھا۔ تم نے کس کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا اور کس نے نکاح پڑھایا تھا؟ ان باتوں سے عدالت میں یہ ثابت کیا جائے گا کہ تمہارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے۔ ایسا کرو، تین روز بعد آنا۔ یہ تین دن اسی طرح صبر کر کے گزار لو...... اور ہاں، یہ پانچ سو روپے لے جاؤ۔“

”یہ کیوں؟ یہ تو آپ کے مشورے کی فیس ہے۔“ میں نے حیرانی سے کہا۔

”ٹھیک ہے، وکالت میرا پروفیشن ہے لیکن میری ذہنیت کاروباری نہیں ہے۔ ایک تو تم مظلوم ہو اور دوسرے تم نے اپنا مذہب چھوڑ کر ہمارا دین اختیار کیا ہے۔ اس کی وجہ خواہ کچھ ہو، تم نے ایک شخص کی خاطر اسلام قبول کیا پھر بھی تم ہمارے دین میں داخل ہوئی ہو تو میری دینی بہن ہو گئی ہو۔ میرا اخلاقی فرض بنتا ہے کہ تمہارے کام آؤں۔ شاید اللہ تعالیٰ مجھے اس کا صلہ دے۔“

اس کی بات نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ میں نے سوچا کہ مسلمانوں میں اگر فیاض جیسے شیطان صفت ہیں تو نیک لوگ بھی ہیں۔ ہمارے ہندوؤں میں ایسا کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اس نیک دل خاتون کے ہاتھ چوم لوں۔ میں نے کچھ ہچکچاہٹ سے اس سے روپے لیے اور پرس میں ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ تین دن میں نے جس بے چینی اور اضطراب میں گزارے وہ میں جانتی ہوں۔ دن بھر اپنے کمرے میں بند رہتی، روتی یا سو رہتی۔ ناشتا کھانا بھی وہیں منگواتی۔ ایک ایک پل کاٹنا دشوار ہو رہا تھا۔ میں خدا کا شکر بھی ادا کرتی کہ فیاض نہیں آ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے اس کی شکل دیکھ کر میں مشتعل ہو جاتی یا پھر دل پر آرے چلنے لگتے۔ چوتھے روز میں دس بجے کے قریب خاتون وکیل کے آفس پہنچ گئی۔

”تمہارے لیے خوش خبری ہے۔“ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا اور بڑی محبت سے پاس بٹھایا۔ ”میں نے اپنے والد اور بڑے بھائی کو تمہاری ٹریجڈی بتائی۔ ان دونوں کو بہت افسوس ہوا۔ میرے والد ریٹائرڈ جج ہیں۔ بھائی آرمی میں میجر ہیں۔ ان دونوں کے خاص خاص لوگوں سے مراسم ہیں۔ ان میں پولیس اور ایف آئی اے کے کچھ افسران بھی ہیں۔ والد اور بھائی دونوں کا خیال تھا کہ فیاض پر دباؤ ڈلوا کر اس سے رقم وصول کی جائے۔ اس کی بیوی کو اس کی حرکتوں میں ملوث نہ کیا جائے۔ یہی تم چاہتی ہو۔ اب تم ایک کام کرو کہ فیاض کے گھر کا پتا بتا دو۔ وہ اس طرح کہ ابھی ایف آئی

urdunovels.com

ے کا ایک آدمی آئے گا۔ تم اس کے ساتھ جا کر فیاض کا گھر دکھا دو بس تمہارا کام ختم آگے ہم جانیں۔"

اس نے میرے لیے چائے منگوائی۔ ہم نے چائے ختم ہی کی تھی کہ پونشرٹ پتلون میں ملبوس ایک درمیانہ عمر کا آدمی آیا اور خاتون وکیل نے مجھے اس کے ساتھ جانے کو کہا۔ دفتر سے نکل کر اس شخص نے ٹیکسی رکوائی اور ہم روانہ ہوئے۔ خدا کا شکر تھا کہ مجھے راستہ یاد تھا اور فیاض کا گھر بھی۔ ہم اس کے سامنے سے گزرے اور میرے ہمراہی نے وہ مکان دیکھ لیا۔ ہم واپس ہوٹل آئے۔ ٹیکسی سے اتر کر میں نے کرایہ دینا چاہا لیکن اس شخص نے دینے نہیں دیا اور اسی ٹیکسی میں چلا گیا۔

اسی شام کو سات بجے کے قریب میں کمرے میں تھی کہ بیرے نے آ کر بتایا آپ کا فون ہے۔ میں بھاگم بھاگ اس کے ساتھ ہوٹل کے دفتر میں گئی تو خاتون وکیل کا فون تھا۔ اس نے مجھے اگلے روز صبح دس بجے اپنے دفتر میں آنے کو کہا۔ وہ رات پھر میں نے جاگ کر اضطراب میں گزاری۔ دل میں ہزاروں وسوسے، ہزاروں اندیشے تھے۔

دوسرے دن میں خاتون وکیل کے دفتر گئی تو اس نے مجھے بٹھا کر ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ سور ما تو بہت بزدل نکلا۔ دو چار دھمکیوں سے ہی ہاتھ جوڑ دیے۔ خوشامد کرنے لگا کہ اس کی بیوی کو ان ساری باتوں کا علم نہ ہو۔ وہ کوئی مناسب کاروبار سوچ رہا تھا۔ اچھا ہوا کہ اس پر بروقت چھاپا مارا گیا اور وہ پوری رقم خرچ نہ کر سکا۔ بہر حال اس نے چودہ لاکھ ستر ہزار روپے کا چیک دے دیا ہے۔ باقی رقم وہ خرچ کر چکا تھا۔ یہ رہا چیک ......" اس نے میز کی دراز سے چیک نکال کر میرے سامنے رکھا۔

"یہ...... جعلی تو نہیں ہے۔ ممکن ہے اس نے جان بچانے کے لیے کوئی فراڈ کھیلا ہو۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"اس کا بندوبست کر لیا گیا ہے۔" خاتون وکیل مسکرائی۔ "جانتی ہو، اس وقت تک مہمان بنا کر ایک جگہ رکھا گیا ہے جب تک رقم تمہارے اکاؤنٹ میں جمع نہیں ہو جاتی (رقم بینک جا کر کیش نہیں نے لیتیں۔ اس کا واسطہ ریٹائرڈ جج، بیگم اور ایف آئی اے کے افسروں سے پڑا ہے۔ وہ تو بھیگی بلی بن گیا ہے۔"

"میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ واپس لندن چلی جاؤں گی۔" میں نے افسردگی سے اسے کہا۔ "یہ رقم کیسے لے جا سکوں گی؟"

"سب کچھ ہو جائے گا۔ تمہارا فارن اکاؤنٹ کھلوا کر اس میں چیک جمع کرا دیا جائے گا۔ لندن میں وہ تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو جائے گا۔ تمہارے پاس جانے کا کرایہ ہے یا نہیں؟" خاتون وکیل نے گہری ہمدردی سے کہا۔

میں نے بتایا کہ میرے پاس کل کتنی نقد رقم ہے۔ وہ بولی کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے پاس تو بہت کیش ہے۔ ہاں ایئر کرایہ ادا کر کے بھی بہت کچھ بچا رہے گا۔ میں تمہاری سیٹ بک کرا دوں گی لیکن...... تمہارے پاس یہاں آنے کا ٹکٹ ہے؟

"فیاض نے بنوایا تو تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

"اگر تمہاری شخصیتی دیں کی ہے تو کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔ معلوم نہیں فیاض نے ریٹرن ٹکٹ لیا تھا یا کچھ اور کیا تھا۔ بہر حال تم فکر نہ کرو۔ کچھ نہ کچھ کر کے تمہیں واپس بھیجا دیا جائے گا۔" اس نے مجھے تسلی دی۔

میں ان تفصیلات میں جانا نہیں چاہتی کہ کس طرح واپس لندن پہنچی۔ میری پونجی میرے پاس تھی۔ دو روز ہوٹل میں ٹھہر کر میں نے کرائے کا فلیٹ لیا پھر اپنے سابق دفتر جا کر مسٹر برنارڈ سے ملی اور انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا۔ انہوں نے مجھے اسی عہدے پر دوبارہ رکھ لیا لیکن مس راجہ کے نام سے۔ یہی میرا نام ہے اور مرتے دم تک رہے گا۔ میں ایک بدکردار مسلمان کی وجہ سے اسلام کو نہیں چھوڑ سکتی۔ اس مذہب کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں جس میں خاتون وکیل، اس کے والد محترم، بھائی اور ان کے انسان دوست احباب ہیں۔

البتہ میں نے ساری عمر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مجھے کسی مرد پر اعتبار نہیں رہا ہے۔ میں نے وصیت نامہ لکھ رکھا ہے کہ جب میں مر جاؤں گی تو میرا سرمایہ لندن میں قائم ایک اسلامی مرکز کو دے دیا جائے۔ میں نے نماز سیکھ لی ہے اور ایک مسلمان بزرگ سے مقدس قرآن پڑھنا بھی سیکھ رہی ہوں۔ فارغ وقت میں اس اسلامی مرکز میں بھی چلی جاتی ہوں اور بساط بھر کوئی نہ کوئی کام کرتی ہوں۔ میں اس پاکستانی خاتون وکیل، اس کے عزیز و اقارب اور فیاض کے بیوی بچوں کے لیے بھی دعا مانگتی ہوں، اپنے لیے میری یہ دعا ہوتی ہے کہ اللہ مجھے سکون کی موت دے۔

✦✦

دلدل

محترم مدیر
السلام علیکم!
زیرِ نظر سچ بیانی قیام پاکستان سے قبل کی ہے۔ قاری کی دلچسپی قائم رہے اس وجہ سے پوری داستان کو اس دور کے ماحول میں لکھا ہے۔ اُمید ہے قارئین کو پسند آئے گی۔

سیدہ شاہدہ شاہ
(جہلم)

کائنات کی ہر شے خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان۔ اسے اپنے وجود کی بقا کے لیے کسی نہ کسی حوالے سے ایک قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ میں نے بھی اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے ایک بہت بھاری قیمت ادا کی ہے۔ تب جا کر خوابوں کی تعبیر پائی ہے۔ میری تمام تشنہ خواہشات کی تکمیل تو ہوگئی ہے مگر میں اس بھری پری دنیا میں بالکل تن تنہا رہ گیا ہوں۔ ایک وسیع و عریض کوٹھی میں، ملازمین کی بھیڑ میں، میں کسی بدروح کی مانند بھٹکتا پھرتا رہتا ہوں۔ میں اپنی روح کی ویرانی، اپنے دل کی تنہائیاں دور کرنے کے لیے لوگوں کے ہجوم میں اپنے آپ کو گم کر دینا چاہتا ہوں مگر مجھے کسی پل

سکون، کسی گھڑی چین نہیں آتا۔ ایک نامعلوم سا اضطراب، ایک بے نام سی بے قراری مجھے ہمیشہ بے چین و بے کل کیے رکھتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ میں جو بظاہر ایک ارب پتی ہوں۔ ان گنت رشتوں کے مضبوط بندھن میں بندھا ہوا ہوں۔ لوگ جو مجھ سے ہاتھ ملانا فخر سمجھتے ہیں، انہیں بھی احساس ہے کہ میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے دیوانہ وار ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ایک روز میں بھی چپ چاپ گمنامی کی موت مر جاؤں گا اور میرے اپنوں سمیت کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہوگی۔ میری تجہیز و تکفین بھی کوئی فلاحی ادارہ ہی کرے گا۔

میرے جنازے کو کندھا دینے والا میرے اپنوں میں سے کوئی بھی نہیں ہوگا بس کسی فلاحی تنظیم کے چند ایک لوگ ہی ہوں گے جو مجھے آخری غسل دینے، کفن پہنانے، نماز جنازہ اور تدفین کے بعد چلے جائیں گے اور میں کسی کچی قبر میں لاوارثوں کی طرح دفن کردیا جاؤں گا۔ جہاں چند ماہ بعد میری قبر کا نشان بھی مٹ جائے گا۔ میرے اپنوں سمیت کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہوگی کہ اس جگہ کبھی کوئی ایسا شخص بھی دفن تھا جس کے دو روپ تھے۔ ایک روپ میں وہ ان گنت لوگوں کا "ان داتا" تھا۔ کئی فلاحی تنظیموں کو ہر ماہ ایک خطیر رقم عطیہ کرنے والا حاتم طائی تھا۔ بیواؤں، یتیموں، لاوارثوں کا والی وارث تھا۔ ان کے گھروں کے چولہے اس کے ہر ماہ بھیجے گئے راشن سے روشن تھے۔ دوسرے روپ سے صرف اور صرف ایسے لوگ شناسا تھے جو اس کے رازداں ساتھی تھے۔ اس کا یہ روپ اتنا گھناؤنا اور کریہہ تھا کہ شیطان بھی اس سے پناہ مانگے۔

میں سدا کا امیر نہیں تھا اور نہ ہی منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا تھا بلکہ ایک غریب خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ خود میرے والد ایک دیہاڑی دار مزدور تھے۔ جو دن بھر اپنا خون پسینا ایک کرکے شام کو جب تھکے ہارے گھر کو لوٹتے تو ان کی جیب میں صرف اتنے ہی پیسے ہوتے جس سے ہمارا کثیر العیال کنبہ بمشکل روکھی سوکھی کھا کر اچھی طرح پیٹ بھی نہیں بھر سکتا تھا۔ میری صابر و شاکر ماں نے اپنے مجازی خدا کے شانوں سے معاشی بوجھ کم کرنے کے لیے لوگوں کے گھروں میں بطور ماسی کام کرنا شروع کردیا۔ ہم چار بھائی اور تین بہنیں تھیں جو مناسب خوراک نہ ملنے کے باوجود روکھی سوکھی کھا کر کسی خودرو پودے کی طرح قد کاٹھ نکال رہے تھے۔

ہم بہن بھائی جیسے جیسے ہوش سنبھالتے گئے۔ توں توں والدین نے ہمیں معاشی بوجھ میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے ہمیں محنت مزدوری پر لگا دیا۔ انہوں نے ہمیں تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی اس لیے کہ تعلیم کا حصول تو ان لوگوں کے چاؤ چونچلے اور عیاشیاں ہوتی ہیں جو مالی طور پر آسودہ اور خوشحال ہوں۔ جہاں روٹی کے دو نوالوں کا حصول بھی ممکن نہ ہو۔ وہاں تعلیم کی طرف رجحان نہیں ہوتا بلکہ بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ ویسے بھی ہم جس کچی پکی بستی میں تھے وہ غریبوں کی بستی کہلاتی تھی۔ اس بستی کے سارے مکین میرے والد اور والدہ کی طرح محنت کش تھے۔ جو علی الصباح ناشتے کے نام پر رات کی باسی روٹی چائے کے ساتھ کھا کر محنت مزدوری کے لیے گھروں سے نکلتے تو شام ڈھلے گھروں کو لوٹتے۔ ان کے بچے سارا دن بستی کی کچی پکی گلیوں میں کھیلتے، گالیاں بکتے اور لڑتے جھگڑتے رہتے۔ ان میں زیادہ تر وہی بچے ہوتے تھے جو اتنے چھوٹے ہوتے تھے کہ محنت مزدوری کے قابل نہیں تھے۔ جونہی وہ محنت مزدوری کے قابل ہوتے۔ انہیں ان کے والدین اپنے ساتھ لے جاتے اور کسی ہوٹل، موٹر مکینک یا دیگر جگہوں پر لگا دیتے تاکہ چار پیسے گھر آنا شروع ہو جائیں۔ میں اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ میرے بعد تین بہنیں تھیں۔ بھائی جونہی مزدوری کرنے کے قابل ہوئے تو میرے والد صاحب نے ایک بھائی کو ہوٹل پر برتن دھونے کے لیے لگوا دیا، جبکہ باقی دونوں بھائیوں کو موٹر مکینک اور درزی کے پاس کام سیکھنے کے لیے رکھوا دیا تاکہ وہ کام کاج سیکھ کر اپنی زندگی کو آسان بنا سکیں۔ میں جب ذرا بڑا ہوا تو والد صاحب نے مجھے ایک ہیئر کٹنگ سیلون پر کام سیکھنے کے لیے بھیج دیا۔

میرے تینوں بھائیوں نے تو پوری دلچسپی سے کام سیکھنا شروع کردیا مگر میرا ہیئر کٹنگ کے کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ میں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے گھر کے علاوہ اپنی بستی میں غربت ہی غربت دیکھی تھی، روٹی کے ایک ایک نوالے کے حصول کے لیے انہیں محنت کی چکی میں صبح سے شام تک پستے دیکھا تھا۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں ہی میرے ذہن میں نجانے یہ خیال کیسے آ گیا تھا کہ آج کے دور میں دولت ہی دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے، جس سے انسان دنیا کی ہر چیز خرید سکتا ہے۔ رشتے، ناتے، عزت، پیار اور محبت وغیرہ سب ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ مال و دولت پاس ہو تو دور پار کے رشتہ دار اور غیر لوگ بھی رشتے داریاں جتانا شروع کر

سمجھتے ہیں اور اگر انسان مفلس و قلاش ہو تو اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جایا کرتا ہے چنانچہ میں نے دل ہی دل میں یہ پختہ عہد کرلیا کہ مجھے زندگی میں جب بھی دولت کمانے کا موقع ملا میں اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاؤں گا۔ خواہ دولت کے حصول کے لیے مجھے ناجائز ذرائع ہی کیوں نہ اپنانے پڑیں۔ اپنے دل میں یہ عزم صمیم لیے میں ہیمر کٹنگ سیلون پر بال کاٹنے کا کام سیکھتا رہا۔

مجھے اس سیلون پر کام سیکھتے ہوئے سات سال سے زائد کا عرصہ بیت گیا تھا۔ میری عمر اٹھارہ سال ہو چکی تھی۔ اب میں ایک ماہر کاریگر بن چکا تھا۔ سیلون کا مالک عبدالرزاق تھا۔ اس نے میرے ہاتھ کی صفائی اور مہارت دیکھ کر مجھے اپنے خصوصی گاہوں کے لیے مختص کر رکھا تھا جو اس کے سیلون کے مخصوص گاہک تھے۔ ان مخصوص گاہکوں میں سول و انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیداران کے علاوہ شہر کے چیدہ چیدہ نامی گرامی لوگ تھے۔ سول اور انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیداران ایسی عمومی جگہوں پر بال کٹوانے کے لیے نہیں جایا کرتے بلکہ اداروں کے اندر ہی سرکاری قسم کے سیلون خدمت گار ہوتے ہیں جو ان کی رہائش گاہ پر ہی ان کی ہر قسم کی خدمات سرانجام دیا کرتے ہیں۔ مگر جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ میرے ہاتھ میں ایسی مہارت اور ہنر تھا کہ جب بھی ان کو ضرورت پڑتی تو استاد عبدالرزاق مجھے ہی وہاں بھیجا کرتا تھا۔

شروع شروع میں جب میں کام سیکھ چکا تھا تو استاد عبدالرزاق نے مجھے بڑی فراخدلی سے اجازت دے دی تھی کہ میں چاہوں تو اپنی ذاتی دکان کھول کر آزادانہ طور پر کام کرسکتا ہوں مگر میں نے دو وجوہات کی بنا پر استاد کی معیت میں ہی کام کرنے کو ترجیح دی۔ ایک تو یہ کہ استاد کا سیلون شہر کی بہترین لوکیشن پر تھا جہاں ہر وقت گاہکوں کی بھیڑ رہتی تھی اور گاہک بھی ایسے جو استاد کے اس سیلون پر لگے ہوئے اس کے منہ مانگے ریٹ پر بال کٹوانے، شیو کرانے، موسم کے مطابق ٹھنڈے اور گرم پانی سے غسل کرنے کے ساتھ ساتھ میک اپ، ہیڈ مساج وغیرہ کی تمام سہولیات سے مستفید ہوتے تھے۔ دوسرے اگر میں استاد سے علیحدہ ہو کر آزادانہ طور پر کام کرتا تو اولاً مجھے ایسی لوکیشن پر کوئی دکان ہی نہ ملتی اور اگر مل بھی جاتی تو استاد کے سیلون جیسی سہولیات، وہاں کام کرنے والے ماہر کاریگروں کی دستیابی مشکل تھی۔ علاوہ ازیں وہاں سیلون میں گاہکوں کی ڈیمانڈ کے مطابق بال کاٹنے اور دیگر خدمات کے لیے بہترین اوزار ہی میسر نہیں تھے اسی لیے میں نے استاد کے ساتھ ہی رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ علاوہ ازیں استاد کے ساتھ جڑے رہنے میں ایک اور بھی وجہ تھی کہ وہ یہ کہ استاد کے مستقل گاہکوں میں ایسے ایسے لوگ بھی موجود تھے جو میرے دولت کے حصول کے خوابوں کی تعبیر میں ہر طریقے سے ممد و معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ نجانے مجھے کیوں یہ یقین ہو چلا تھا کہ مجھے میرے سنہرے خوابوں کی تعبیر استاد کے سیلون سے ملے گی۔

استاد کے مستقل گاہکوں میں ایک ایسا گاہک بھی تھا جس کا نام تنویر احمد تھا۔ جو شہر کی مشہور و معروف سیاسی و سماجی شخصیت تھا۔ اس کا ڈرائیور حاجی احمد اکثر سیلون پر بال کٹوانے آیا کرتا تھا۔ وہ جب بھی سیلون پر آتا تو اپنے مالک تنویر احمد کی چم چم کرتی سیاہ رنگ کی ایک قیمتی گاڑی میں آتا۔ بال کٹوانے کے بعد وہ استاد کے مقرر کردہ مہنگے نرخوں کے مطابق ادائیگی تو کرتا ہی تھا ساتھ ہی ساتھ وہ ٹپ کے نام پر بال کاٹنے والے کو اچھی خاصی رقم بھی دے جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ سیلون میں آتا تو ہر کاریگر کی یہی کوشش ہوتی کہ وہ اس سے بال کٹوائے۔ شروع شروع میں تو وہ کبھی کسی کاریگر سے اور کبھی کسی کاریگر سے بال کٹواتا مگر پھر نجانے اسے مجھ میں کیا نظر آیا کہ وہ میرا مستقل گاہک بن گیا۔ وہ جب بھی آتا تو استاد سے کہہ کر مجھے اپنے لیے مختص کرلیتا۔ اگر میں کسی اور گاہک کے ساتھ مصروف ہوتا یا استاد کے حکم کے مطابق کہیں اور بال کاٹنے گیا ہوتا تو وہ دونوں صورتوں میں میرا انتظار کرلیتا۔ خواہ اسے میرا طویل انتظار ہی کیوں نہ کرنا پڑتا۔ میں اکثر نوٹ کرتا کہ جب میں اس کے بال کاٹ رہا ہوتا تو وہ سامنے لگے ہوئے قد آدم شیشے میں مجھے گہری نظروں سے اور کھوجتی نظروں سے جائزہ لے رہا ہوتا۔ جیسے وہ مجھے کھوج رہا ہو۔ میں نے شروع شروع میں اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی مگر کچھ دنوں کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ شاید مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے مگر بچے تذبذب کا شکار ہے کہ وہ مجھ سے بات کرے یا نہ کرے آخر ایک روز جب میں اس کے بال کاٹ رہا تھا۔ سیلون میں استاد سمیت تمام ورکرز اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے تو حاجی احمد نے انتہائی دھیمی آواز میں مجھ سے کہا۔ ”وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے مگر یہاں نہیں۔“ میں نے بھی اسی کی طرح دھیمی آواز میں جواب دیا کہ ”ٹھیک ہے آپ

"یہاں کہیں میں فارغ ہو کر وہیں آ جاؤں گا۔"

اس نے مجھے پتا سمجھاتے ہوئے اگلے روز کام سے فارغ ہو کر آنے کے لیے کہا تو میں نے ہامی بھر لی۔ سیلون پر ہمارے کام کے اوقات صبح نو بجے سے رات گیارہ بجے تک ہوتے تھے۔ یہاں دو شفٹوں میں کام ہوتا تھا۔ پہلی شفٹ صبح نو بجے سے لے کر سہ پہر چار بجے تک ہوتی تھی۔ جبکہ دوسری شفٹ چار بجے سے لے کر رات گیارہ بجے تک ہوتی تھی۔ میں پہلی شفٹ میں کام کرتا تھا اس لیے چار بجے فارغ ہو جایا کرتا تھا۔ اگلے روز میں کام سے فارغ ہو کر حاجی احمد کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گیا۔ یہ شہر کا ایک پوش علاقہ تھا جہاں قطار در قطار ایک ترتیب کے ساتھ محل نما کوٹھیاں یہاں کے مکینوں کی امارت کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ حاجی احمد نے مجھے بڑی تفصیل سے یہاں اس کوٹھی کا پتا بتایا تھا جہاں وہ اپنے مالک تنویر احمد کے ہاں سرونٹ کوارٹر میں مقیم تھا۔ میں نے موجودہ کوٹھی پر پہنچ کر گیٹ پر کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ فوراً ہی ایک باوردی مسلح سیکیورٹی گارڈ نے بڑے گیٹ کی کھڑکی سے جھانک کر میری طرف استفسارانہ انداز میں دیکھا۔ میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے اسے بتایا کہ مجھے حاجی احمد صاحب نے بلایا ہے تو اس نے مجھے انتظار کرنے کا کہہ کر کھڑکی بند کر دی اور اندر چلا گیا۔ غالباً حاجی احمد کو اطلاع کرنے گیا ہوگا کیونکہ تھوڑی ہی دیر کے بعد حاجی احمد خود گیٹ پر آیا اور مجھ سے پرتپاک معانقہ کرتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے گیا۔ اپنے سرونٹ کوارٹر میں مجھے بٹھا کر وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر گیا اور پھر آ کر مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے مجھ سے کرید کرید کر سوالات کرنے شروع کر دیے کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ والد کیا کام کرتے ہیں۔ ہم کتنے بہن بھائی ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اسے تفصیل سے اپنے متعلق بالکل سچ سچ بتلا دیا۔ میں نے دیکھا کہ جب میں نے اسے بتایا کہ ہم پرانے ریلوے پل کے پلو میں ایک کچی بستی میں رہتے ہیں۔ میرے والد ایک دیہاڑی دار مزدور ہیں۔ ماں لوگوں کے گھروں میں بطور ماسی کام کرتی ہیں اور دیگر بھائی بھی مختلف کام سیکھ رہے ہیں تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی۔ ایسی چمک جو کسی شکاری کی آنکھوں میں اس وقت آتی ہے جب وہ اپنے شکار کو اپنے بچھائے ہوئے جال کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھتا ہے۔ پیشتر اس کے کہ وہ مزید کچھ کہتا اتنی دیر میں ایک ملازم ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا جس پر چائے اور ناشتے کے لوازمات رکھے ہوئے تھے۔ حاجی احمد نے اس کے ہاتھ سے ٹرے لے کر قریبی میز پر رکھی اور اسے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے بولا۔

"آؤ یار پہلے چائے اور کھانے پینے کی ان اشیاء سے انصاف کرتے ہیں پھر باتیں کریں گے۔"

تھوڑی دیر پہلے وہ غالباً اسی لیے مجھے بٹھا کر باہر گیا تھا تاکہ ملازم سے میرے لیے چائے بنوا سکے۔ چائے پینے کے دوران وہ مجھ سے مزید کرید کرید کر سوالات کرتا رہا۔ جیسے وہ ہر لحاظ سے میرے متعلق مکمل اطمینان کر لینا چاہتا ہو۔ جب ہم چائے پی چکے تو اس نے خالی برتن ایک طرف سرکائے اور ٹیبل پر دونوں کہنیاں جما کر وہ آگے جھک آیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"جمیل میاں! کیا تم اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن ہو؟ میرا مطلب ہے کہ کیا تم اس ہیئر کٹنگ والے کام سے خوش ہو؟"

اس کے لہجے میں یقیناً کوئی ایسی بات تھی کہ میں نے اس کے سامنے پوری سچائی سے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ میں نے اسے صاف بتلا دیا کہ میں ایک ایسے غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں جہاں دو وقت کی روٹی کے لیے صبح سے شام تک ہمارے گھرانے کا ہر فرد کولہو کے بیل کی طرح مصروف رہتے ہوئے بھی بمشکل روکھی سوکھی کھا سکتا ہے۔ جانوروں کی طرح ہمیں بھی پیٹ بھرنے سے ہی غرض ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں حلال حرام کی کوئی تمیز نہیں ہوتی اس لیے ہر جائز و ناجائز طریقے سے ہم روزی روٹی کمانے کے چکر میں گھن چکر بنے رہتے ہیں۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ میرے خواب کیا ہیں اور میں دولت کمانے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار ہوں۔

میں نے دیکھا کہ میری باتیں سن کر اس کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے میرے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔

"جمیل سمجھ لو کہ تمہارے ہاتھ الہ دین کا چراغ لگ گیا ہے۔ اگر تم میرے کہنے پر چلتے رہے اور میری باتوں پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتے رہے تو بہت جلد دولت میں کھیلنے لگو گے۔"

دولت کا حصول تو میرے بچپن کا وہ خواب تھا جو ہمیشہ میری پلکوں پر سجا رہتا تھا بلکہ گزرتے ہوئے وقت اور عمر کی

سیڑھیاں طے کرتے کرتے اب پہلے سے بھی زیادہ جزئیات کے ساتھ ہر وقت میری آنکھوں میں سمایا رہتا تھا۔ چنانچہ میں نے حاجی احمد کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھامتے ہوئے اسے اپنے تعاون کا بھرپور یقین دلایا۔ کچھ دیر مزید باتیں کرنے کے بعد حاجی احمد نے مجھے ایک سربمہر پیکٹ تھماتے ہوئے کہا کہ اس پیکٹ کو بغیر کھولے فلاں پتے پر فلاں شخص کو پہنچانا ہے۔ وہ آدمی اسی طرح کا ایک بند لفافہ تمہیں دے گا جسے بغیر کھولے تمہیں واپس مجھ تک پہنچانا ہے اور ہاں راستے میں اگر کوئی تم سے ان لفافوں کے متعلق پوچھے کہ یہ لفافے تمہیں کس نے دیے ہیں اور کس کو پہنچانے ہیں تو تم نے کسی صورت میں بھی ہمارے متعلق کسی کو بھی نہیں بتانا۔ تمہیں اس کام کو راز داری سے سرانجام دینے پر تمہارا انعام تمہیں پہنچا دیا جائے گا۔ اتنا کہہ کر اس نے مجھے ایک پیکٹ تھما دیا۔ جب میں کوٹھی سے باہر نکل رہا تھا تو حاجی احمد نے ایک بار پھر مجھے تاکید کی کہ پیکٹوں کے اس لین دین کا ذکر کسی سے بھی نہیں کرنا کیونکہ اس کام میں راز داری کی بہت اہمیت ہے۔ میں سر ہلا کر باہر نکل آیا۔ اتنا تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ کوئی ناجائز اور غیر قانونی کام ہے۔ جبھی اتنی راز داری برتی جا رہی ہے۔ مگر ان پیکٹوں میں کیا ہے اس کے متعلق مجھے تجسس ہونے لگا۔ جی چاہا کہ میں ان کو کھول کر دیکھ لوں مگر میں نے بڑی مشکل سے اپنے اس تجسس اور خواہش پر قابو پایا اور وہ سربمہر لفافہ مطلوبہ پتے پر پہنچا دیا۔ جواباً اس نے جو پیکٹ مجھے دیا وہ بھی میں نے واپس حاجی احمد کو پہنچا دیا۔ حاجی احمد نے پیکٹ لے کر شاباشی کے انداز میں میری پیٹھ ٹھونکی اور کہا کہ کل میرا انعام مجھے سیلون میں پہنچا دیا جائے گا۔ اس کے بعد میں واپس چلا آیا۔

اگلے روز میں سیلون پر ہی تھا۔ جب حاجی احمد حسب معمول گاڑی پر آیا۔ وہ بظاہر داڑھی سیٹ کروانے آیا تھا مگر در حقیقت وہ مجھے میرا انعام دینے آیا تھا۔ اپنی باری پر جب وہ کرسی پر بیٹھا اور میں اس کی داڑھی سیٹ کرنے لگا تو اس نے سب کی نظر بچا کر ایک لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے سرگوشی میں بولا کہ میں یہ لفافہ جیب میں ڈال لوں اور گھر جا کر کھولوں میں نے اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے بڑی صفائی سے وہ لفافہ جیب میں ڈال لیا اور اس کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ چھٹی کرنے کے بعد جب میں نے گھر آ کر تنہائی میں لفافہ کھولا تو میری آنکھیں وفور مسرت سے چمک اٹھیں۔ لفافے میں پانچ ہزار روپے کی مالیت کے دو نوٹ تھے۔ گویا میں ایک معمولی سے کام کے عوض دس ہزار روپے کا مالک بن گیا تھا۔ میرے لیے دس ہزار روپے ایک بڑی رقم تھی۔ اتنی بڑی رقم تو میں نے اس وقت سے پہلے کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ میرا انگ انگ خوشی سے ناچ رہا تھا مگر مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں اتنی بڑی رقم کو کہاں اور کیسے چھپاؤں کیونکہ اگر میرے والدین کو پتا چل جاتا تو وہ مجھ سے پوچھ گچھ کرتے کہ اتنی بڑی رقم میرے پاس کہاں سے آئی۔ لامحالہ مجھے سب کچھ ہی بتانا پڑتا کہ یہ رقم مجھے حاجی احمد کا پیکٹ پہنچانے کے سلسلے میں بطور انعام ملی ہے۔ جبکہ حاجی احمد نے مجھے سختی سے منع کیا ہوا تھا کہ ان پیکٹوں کے بارے میں کسی کو بھی نہیں بتانا۔ سوچ سوچ کر میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی وہ یہ کہ میں نے اپنے گھر کے صحن کے ایک کونے میں ایک گڑھا کھودا اور دس ہزار روپے ایک چھوٹے سے ٹین کے ڈبے میں بند کر کے یہ ڈبا اس گڑھے میں رکھ کر دبا دیا اور دوبارہ پہلے کی طرح اس پر مٹی ڈال دی۔ اس جگہ کی نشانی کے لیے میں نے اس گڑھے کے سامنے کی دیوار پر کوئلے سے اپنا نام لکھ دیا۔

اب یہ کام بار بار ہونے لگا۔ حاجی احمد سیلون پر آتا اور کام کرانے کے ساتھ ساتھ مجھے کوٹھی پر بلاتا اور پھر حسب سابق سربمہر پیکٹ دے کر مختلف لوگوں کے پاس بھیجتا۔ وہاں سے موصول ہونے والے لفافے میں واپس حاجی احمد کو دیتا اور گھر چلا آتا۔ اگلے روز میرا انعام مجھے سیلون پر مل جاتا۔ میں انعام میں ملنے والی اس رقم کو صحن میں دبے ہوئے ٹین کے ڈبے کو نکال کر اس میں یہ رقم رکھتا اور دوبارہ اس ڈبے کو صحن میں دفن کر دیتا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا حتیٰ کہ ٹین کا ڈبا پیسوں سے اتنا بھر گیا کہ اس میں مزید پیسے رکھنے کی گنجائش نہ رہی۔ میں نے اس سلسلے میں حاجی احمد سے مشورہ کیا تو اس نے اپنے کمرے میں رکھا ہوا ایک جستی صندوق دے دیا اور کہا کہ میں آئندہ انعام میں ملنے والی رقم اس صندوق میں رکھ کر تالا لگا دیا کروں۔ ساتھ ہی اس نے مجھے یہ بھی مشورہ دیا کہ میں نے جو پیسے گھر کے صحن میں دبا رکھے ہیں وہ بھی لا کر اس صندوق میں رکھ دوں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جب میرے پاس کچھ رقم جمع ہو جائے گی تو وہ مجھے ایک نیا رکشا لے دے گا تاکہ میں سیلون کا کام چھوڑ کر رکشا چلا سکوں۔ میں خود بھی اپنے اس سیلون کے کام سے انتہائی تنگ تھا۔ میں جتنا بھی ماہر کاریگر ہی کیوں نہ

بابا مگر میرے نام کے ساتھ جو کام کی مناسبت سے "تائی" کا سابقہ لاحقہ لگ جاتا۔ وہ ساری زندگی کے لیے میرے ہم کادم چلا بن جاتا چنانچہ میں نے ہامی بھرلی۔

ایک روز میں نے موقع پاکر گھر کے صحن میں دبائے ہوئے پیسے نکالنے کے لیے گڑھا کھودا اور وہاں سے پیسوں والا ڈبا نکال ہی رہا تھا کہ اچانک اماں آ گئیں۔ انہوں نے میرے ہاتھ میں ڈبا دیکھا تو انہوں نے پوچھا کہ اس ڈبے میں کیا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے میرے ہاتھ سے ڈبا لینے کی کوشش کی تو میں گھبرا گیا اور ڈبا چھپاتے ہوئے بولا کچھ بھی نہیں۔ مگر انہوں نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ سے ڈبا چھینے کی کوشش کی تو میں نے ڈبا مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اسی چھینا جھپٹی میں ڈبا زمین پر گر گیا۔ اور سارے نوٹ زمین پر بکھر گئے۔ اماں اتنے سارے نوٹ دیکھ کر حق دق رہ گئیں۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور تیزی سے نوٹ اٹھائے اور بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔ اماں چیختی چلاتی میرے پیچھے بھاگیں مگر میں دوڑتا ہوا گلیاں عبور کر کے ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میرا رخ سیدھا حاجی احمد کی کوٹھی کی طرف تھا۔ جلد ہی میں اس کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ وہ گھر پر ہی تھا۔ میں نے اسے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ وہ مجھے اپنے کوارٹر میں لے گیا اور پیسے لے کر اسی صندوق میں رکھ دیے جو اس نے مجھے اسی مقصد کے لیے دیا تھا۔ میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اماں نے میرے پاس اتنی بڑی رقم دیکھ لی تھی۔ انہیں تو میں کچھ بتائے بغیر جل دے کر بھاگ آیا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ اماں نے ابا کو بتا دیا ہوگا اور ابا کو کسی بھی طریقے سے نہ دھوکا دیا جا سکتا تھا اور نہ ہی انہیں بہلایا جا سکتا تھا۔ میں ان کی سخت طبیعت سے بخوبی واقف تھا۔ انہوں نے میرے اندر سے ہر صورت میں سچ اگلوا لینا تھا چنانچہ میں نے اس سلسلے میں حاجی احمد سے مشورہ کیا تو اس نے کافی غور و فکر کرنے کے بعد مجھے یہ مشورہ دیا کہ مجھے اپنے ابا کو سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہیے کہ میں حاجی احمد کے ہاں سے پیکٹ لے کر ان کے بتائے ہوئے لوگوں کے پاس لے کر جاتا ہوں اور وہاں سے سر بمہر لفافے واپس لا کر حاجی احمد کو دیتا ہوں جس کے عوض مجھے یہ پیسے ملتے ہیں۔

"مگر ان پیکٹوں اور لفافوں میں کیا ہوتا ہے اگر ابا نے پوچھ لیا تو میں انہیں کیا جواب دوں گا جبکہ میں خود بھی نہیں جانتا کہ ان میں کیا ہوتا ہے؟" میں نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

انفرادیت (خودی)

انفرادیت کے مسئلے میں اس امر کا یقین ہوتا ہے کہ لوگ اپنے مفادات کو خود ہی بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ ان کو فکر و عمل کی آزادی ہونی چاہیے۔ اس نظریے کے ارتقاء میں ایک طرف یہ یقین کہ فرد انتہائی قدر و قیمت کا حامل ہے اور دوسری طرف ایک ایسے اقتصادی نظام کا اجراء جس کی بنیاد جائیداد کے حق ملکیت اور آزادانہ تبادلے پر قائم تھی بہت ممد اور معاون ثابت ہوئے۔ انفرادیت کے جدید نظریے کے سرگرم مبلغ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے درمیان فرانس، انگلستان اور امریکا میں سرگرم عمل رہے ان میں چند ایک یہ ہیں۔ جان لاک، ایڈم سمتھ، جیریمی بینتھم، جان اسٹوارٹ مل فرینکلن، تھامس جیفرسن۔ یہ اس نظریے کے قائل تھے کہ حکومت کو اپنی رعایت پر کوئی یکساں ضابطہ اخلاق مسلط نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کے انفرادی حقوق اور آزادیوں کی حفاظت کرنی چاہیے۔ اقتصادی دائرہ عمل میں نظریہ انفرادیت اس امر کا متقاضی ہے کہ آزادانہ تجارت، رضاکارانہ تقسیم کار اور آزادانہ تبادلہ اشیاء کی بدولت ہر شخص خوش حال ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات انفرادیت کی انتہا لاقانونیت اور طوائف الملوکی کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور انفرادی حقوق اور فرد کے شخصی وقار سے چشم پوشی ظلم اور استبداد پر منتج ہوتی ہے۔ اسلام نے بھی انفرادیت پر زور دیا ہے اور شاعر مشرق علامہ اقبال نے انفرادیت کی اخلاقی اقدار پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ ان کا نظریہ خود فرد کی شخصیت کو انتہائی بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کے تمام خیالات کی بہترین تفسیر اس شعر میں مضمر ہے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

مرسلہ: نگار تسلیم۔ پشاور

حاجی احمد کچھ دیر تک سوچتی نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا پھر ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ وقت آگیا ہے کہ تمہیں حقائق سے آگاہ کر دیا جائے۔“ اتنا کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر اپنی بات کا دوبارہ آغاز کرتے ہوئے بولا۔ ”تم کچھ دنوں سے پیکٹوں کی اور لفافوں کی دو طرفہ ترسیل سے ہمارے لیے ایک قابلِ اعتبار ساتھی بن چکے ہو۔ یہ ترسیل درحقیقت تمہارا ایک امتحان تھا کہ تم ہمارے لیے کس حد تک قابلِ اعتماد اور قابلِ بھروسا ثابت ہو سکتے ہو۔ تم نے جس محتاط طریقے سے ہمارے لیے کام کیا ہے۔ اس سے باس انتہائی متاثر ہوا ہے، چنانچہ انہی کے ایما پر تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتانے کا حکم ہے لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا، تفصیل سن کر اگر تم نے ہمارے کاروبار میں ہمارے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیا تو ہمارا ساتھ بس یہیں سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ ہم ایک دوسرے کے لیے غیر شناسا اور اجنبی بن جائیں گے۔ یعنی ہماری راہیں جدا جدا ہو جائیں گی مگر اس سلسلے میں تمہاری زبان ہمیشہ بند رہے گی۔ تم ہمارے بارے میں نہ کسی کو کچھ بتاؤ گے اور نہ ہی کسی کے سامنے زبان کھولو گے۔ جس دن تم نے دانستہ یا نادانستہ طور پر ایسا کیا تو کوئی آدمی کوئی کسی بھی جگہ تمہاری زندگی کا چراغ گل کر دے گی۔ ہاں اگر تم اس کاروبار کے متعلق سب کچھ جان کر بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ گے تو پھر دولت تم پر بارش کی طرح برسے گی۔ دولت جس سے دنیا کی ہر شے، ہر رشتہ، ہر سکھ اور آسائش خریدی جا سکتی ہے۔“

اس کے بعد اس نے جو مجھے بتایا وہ مختصراً یہی تھا کہ وہ بنیادی طور پر ایک منشیات فروش تھا۔ اس گروہ کا سربراہ سات پردوں میں مستور وہ نادیدہ شخص تھا جو انتہائی بارسوخ اور بااثر تھا۔ اس پُراسرار شخصیت کو گروہ کے کسی بھی فرد نے آج تک نہ تو روبرو دیکھا تھا اور نہ ہی اسے کوئی جانتا تھا مگر اسے اپنے لامحدود اور وسیع نیٹ ورک کے ایک ایک شخص، ایک ایک حرکت کی پل پل میں خبر ہو جاتی تھی۔ اس کے ہر محکمے، ہر انتظامی اور حکومتی مشینری میں رابطے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے گروہ کا کوئی بھی بندہ آج تک پکڑا نہیں جا سکا تھا اور اگر کبھی کوئی پکڑا بھی جاتا تو چند ہی گھنٹوں میں قانون کی آہنی سلاخیں موم کی طرح پگھل کر اسے رہائی کے لیے راستہ دے دیتی تھیں۔ یہ بھی شنید تھا کہ اس کے روابط ہر دورِ حکومت میں اعلیٰ حکام سے رہے ہیں۔ حکومت کسی بھی پارٹی کی ہو۔

اس کے اثر و رسوخ اور اختیارات میں کبھی بھی کسی قسم کی کوئی کمی نہیں آتی تھی۔ اس گروہ میں ہر قسم کا جرم انتہائی دھڑلے سے اور ببانگِ دہل ہوا کرتا تھا جن میں منشیات فروشی، بردہ فروشی، انسانی اسمگلنگ اور دیگر قبیح جرائم شامل تھے۔

حاجی احمد نے یہ بھی انکشاف کیا کہ وہ میری وساطت سے جو پیکٹ مختلف لوگوں کو بھجواتا تھا ان میں منشیات ہوتی تھی جو مقامی ڈیلروں تک پہنچائی جاتی تھی اور ان سے جو لفافے لے کر میں حاجی احمد کو پہنچاتا تھا وہ ان منشیات کی قیمت ہوتی تھی۔ حاجی احمد اور اس جیسے دیگر لوگ جن کو اس حوالے سے مختلف علاقے بانٹے گئے تھے۔ وہ اپنے اپنے علاقوں کی چھوٹی سطح کے سربراہ ہوتے تھے۔ انہیں منشیات کی بڑھتی ہوئی مانگ کے پیشِ نظر ہمیشہ لوگوں کی ضرورت رہتی ہے۔ اگرچہ اس نیٹ ورک پر نچلی سطح پر چلانے کے لیے ان کو اپنے نادیدہ سربراہ کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی کہ وہ اپنے بندوں کو قانون کے شکنجے سے مکھن میں بال کی طرح نکال لانے کی مکمل صلاحیت رکھتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ لوگ ایسے غیر معروف اور نئے چہروں کی تلاش میں رہتے تھے۔ جو ایک تو مال و دولت کے لالچ میں اس کام کے لیے رضامند ہوں تاکہ پکڑے جانے کی صورت میں ان سے زیادہ معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ دوسرے اگر کسی فرض شناس قانون نافذ کرنے والے اہلکار کی نظروں میں دھول جھونکی جا سکے کہ ایک ہی بندے کی متواتر مخصوص علاقوں میں آمد و رفت ان اہلکاروں کی نظروں میں مشکوک بنا سکتی تھی۔ جو وہاں مخصوص علاقوں میں مختلف بھیس میں تعینات ہوتے تھے۔ جبکہ اجنبی اور غیر معروف شخص کی آمد و رفت معمول کے مطابق ہو سکتی تھی۔

حاجی احمد نے مجھے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا تھا اور سوچنے اور فیصلہ کرنے میں دو دن کا وقت دیا تھا۔ اس نے مجھے یہ بھی ہدایت کی تھی کہ اگر وہ پیسوں کے متعلق پوچھیں تو میں ابا اور اماں کو مختصراً بتا دوں کہ کسی گمنام شخص نے ایک غیر قانونی کام کے سلسلے میں دیے تھے مگر یہ کسی صورت میں نہ بتاؤں کہ وہ آدمی کون تھا اور کس غیر قانونی کام کے سلسلے میں پیسے دیے تھے۔ چنانچہ میں اس سے مزید ہدایت لینے کے بعد گھر آ گیا۔

اس شام مجھ پر گویا قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔ ابا دن بھر کی جان توڑ محنت مشقت سے تھک ہار کر گھر واپس آئے تو اماں نے انہیں پیسوں کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔ میرے

اس اتنے زیادہ یکمشت پیسے دیکھ کر ان کے ذہن میں یہی خیال آیا تھا کہ شاید میں نے کہیں چوری کی یا کسی کے ساتھ مل کر ڈاکا ڈالا ہے۔ میں گھر میں داخل ہوا تو ابا روکھی سوکھی کھا کر چارپائی پر بیٹھے میری راہ ہی تک رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چارپائی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”کدھر ہیں وہ پیسے اور کہاں سے تو نے لیے یہ پیسے؟“ ابا کڑک دار آواز میں میرا گریبان پکڑتے ہوئے بولے۔

”میں جوان جہان ہٹا کٹا لڑکا تھا مگر ابا کی آواز میں اتنی کڑک اور تیور اتنے جارحانہ تھے کہ میں ہکلا کر رہ گیا۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ میں حاجی احمد کی ہدایت پر انہیں بتا سکتا کہ یہ میں نے کسی اجنبی سے کسی غیر قانونی کام کی مد میں لیے ہیں۔ اس لیے منمنا کر رہ گیا۔ ابا کا غصہ آسمان کو جا پہنچا۔ انہوں نے میرا گریبان چھوڑا اور قریب پڑی ہوئی موٹی سی لکڑی اٹھا کر مجھ پر پل پڑے۔ وہ مجھے مارتے جاتے تھے اور پوچھتے جاتے تھے کہ میرے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے ہیں۔ میں مار کھاتا جاتا تھا اور اماں اور بہن بھائیوں کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھتا جاتا تھا کہ شاید مجھے کوئی ابا کی مار سے بچالے۔ مگر سب ہی ابا کے ڈر سے خاموش تماشائی بنے مجھے مار کھاتا دیکھتے رہے۔ آخر میں میرا حوصلہ جواب دے گیا تو میں نے روتے ہوئے حاجی احمد کی ہدایت پر انہیں بتایا کہ کسی انجان آدمی نے مجھے ایک کام کے سلسلے میں ادا کیے تھے۔

نہ ابا نے مجھ سے تفصیل پوچھی کہ میں نے کون سا کام کیا تھا۔ جس کی مد میں مجھے اتنے زیادہ پیسے دیے گئے اور نہ ہی مجھ میں سب کچھ بتانے کا حوصلہ تھا۔

ابا نے لکڑی زمین پر پھینکی اور چارپائی پر گویا ڈھے سے گئے۔ اماں نے انہیں دوڑ کر پانی پلایا۔ پانی پی کر ابا نے خالی پیالہ اماں کو واپس کیا اور چند منٹ لمبی لمبی سانسیں لے کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر انتہائی شکستہ آواز میں بولے۔

”رسول بی بی! ہماری غربت نے ہمیں یہ وقت بھی دکھانا تھا کہ میری اولاد پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے غیر قانونی کاموں میں ملوث ہو جائے گی۔ میں دن رات کولہو کے بیل کی طرح محنت مزدوری کرتا رہا۔ خون پسینا ایک کر کے اپنے بچوں کا پیٹ بھرتا رہا۔ تم لوگوں کے گھروں میں ان کے جھوٹے برتن دھوتی رہیں۔ ان کی جھڑکیاں کھاتی رہیں۔ ڈانٹ ڈپٹ سہتی رہیں کہ ہماری اولاد کسی شے کے لیے نہ ترسے مگر اس بدبخت کو دیکھو کہ حق حلال کی کمائی کے لیے محنت مشقت کی راہ اپنانے کی بجائے حرام کی کمائی کے لیے غلط راہوں کا انتخاب کر بیٹھا۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں کہ حرام کی کمائی کا چسکا ایک دفعہ منہ کو لگ جائے تو پھر اس انسان پر نہ کوئی مار اثر کرتی ہے اور نہ ہی کوئی سختی۔ یہ جن راہوں کا راہی بن چکا ہے۔ ان راہوں سے اس کو پلٹ آنے کے لیے نہ اس پر کوئی مار کٹائی اثر کرے گی اور نہ ہی کوئی پند و نصائح اس پر اثر کر سکیں گے۔ تاوقتیکہ خود اللہ پاک کی طرف سے اسے ہدایت نہ آئے۔ لہٰذا میں ابھی اور اسی وقت اسے اس گھر سے نکل جانے کا حکم دیتے ہوئے اللہ پاک سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ پاک اسے صراط مستقیم پر جلد از جلد لوٹ آنے کی توفیق دے۔ پیشتر اس کے کہ یہ ان سیاہ راستوں پر چلتے چلتے ان اندھیری وادیوں میں کھو جائے۔ جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ ہی اسے ہدایت کی روشنیوں کی طرف نہ لا سکے۔ اللہ کرے یہ تمام برائیوں اور گناہ آلود زندگی سے تائب ہو کر رشد و ہدایت کے نور میں اپنی باقی ماندہ زندگی بسر کرے۔“ اس کے بعد انہوں نے بڑے جلال کے عالم میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے دفع ہو جا۔ میں تیری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“

اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ اماں اور دیگر بہن بھائی بے بسی کے عالم میں میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ابا کے اس فیصلے کے سامنے کسی کو بھی دم مارنے کی ہمت تھی نہ ہی ابا سے میرے حوالے سے بات کرنے کا یارا۔ چنانچہ میں نے اپنے دو چار کپڑوں کے جوڑے اٹھائے۔ ایک گٹھڑی کی صورت میں انہیں باندھا اور اماں، بہن بھائیوں اور گھر پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور گھر سے نکل آیا۔ آخری آواز جو گھر سے نکلتے ہوئے میرے کانوں میں آئی وہ میری اماں کے رونے اور بہن بھائیوں کو ماں کے چپ کرانے کی ملی جلی آوازیں تھیں۔

میرا رخ حاجی احمد کی طرف تھا اور ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ جلد ہی میں کوٹھی پہنچ گیا۔ حاجی احمد گھر ہی تھا اسے جب پتا چلا کہ میں اپنی ساری کشتیاں جلا کر اس کے پاس آ گیا ہوں تو اس کی آنکھوں میں مسرت اور خوشی چمک اٹھی۔ ”بچے!“ اس نے جب مجھے مخاطب کیا تو اس کے لہجے میں ایک [illegible] رچی ہوئی تھی۔ ”ہم جن راستوں

کے راہی ہیں۔ ان راستوں میں ماں، باپ، بہن بھائی، خون کے رشتے، منہ بولے رشتے سب کے سب ثانوی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ صرف اور صرف ایک ہی رشتہ ایسا پائیدار اور مضبوط رہ جاتا ہے جو دولت کا رشتہ ہوتا ہے۔ جب تمہارے پاس دولت آجائے گی جب تم نوٹوں میں کھیلنے لگو گے تو یہی ماں، یہی باپ تمہیں اپنا بیٹا ماننے میں فخر سمجھیں گے۔ تمہارے بہن بھائی جو گھر سے نکلنے کے وقت آگے بڑھ کر تمہیں روک نہ سکے۔ جب تم دولت مند ہو جاؤ گے تو یہی بہن بھائی تمہارے آگے پیچھے پھریں گے۔ تمہاری ایک جنبش ابرو پر اپنی جان لٹانے کے لیے ہر وقت تیار بیٹھے ہوں گے۔ خون کے جن رشتوں نے آج تم سے منہ موڑا ہے۔ یہ سب کچھ عارضی ہے۔ گوشت سے ناخن جدا ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کسی وجہ سے ناخن الگ ہو بھی جائے تو گزرتے وقت کا مرہم جلد ہی اس زخم کو مندمل کر دیتا ہے۔ تم فی الحال سب کچھ ذہن سے جھٹک ڈالو اور اپنی تمام تر توجہ دولت کے حصول پر مرتکز کر دو۔ جائز ناجائز، حلال حرام سب کچھ اپنے ذہن سے جھٹک ڈالو۔ اس سلسلے میں میرا بھرپور تعاون ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا۔"

غرض یہ کہ وہ کافی دیر تک مجھے سمجھاتا رہا۔ اس کے بعد اس نے اپنے کوارٹر میں ہی اپنے ساتھ میرے رہنے کا بندوبست کر دیا۔

☆☆☆

مجھے اپنے گھر سے نکلے ہوئے تقریباً بارہ سال سے زائد کا عرصہ بیت چلا تھا جب مجھے گھر سے نکالا گیا تھا تو اس وقت میری عمر تقریباً اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی اور اب میں تیس سال کا ہو چکا ہوں۔ ان بارہ سالوں میں، میں نے مالی لحاظ سے تو بے حد ترقی کی ہی تھی۔ میں جرائم کی دنیا میں بھی بے حد آگے جا چکا تھا۔ اس سلسلے میں حاجی احمد کی راہنمائی اور تعاون کی بدولت میں جرائم کی دنیا کا بے تاج بادشاہ بن چکا تھا۔ اسمگلنگ، منشیات فروشی، ٹارگٹ کلنگ، انسانی اعضاء کی اسمگلنگ غرض یہ کہ وہ کون سا جرم تھا جو میری سرپرستی میں نہ ہوتا ہو۔ حاجی احمد نے مجھے جرائم کی دنیا کے چیدہ چیدہ ان لوگوں سے بھی متعارف کرا دیا تھا جو ہمارے حلیف تھے اس نے میری اعلیٰ کارکردگی (جرائم کی دنیا کی) کی رپورٹ ہماری تنظیم کے اس نادیدہ باس تک بھی پہنچا دی تھی جس کو ابھی تک کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ بس بوقت ضرورت وہ لاسلکی آلے سے ہم سے ہر ماہ ہونے والی میٹنگ میں مخاطب ہوا کرتا تھا۔ وہ ہر میٹنگ میں میری کارکردگی کی دل کھول کر تعریف کیا کرتا تھا۔ میں نے بہت ہی کم عرصے میں اس دھندے میں کام کرنے والے بہت سارے پرانے لوگوں کو کارکردگی سے بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے اس حد تک متاثر ہوا تھا کہ اس نے مجھے اپنے خصوصی معاونین میں شامل کر لیا تھا۔

پہلے ہمیں تمام ہدایات و احکامات حاجی احمد سمیت چھوٹے عہدیداروں کی وساطت سے ملتے تھے مگر اب ہمیں احکامات و ہدایات براہ راست اسی نادیدہ باس سے ملنے لگے تھے۔ یہ اسی ترقی کا ہی اعجاز تھا کہ میں مالی لحاظ سے اتنا مضبوط ہو چکا تھا کہ مجھے خود اپنے اثاثوں کے حساب کتاب کے لیے ایک منیجر رکھنا پڑا تھا میں اب ارب پتی تھا۔ ملک کے بڑے بڑے شہروں میں میرے لگژری ہوٹل تھے۔ پلازے، کوٹھیاں، کاریں تھیں۔ اپنے مربی حاجی احمد کے ایما پر اپنے اس کالے دھن کو سفید کرنے کے لیے میں نے اپنا سرمایہ ہر طرح کے کاروبار میں لگایا ہوا تھا۔ معاشرے میں اپنے اس مجرمانہ بہروپ کو چھپانے کے لیے فلاحی اور سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا۔ میں ہر ماہ مختلف فلاحی تنظیموں کو ایک خطیر رقم بطور عطیہ دیتا۔ بیواؤں، یتیموں کے لیے وظائف مقرر کر دیے۔ غرباء کے لیے مختلف شہروں میں مفت دستر خوان لگانے شروع کر دیے۔

اس دوران میں نے شادی بھی کر لی تھی۔

یہ شادی محبت کی شادی تھی۔ عذرا کو میں نے ایک ایسی فلاحی تقریب میں دیکھا تھا جس میں، میں بطور "مہمان خصوصی" مدعو تھا۔ عذرا بھی اس تقریب میں مدعو تھی۔ ہلکی سبز آنکھوں والی اور شانوں تک کٹے ہوئے بالوں والی عذرا پہلی ہی نظر میں میرے دل کے تخت پر یوں براجمان ہو گئی کہ میں جو دولت کمانے کی دھن میں ایسے لطیف جذبوں کی دنیا کو بالکل ہی بھول گیا تھا عذرا کو دیکھتے ہی میرے وہ تمام جذبات پوری شدت سے انگڑائی لے کر بیدار ہو گئے۔ جو ہر آدم زادے کے دل میں ایک حوا زادی کو دیکھ کر بیدار ہوا کرتے ہیں۔ عذرا کا تعلق شہر کے ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ وہ ایک ایسے وکیل کی بیٹی تھی جو اپنی دیانتداری، ایمانداری اور سچائی کی وجہ سے پورے شہر میں مشہور تھا۔ وہ کیس ہمیشہ میرٹ پر لیا کرتا تھا۔ اگر اسے یقین ہو جاتا کہ اس کا مؤکل بے گناہ اور سچا ہے تو

urdunovels.com

کیس بسا اوقات نا صرف بغیر فیس کے لڑنے کے لیے
وہ تیار ہو جاتا تھا بلکہ ضرورت مندوں اور غریبوں کے تمام
عدالتی اخراجات بھی خود برداشت کرتا تھا لیکن اگر کوئی
موکل مجرم ہوتا اور اسے بھوری سے بھوری فیس کی پیش کش کرتا
تو وہ بڑی حقارت سے اس بھوری فیس کو ٹھکرا دیا کرتا اور کیس
لینے سے انکار کر دیتا۔

عذرا میرے نام، میرے فلاحی کاموں سے بے حد
متاثر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دو چار ملاقاتوں کے بعد جب میں
نے اسے شادی کی پیشکش کی تو اس نے اپنی رضا مندی
دیتے ہوئے اپنے والدین سے بات کرنے کو کہا۔ چنانچہ
میں اس کے والدین سے ملا وہ بھی میرے اس ظاہری
روپ سے بے حد متاثر تھے۔ چنانچہ وہ راضی ہو گئے اور
میری شادی ہو گئی۔ اس موقع پر مجھے اپنے والدین اور بہن
بھائی بہت یاد آئے جنہیں دولت کمانے کی دھن میں، میں
مکمل طور پر بھول چکا تھا۔ چنانچہ ایک روز میں اکیلا ان
سے ملنے گھر چلا گیا۔ میں اپنی قیمتی کار میں اپنے پرانے گھر
گیا تھا اور ان کے لیے قیمتی تحائف بھی لے کر گیا تھا۔ میرا
خیال تھا کہ وہ میری شان و شوکت، میری قیمتی گاڑی اور
قیمتی تحائف دیکھ کر گھر والے نا صرف خوش ہو جائیں گے
بلکہ گلے بھی لگائیں گے مگر اس وقت میں بے حد مایوس ہوا
جب ابا نے مجھے دیکھتے ہی نفرت سے منہ پھیر لیا۔ وہ محنت
مشقت کر کر کے کافی کمزور ہو چکے تھے۔ اماں میری جدائی
کے غم میں بستر پر لگ گئی تھیں۔ بہن بھائی اپنے اپنے گھر بار
والے ہو چکے تھے۔ اماں نے مجھے دیکھتے ہی اپنے بازو وا
کر دیے۔ شاید مجھے اپنے بازوؤں کے حصار میں لینا
چاہتی تھیں۔ مگر ابا نے مجھے دھکے دیتے ہوئے گھر سے باہر
نکال کر دروازہ بند کر دیا۔ ساتھ ہی بلند آواز میں گرجتے
ہوئے بولے۔ ”حرام کمانے والے کی میرے گھر میں کوئی
جگہ نہیں، خواہ وہ میرا سگا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ آج کے بعد
میرے گھر میں کبھی بھی نہ آنا۔ یہ حلال کمائی سے پلنے والوں
کا گھرانا ہے۔“

میں مایوس و نامراد گھر واپس چلا آیا۔ آج پہلی بار
شدت سے یہ احساس زیاں ستا رہا تھا کہ دولت کمانے
کی دھن میں، میں نے اپنے ماں باپ، اپنے بہن بھائی،
اپنے خونی رشتے سب کچھ کھو دیے ہیں۔

میری عذرا سے شادی ہو گئی اور زندگی ایک ڈگر
پر چل نکلی۔ میں عذرا کے سنگ سنگ ازدواجی زندگی انتہائی
خوش و خرم اور بظاہر بڑی مطمئن گزارنے لگا۔ پھر اللہ تعالیٰ
نے مجھے اولاد سے نوازا۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ میں دنیا
والوں کی نظر میں خود اپنی محبوب بیوی اور اس کے والدین
کی نظر میں ایک انتہائی خوشحال اور کامیاب بزنس مین تھا جو
غریبوں، لاوارثوں کا مددگار تھا، ظلم و ستم پر آواز اٹھاتا تھا۔

میں نے نیک نامی، سخاوت، فیاضی اور اچھائی کا یہ
بہروپ اپنے اوپر اس خوبی سے اوڑھا ہوا تھا کہ میرے
اس بہروپ سے لوگ تو کیا خود میری محبوب بیوی بھی جو نا
صرف ہر وقت میری سانسوں، میری دھڑکنوں میں سمائی
رہتی تھی بلکہ میری ہمدم اور دمساز بھی تھی جس سے میں ٹوٹ
کر پیار کرتا تھا۔ وہ بھی میرے اس بہروپ تک نہیں پہنچ
پائی تھی۔ میرا یہ روپ جو کسی غلیظ جوہڑ کی طرح متعفن اور
بدبودار تھا جہاں چار سو جرائم کی وہ گہری دلدل تھی جس کی
کوئی تہہ ہی نہیں تھی۔ اس دلدل میں ہر قسم کے جرائم پنپتے
تھے۔ میں نے جرائم کی اس دنیا کو ہی اپنا سب کچھ مان لیا
تھا۔ میں نے یہ سمجھ لیا تھا، دنیا کا کوئی بھی فرد بشمول میری
محبوب بیوی عذرا کے میرے اس گھناؤنے باطن تک کوئی
بھی نہیں پہنچ پائے گا اور لوگ میرے نیک کاموں، دریا دلی
اور سخاوت کی بدولت ہمیشہ میری عزت، تکریم کرتے رہیں
گے۔ مگر ایک روز وہ سب کچھ ہو گیا جو میں نے کبھی سوچا بھی
نہیں تھا۔ میری ہر طرح کی رازداری اور احتیاط کے باوجود
میری محبوب بیوی عذرا کو میرے سیاہ کارناموں کی نجانے
کیسے خبر ہو گئی۔ مگر وہ ایک سمجھدار اور ٹھنڈے دماغ کی
عورت تھی۔ اس نے عام عورتوں کی طرح نہ تو مجھ سے کسی
قسم کی باز پرس کی اور نہ ہی کوئی لڑائی جھگڑا کیا۔ بس
خاموشی سے میری ٹوہ میں رہنے لگی۔ میری ایک ایک
حرکت کا بغور جائزہ لیتی رہی اور میرے خلاف چپکے چپکے
ثبوت اکٹھے کرتی رہی اور جب اس نے میرے خلاف
ٹھوس ثبوت حاصل کر لیے تو ایک روز اس نے انتہائی
سنجیدگی کے ساتھ مجھ سے باز پرس کرنا شروع کر دی۔

میں جو حکومت کی ذہین ترین خفیہ ایجنسیوں اور
قانون نافذ کرنے والے اداروں کو آج تک بڑی کامیابی
کے ساتھ جل دیتا چلا آیا تھا۔ بھلا ایک سیدھی سادی گھریلو
عورت کی باتوں میں کیسے آ جاتا۔ چنانچہ میں نے انتہائی
ڈھٹائی سے یکسر انکار کر دیا مگر جب اس نے تمام ثبوت
میرے سامنے رکھ دیے تو میں نے اسے اپنے کسی دشمن کی
سازش قرار دے کر اسے مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی

وہ ایک شوہر پرست گھریلو وفادار اور پیار کرنے والی بیوی ضرور تھی لیکن اتنی سادہ لوح نہیں تھی جتنا میں نے اسے سمجھا تھا۔اس نے مزید کچھ ناقابلِ تردید ثبوت پیش کر دیے کہ میرے لیے مزید انکار ممکن نہ رہا۔چنانچہ میں نے اپنے سیاہ کارناموں کا اقرار تو کرلیا ساتھ ہی اسے بھی دولت کی افادیت پر لمبا چوڑا لیکچر دے کر اسے بھی اس میں شمولیت کی دعوت دے دی۔اس نے بڑی زخمی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔"میں نے آپ سے بہت محبت کی ہے۔آپ میرے بچوں کے باپ ہیں اس لیے میں یہ تمام ناقابلِ تردید ثبوت قانون نافذ کرنے والے اداروں کے حوالے نہیں کررہی کیونکہ مجھے یقین ہے کہ آپ کے سرپرست آپ کو ایک دن بھی سلاخوں کے پیچھے نہیں رہنے دیں گے۔سزا تو کجا وہ آپ کو حراست میں بھی نہیں لے سکیں گے۔مگر میں آپ کو سزا ضرور دوں گی۔اور وہ سزا کیا ہے۔اس کا جلد ہی آپ کو ادراک ہوجائے گا۔"

اتنا کہہ کر اس نے بڑی عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔میں نے یہ سوچ کر اس کی اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی کہ اسے ابھی وقتی طور پر غصہ آیا ہوا ہے اس لیے وہ جو بھی منہ میں آیا ہے کہہ کر چلی گئی ہے۔بھلا ایک عام سی گھریلو عورت مجھ جیسے بااثر آدمی کو کیسے اور کیا سزا دے سکتی ہے۔اس کی اس بات کو میں نے کوئی اہمیت نہ دی۔مگر اگلی صبح جب میں سو کر اٹھا تو وہ اس وسیع وعریض کوٹھی سے جا چکی تھی۔اس نے گھر سے کوئی زیور، کوئی رقم، کوئی قیمتی چیز نہیں لی تھی۔بس تن کے انہی تین کپڑوں میں گھر سے ہمیشہ کے لیے چلی گئی جو وہ شادی کے پہلے روز اپنے میکے سے پہن کر آئی تھی۔ہاں البتہ جاتے جاتے وہ اپنے چاروں بچوں کو ساتھ لے گئی تھی اور ساتھ ہی ایک مختصر سا خط میرے نام چھوڑ گئی تھی جس میں لکھا تھا کہ وہ مجھ سے ... دل و جان سے پیار کرتی ہے اور زندگی کی آخری سانسوں تک کرتی رہے گی۔وہ میری اصلیت کے بارے میں کسی کو بھی نہیں بتائے گی نہ اپنے والدین کو اور نہ ہی قانون نافذ کرنے والے کسی بھی ادارے کو۔وہ بس اس وقت کا انتظار کرے گی جب میں ہر جرم سے سچے دل سے تائب ہو کر اس کی طرف لوٹ کر نہیں آجاتا اور جس روز ایسا ہو گیا وہ اپنی بانہیں، اپنی آغوش بڑی فراخدلی سے اس کے لیے پوری طرح وا کردے گی۔بچوں کو وہ اس لیے ساتھ لے کر جارہی ہے تاکہ وہ ان بچوں پر اپنے باپ کے کسی بھی جرم کا سایہ نہ پڑنے دے۔

اس واقعہ کو برسوں بیت گئے ہیں اور میں اس بھری پری دنیا میں بالکل تن تنہا رہ گیا ہوں۔ماں باپ، بہن بھائی برسوں پہلے ہی مجھ سے ناراض ہو کر لاتعلق ہوگئے تھے۔آج میرے بیوی بچے بھی مجھے چھوڑ کر جاچکے ہیں۔میں اس وسیع وعریض کوٹھی میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔ملازموں کی بھیڑ میں بھی اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہوں۔اپنی تنہائیاں دور کرنے کے لیے میں لوگوں کے ہجوم میں خود کو گم کردینا چاہتا ہوں۔مگر اس دلِ ویراں کی ویرانیاں ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آتیں۔میں اربوں کے اثاثے ہونے کے باوجود خود کو مفلس اور قلاش محسوس کرتا ہوں۔مجھے آج حاجی احمد کے برسوں پہلے کے کہے ہوئے الفاظ یاد آتے ہیں کہ دولت سے دنیا کی ہر شے، ہر رشتہ خریدا جاسکتا ہے۔کاش آج اگر وہ زندہ ہوتا تو میں اسے بتاتا کہ میں جو اربوں کا مالک ہوں۔ملک بھر میں میرے شاندار پلازے ہیں، کوٹھیاں، کاریں ہیں۔ان گنت لوگوں کا سہارا ہوں۔ہر محفل کی جان ہوں۔لوگ میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے دیوانہ وار لپکتے ہیں۔مجھ سے ہاتھ ملانا، میرے ساتھ تصویر بنوانا باعثِ فخر سمجھتے ہیں مگر باوجود دولت کی فراوانی کے میں وہ مفلس، قلاش اور نادار انسان ہوں جو قلبی اور ذہنی سکون سے محروم ہوں۔میں ان اربوں کی مالیت سے، کوٹھیوں، پلازوں اور کاروں کے اپنے لیے کچھ بھی نہیں خرید سکتا۔نہ ماں باپ کی محبت، نہ بہن بھائیوں کا پیار، نہ بیوی بچوں کا ساتھ اور نہ ہی ذہنی سکون، کچھ بھی تو نہیں خرید سکتا۔میں نے دو تین بار اپنی محبوب بیوی، اور بچوں سے ملنے کی کوشش کی ہے مگر اس کی صرف اور صرف ایک ہی شرط ہے کہ میں تمام جرائم سے سچے دل سے تائب ہو کر آؤں۔تب وہ میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوگی۔کاش میں اسے بتا سکتا کہ گناہوں کی یہ دلدل، وہ دلدل ہے جو اس میں ایک دفعہ دھنس جاتا ہے پھر اس میں سے زندہ کبھی بھی نہیں نکل سکتا۔وہ اس میں دھنستا ہی چلا جاتا ہے اور پھر ایک روز اس کے اپنے ہی ساتھی افشائے راز کے ڈر سے موت کے گھاٹ اتار دیا کرتے ہیں۔کاش میں نے اس گناہ آلود زندگی کا آغاز نہ کیا ہوتا۔

کاش اے کاش۔

++

urdunovels.com

عاقبت نااندیش

محترم مدیر
السلام علیکم!
زیر نظر سچ بیانی خود میں بہت بڑا سبق ہے۔ ماں کی گود بچے کا پہلا اسکول ہے۔ ماں اگر صحیح تربیت نہ کرسکے تو پورا گھر برباد ہوجاتا ہے۔ ریحانہ بیگم کی غلطیوں نے کس طرح پورا گھر برباد کیا، یہ عبرت کا مقام ہے۔

نادیہ عنبر لودھی
(راولپنڈی)

شدید سردی کی لہر نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ دو دن سے سورج نہیں نکلا تھا۔ سرد ہوا ہڈیوں میں گھسی جارہی تھی۔ مغرب کا وقت تنگ ہو رہا تھا۔ امجد بس اسٹینڈ پر بس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اسے گارمنٹ فیکٹری سے نکلے ہوئے آدھا گھنٹا ہو چکا تھا۔ وہ انڈسٹریل ورکر تھا۔

اتنے میں بس آگئی جو کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ کنڈیکٹر نے نفی میں ہاتھ ہلایا۔ لیکن امجد زبردستی بس میں سوار ہو گیا اور دروازے سے ملحقہ اسٹینڈ سے لٹک گیا۔ اس کا ایک پاؤں پائیدان پر اور دوسرا ہوا میں تھا۔ بس مسلسل ہچکولے کھا رہی تھی۔ امجد کا توازن بار بار بگڑ رہا تھا کہ ڈرائیور نے زور سے

بریک لگائی۔ امجد اچھل کر بس سے نیچے گر گیا اور اس کی ٹانگوں کے اوپر سے بس گزر گئی۔ سڑک پر موجود راہ گیروں نے امجد کو سرکاری اسپتال پہنچا دیا۔

☆☆☆

امجد کے والدین کے درمیان شدید بحث جاری تھی۔ امجد کی ماں جھگڑالو اور بدتمیز عورت تھی۔ وہ آئے دن شوہر سے لڑ کر میکے چلی جاتی۔ اس کے چار بھائی تھے جو اکلوتی بہن کی بہت سنتے تھے۔ وہ بہن کی شکایتیں سن کر بہنوئی سے گالم گلوچ کرتے۔ امجد کا والد ماجد الیاس ایک شریف اور بااصول آدمی تھا۔ اس کا ایک بڑا جنرل اسٹور تھا۔ امجد کی ماں ریحانہ بیگم انتہائی درجے کی فضول خرچ تھی۔ ماجد کی ہر بات کے مقابلے میں وہ بحث کرتی اور دونوں بیٹوں امجد اور مجاہد کو باپ کے خلاف بھڑکاتی رہتی۔ دونوں بیٹے جنرل اسٹور سے چیزیں چرا کے گھر لے آتے۔ جب ماجد الیاس پوچھ گچھ کرتا تو جھگڑا شروع ہو جاتا۔ آج بھی اسی نوعیت کا ایک مباحثہ چل رہا تھا۔ ماجد الیاس کی دکان کے گلے سے دس ہزار غائب تھے اور اسے امجد پر شک تھا جب کہ ریحانہ بیگم انکار کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اسپتال والوں نے امجد کے ایکسیڈنٹ کی خبر دی۔ ریحانہ نے واویلا مچانا شروع کر دیا۔

"ہائے میرا بچہ ہائے میرا بچہ۔ مجھے جلدی لے چلو اسپتال۔" تین بیٹیوں میں سے بڑی بیٹی فرح نے ماں کو چادر اور پرس تھمایا۔

"ماموں کو بتا دینا، فون کر دینا۔" نکلتے نکلتے ریحانہ بیگم نے صدا لگائی۔

"جی امی۔" فرح نے جواب دیا۔ ریحانہ موٹر سائیکل پر ماجد کے ساتھ اسپتال جا پہنچی۔ راستے میں بارش شروع ہو گئی۔ سردی مزید بڑھ گئی۔ موسم کا ہوش کسے تھا۔ ریحانہ بیگم کے تو اوسان خطا ہو چکے تھے۔ امجد اس کا بڑا بیٹا تھا شادی کے پانچ سال بعد بہت دعاؤں سے پیدا ہوا تھا۔

"یا اللہ میرے بچے کو کچھ نہ ہو۔ میرے مولا کرم کر دے۔"

اس نوعیت کی دعائیں کرتے ہوئے ریحانہ بیگم کا سفر گزرا۔ ایمرجنسی میں جا کر پتا چلا کہ امجد کا فوری آپریشن ہوگا۔ امجد بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اس کی خون آلود ٹانگیں دیکھ کر ریحانہ بیگم کی چیخیں نکل گئیں۔ چہرے پر بھی رگڑیں آئی تھیں مزید چوٹیں بھی لگیں تھی۔

"فوراً بلڈ کا بندوبست کریں۔ چار بوتلیں۔" نرس کہہ کر چلی گئی۔ سرکاری اسپتال میں گندگی، بدبو اور نفسانفسی کا عالم تھا۔ ماجد الیاس خون کا بندوبست کرنے چلا گیا۔ ساری رات ایسے ہی گزر گئی۔ پریشانی اور غم نے دونوں کے حواس شل کر رکھے تھے۔ بنچ پر بیٹھے بیٹھے ریحانہ بیگم کی ٹانگیں شل ہو گئیں۔ وہ فربہی مائل تھی۔ سہل پسند، سست مزاج اور آرام طلب۔ اگلے دن صبح کے آٹھ بجے ریحانہ بیگم کے چاروں بھائی آ گئے۔ ریحانہ بیگم بھائیوں کے گلے لگ کر رونے لگی۔ اتنے میں ریحانہ کی ساس اور نند بھی آ گئی۔ ساس اور نند سے ریحانہ بیگم کی کبھی نہیں بنی تھی۔ ریحانہ بیگم کو اپنی سفید رنگت پر بہت غرور تھا۔ سسرال والوں اور شوہر کے گہرے سانولے رنگ کا وہ مذاق اڑاتی تھی۔ بھائیوں پر بھی اسے مان تھا۔ اسی لیے کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اولاد بھی ماں کا پرتو تھی۔ ماں جیسی عادات و خصائل کی مالک اور باپ کی نافرمان۔ پانچ بچے دو بیٹے اور تین بیٹیاں گندمی رنگت لیے ہوئے تھے ان میں سے کوئی ماں جیسا سفید اور باپ جیسا سیاہی مائل نہ تھا۔ مجاہد چھوٹا بیٹا سب کا ناشتا لے کر آ پہنچا۔ ناشتا کر کے سب آپریشن کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ اتنے میں ریحانہ بیگم کی بہو، بہو کا بھائی اور سمدھن بھی آ گئے۔ شازیہ ریحانہ بیگم کی بہو میکے گئی ہوئی تھی جب یہ قیامت ٹوٹی۔ بارہ بجے آپریشن شروع ہوا اور شام کے تین بجے تک چلا۔ تین بجے امجد کو آپریشن تھیٹر سے آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا۔

"میرا بیٹا ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب۔" ماجد الیاس نے پوچھا۔

"مجھے بہت افسوس ہے آپ کے بیٹے کی دونوں ٹانگیں کچلی گئی تھیں جسم میں زہر پھیل رہا ہے تھا اس لیے ہمیں اس کی ٹانگیں کاٹنا پڑی۔ آپ حوصلے سے کام لیں۔" ڈاکٹر ماجد الیاس کا کندھا تھپتھپا کر چلا گیا۔ ریحانہ بیگم کو غش آنے لگے۔ وہ سینہ کوبی کرنے لگی۔ سب تسلیاں دینے لگے۔

"ہائے ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے صرف پچیس سال۔ کیسے گزارے گا اتنی لمبی زندگی۔" امجد ایک گارمنٹ فیکٹری میں ملازمت کرتا تھا۔ اس کی شادی کو تین ماہ ہوئے تھے۔ پہلے ماجد الیاس نے اسے اسٹور پر ساتھ رکھا ہوا تھا۔ غلے سے وہ چوریاں کرتا تھا اس لیے باپ نے اسے نکال دیا تھا۔ بڑی مشکل سے ریحانہ کو سنبھالا گیا۔ شازیہ کا بھی رو رو کر برا حال تھا۔ ریحانہ اور شازیہ کو شازیہ کی والدہ اور امجد کے ماموؤں کے ساتھ گھر بھیج دیا گیا۔ اسپتال میں مجاہد، شازیہ کا

urdunovels.com

بھائی اور ماجد الیاس رہ گئے۔ رات کے آٹھ بجے پانچ گھنٹے بعد جب لینڈ یورل کا اثر ختم ہوا تو امجد کو ہوش آگیا۔ وہ درد سے چیخنے لگا۔ ڈاکٹرز نے اسے پین کلرز دیے اور بے ہوشی کے انجکشن لگا دیے۔ صبح تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ صبح سب اسپتال جا پہنچے اور امجد کو ذہنی طور پر معذوری کے لیے تیار کرنے لگے۔ اتنے میں ڈاکٹرز چیک آپ کے لیے آگئے اور امجد کو سمجھانے لگے۔ امجد کو حقیقت معلوم ہوئی تو وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگا کہ اسے سنبھالنا مشکل ہوگیا۔

"اللہ بیچارے کو پردہ ہی دے دے۔" امجد کا سب سے بڑا ماموں بولا۔

حرماں نصیبی امجد سے چمٹ گئی تھی وہ جتنا بھی روتا کم تھا عمر بھر کی محتاجی نے اس کی چلنے کی استطاعت چھین لی تھی۔ بہت بڑی آزمائش نے اسے گھیر لیا تھا۔ "کیا ہوگیا ہے میرے ساتھ آخر میں ہی کیوں۔"

تسلی دینے والوں کے الفاظ ختم ہوجاتے مگر امجد کا رونا نہ رکتا۔ کوئی دلاسہ اس کے دل پر اثر نہ کرتا۔ اپنی ٹانگوں کی طرف دیکھتا تو حسرت سے خالی بستر پر ہاتھ پھیرتا رہتا۔ ایک ہفتہ بعد امجد کو ڈسچارج کردیا گیا۔ وہ وہیل چیئر پر بیٹھ کر اسی دروازے سے اندر داخل ہوا جس سے اپنے قدموں پر باہر نکلا تھا۔ اس کے درد کا کوئی درماں نہیں تھا۔ ایک ایک کرکے سب چلے گئے۔ اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ اس کی ماں، بیوی، بہنیں اور بھائی رہ گئے۔ سب اس کا خیال رکھتے تھے۔ ماجد الیاس بھی بیٹے کا ہر ممکن خیال رکھتا۔ دن گزرنے لگے۔ موسم بدلتے رہے۔ بہاروں کی رت آئی بھی خزاں نے ڈیرے ڈالے۔ درختوں سے پتے بکھرے۔ پھر نئے سبز لباس عطا ہوئے لیکن امجد کی معذوری مستقل نوعیت کی تھی اس کے لیے کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ وہ کمرے میں پڑا رہتا۔ روتا رہتا۔ خدا سے شکوے کرتا رہتا۔

ریحانہ بیگم اور ماجد الیاس کے جھگڑے پھر شروع ہوگئے۔ ماجد الیاس کے چار سالے اسے اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں ماجد الیاس ان کی بہن سے ناروا سلوک روا رکھتا تھا۔ ریحانہ میکے جاکر لگائی بجھائی کرتی رہتی تھی۔ ماجد کا چھوٹا بیٹا مجاہد ماموں کی بیٹی کو پسند کرتا تھا۔ پسند کیا، دونوں کی لواسٹوری زوروں پر تھی۔ ریحانہ نے رشتے کی بات چھیڑی تو ماجد الیاس ہتھے سے اکھڑ گیا۔ "تیری بھتیجی کو کبھی بہو نہیں بناؤں گا۔ تیرے بھائی نے مجھے گلی میں کھڑے ہوکر ماں بہن کی گالیاں دی تھیں۔ میرا گریبان پکڑا تھا۔ نہیں بھولا میں۔"

"تو مجاہد کا کیا۔ وہ صبا سے محبت کرتا ہے۔" ریحانہ بیگم بولی۔

"بھاڑ میں جائے ایسی محبت ..... جو اپنی عزت خاک میں ملا کر لے۔" دونوں میاں بیوی کی بحث شدید جھگڑے پر ختم ہوئی۔ ریحانہ بیگم ناراض ہوکر بھائی کے گھر چلی گئی۔ معذور بیٹے کا خیال بھی نہیں کیا۔ والدین کی اس لڑائی کا بیٹیوں پر منفی اثر پڑ رہا تھا جس کا کسی کو ہوش نہیں تھا۔ بیٹیاں لاشعوری طور پر ماں سے بدزبانی، خود پسندی، اور طعنہ زنی کی تربیت لے رہی تھیں۔ ریحانہ بیگم دو ماہ بھائی کے گھر پڑی رہی۔ بار بار ماجد الیاس بلاتا رہا۔ بچے فون کرتے رہے۔ آخرکار ماجد نے دوسری شادی کی دھمکی لگائی تو ریحانہ واپس آئی۔ ریحانہ کے بعد گھر کا برا حال تھا۔ بڑی بیٹی دسویں میں تھی اور درمیان والی آٹھویں اور سب سے چھوٹی پانچویں میں پڑھتی تھی۔ جوان بچیاں چھوڑ کر ریحانہ بیگم کنواری لڑکیوں کی طرح آزاد پھرتی رہتی۔ امجد کا حال پوچھنے اور اس کا دل بہلانے اس کے دوست گھر پر آتے۔ ایسے ہی ایک دوست نے بڑی والی فرح کو شیشے میں اتار لیا۔ شازیہ بیچاری خاطر مدارات میں لگی رہتی۔ ذیشان نے فرح کو آتے جاتے کوئی تحفہ دے دیتا موبائل پر رابطہ رہتا۔ ریحانہ بیگم کو خبر نہیں تھی۔ پھر ان دونوں کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ دو سال بعد جب اس نے میٹرک کرلیا تو ذیشان کی ماں رشتہ لینے آگئی۔ ماجد الیاس نے ذات پات کو وجہ بنا کر رشتے سے انکار کردیا۔ فرح نے ذیشان کی باتوں میں آکر گھر کے ماحول سے راہ فرار اختیار کرلی اور ذیشان کے ساتھ بھاگ گئی۔ بہت بدنامی ہوئی سارے محلے کو پتا چل گیا۔ دو گلیاں چھوڑ کر ذیشان کا گھر تھا۔ پہلے تو دونوں منہ کالا کرتے رہے جب فرح اُمید سے ہوگئی تو نکاح کرلیا۔ ماجد الیاس نے ریحانہ کو قصوروار ٹھہرایا۔ ریحانہ بیگم نے اپنا قصور ماننے سے صاف انکار کردیا۔ حسب روایت دونوں کی بہت لڑائی ہوئی اور ریحانہ بیگم بھائی کے گھر ناراض ہوکر چلی گئی۔ محتاج امجد ماں باپ کی تیز کلامی سنتا رہتا مگر کیا کرسکتا تھا وہ خود پائی پائی کا محتاج تھا۔ شدید گرمی سے اس کی کمر پر بیڈ سول ہوگئے تھے۔ اے سی چلاتا تو بل آتا تھا۔ اس نے بیوی سے منت کی وہ مجاہد کے ساتھ مل کر اسے کمرے سے صحن میں لے آئی۔ ماجد الیاس کا گھر دس مرلہ پر مشتمل تھا۔ اطراف میں کمرے تھے، بیچوں بیچ صحن تھا۔ چھ کمرے، باورچی خانہ

اسٹور اور غسل خانے پر مشتمل یہ مکان سفید پوش محلے کے مکانوں جیسا ہوا اور مکان تھا۔ چھت پر بھی ایک کمرا بنا ہوا تھا اس کمرے میں ریحانہ بیگم کی ساس رہتی تھی۔ وہ ضعیف عورت خود کھانا پکاتی۔ ریحانہ بیگم اسے نیچے اترنے نہیں دیتی تھی۔ شدید گرمی میں بھی وہ اوپر ہی سڑتی رہتی۔ ماجد الیاس ماں کو سودا سلف لا دیتا۔ ماں کی دیکھا دیکھی پوتے پوتیاں بھی دادی سے کھنچے رہتے۔ تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہوگئی۔ شازیہ چائے بنانے چلی گئی۔ امجد بارش میں بھیگتا رہا اور روتا رہا۔ اس کے لیے زندگی کا چہرہ ایسا بدصورت تھا کہ ایک نظر ڈالتا تو دوسری ڈالنے کو اس کا جی نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ زندگی تو اس کے اردگرد تھی ہی نہیں۔ موت سے بدتر مایوسی تھی یا شاید موت تھی اور موت کا کوئی چہرہ نہیں ہوتا۔ چہرہ تو زندہ انسان کا ہوتا ہے۔ قبر مردے کے نقوش جھاڑ دیتی ہے وہ بھی ایک قبر میں تھا۔ عذاب سے بھری ہوئی اندھیری قبر میں۔ اس کا دل چاہتا اپنے پیروں پر کھڑا ہو۔ تیز چلے، بھاگے دوڑے، دل کی چاہت قسمت کی چاہت نہیں تھی۔ بیوی کی نظر صحن پر پڑی تو اس نے مجاہد کا سہارا لیا اور اسے اندر لے آئی۔ تھوڑی دیر بعد شازیہ چائے بھی بنالائی۔ وہ چائے پینے لگا۔

اس کا باپ جنرل اسٹور پر تھا اور اس کی ماں اپنے مشر گشتی پر۔ ریحانہ کا شادی کے پہلے دن سے ہی یہ وتیرہ تھا وہ میکے چلی جاتی۔ ریحانہ کی ماں کے لاڈ نے ریحانہ کو بگاڑ دیا تھا۔ چاروں بھائیوں سے چھوٹی تھی بہت لاڈلی تھی۔ بیٹے کی معذوری، بیٹی کی جگ ہنسائی کے بعد بھی اسے عقل نہیں آئی کہ اپنی عادتیں درست کرے اور گھر گرہستی سنبھالے۔ تھکا ہارا ماجد الیاس دکان سے آتا تو بدذائقہ کھانا ملتا۔ بہو کو صبح سے کھانا نہیں بنانا آتا تھا۔ گندے کپڑوں کے ڈھیر لگ گئے۔ برتن تو بچیاں دھو دیتیں۔ تھوڑا بہت کچن کا کام بھی کرلیتیں۔ لیکن وہ دونوں اسکول جاتی تھیں۔ بہو بیچاری بیمار شوہر کو سنبھالتی یا گھر کا کام کرتی۔ ریحانہ بیگم کی غیر موجودگی سے گھر کا سارا انتظام چوپٹ ہو کے رہ گیا تھا۔ دو دن بعد مجاہد بھی ماں کے پیچھے بھاگ گیا۔ اپنی محبوبہ کزن کی محبت میں وہ پروانہ، دیوانہ بنا ہوا تھا۔ اب ماں سے شادی کی ضد کرنے لگا۔ ماموں نے نکھٹو مجاہد کو رشتہ دینے سے انکار کردیا۔ مجاہد کے اکسانے پر ماں باپ کے سامنے اکڑ گئی کہ شادی کروں گی تو مجاہد سے۔ مجبوراً باپ جھک گیا اور ریحانہ سے ماجد الیاس کے ساتھ باقاعدہ رشتہ لانے کے لیے کہا۔ ریحانہ بیگم گھر واپس آ گئی رشتے کے چکر میں۔ جب اس نے رشتے کی بات کی تو گھر میں طوفان آ گیا۔ وہ فساد پڑا کہ الامان۔ دونوں میاں بیوی اپنی ضد پر اڑ گئے۔ ریحانہ اپنی بھتیجی اور ماجد الیاس اپنی بھانجی کے لیے زور لگانے لگا۔ میدان میں مجاہد بھی اپنا مقدمہ لڑنے کود پڑا۔ ”اگر مجھے صبا نہ ملی تو ابا میں تجھے فائر مار دوں گا۔ اور تیری کالی کلوٹی بھانجی سے شادی نہیں کروں گا۔“ مجاہد نے بڑھک ماری۔

”جیسی ماں ویسی اولاد۔ تمیز نہیں ہے۔ باپ کو فائر مارے گا۔ نہ میں اس کی شادی میں جاؤں گا نہ کوئی پیسا دوں گا۔ خود جو کرنا ہے کرلو۔ سن لیا ریحانہ بیگم۔“ یہ کہہ کر ماجد الیاس گھر سے نکل گیا۔

ماں بیٹا ماجد الیاس پر لعنت بھیج کر شادی کے خرچے کی پلاننگ کرنے لگے۔ ریحانہ بیگم نے چپکے چپکے شادی کی تیاری شروع کردی۔ سونے کا سیٹ اپنا چڑھا دیا کپڑے لیے بھی تیار کرلیے۔ اب ولیمہ اور مہندی کے کھانے کے لیے لاکھوں روپے کی ضرورت تھی۔ ”وہ کہاں سے آئیں گے۔“ اس سوال کا جواب سوچتے سوچتے ریحانہ بیگم کے شیطانی دماغ میں ایک خیال آ گیا۔

ماجد الیاس نے جنرل اسٹور کی مرمت کروانے کے لیے پانچ لاکھ بینک سے نکلوائے تھے۔ پیسے گھر لا کر اس نے اپنی الماری میں رکھ دیے تھے۔ الماری کی ڈپلی کیٹ چابی مجاہد سے کہہ کر ریحانہ بیگم نے بنوالی تھی۔ موقع دیکھتے ہی ریحانہ بیگم نے روپے نکال لیے۔ تین دن بعد جب ماجد الیاس کو روپے کی ضرورت پڑی تو الماری خالی۔ ماجد الیاس کے پوچھنے پر ریحانہ بیگم صاف مکر گئی۔ پیسوں کی تلاش کے دوران ریحانہ بیگم کی بھتیجی کے لیے بنائی ہوئی خفیہ بری بھی ماجد الیاس کے سامنے آ گئی۔ نئی جنگ کا طبل بج گیا۔ ماجد الیاس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اگر مجاہد کی شادی ریحانہ نے اپنی بھتیجی سے کی تو ماجد الیاس گھر چھوڑ جائے گا۔ پیسوں کی چوری کا سودر الزام بھی اس نے ریحانہ کو ٹھہرایا اور وجہ مجاہد کی شادی کو قرار دیا۔ ریحانہ بیگم نے بھی جسارت سے خوب طعنے دیے۔ ریحانہ بیگم بھائی کے گھر جا کر بیٹھ گئی بعد کی شادی کی تاریخ طے کرآئی۔ جب منہدی ہی تا تمیں گھر سے ملحقہ گلی میں لگنا شروع ہوگئیں تو ماجد الیاس کو شادی کی خبر ہوئی۔ اس نے بیگ میں کپڑے اور ضروری سامان ڈالا ریحانہ بیگم کو دو ٹوک کہا۔ ”آج سے میرا تمہارا تعلق ختم۔ تمہیں اپنی بھتیجی عزیز ہے۔ بیٹا عزیز ہے تو ٹھیک اب اپنے

بچے خود پالنا۔ مجھ سے خرچے کی اُمید نہ رکھنا۔ میں آج سے مر گیا تم سب کے لیے۔" یہ کہہ کر وہ گھر سے نکل گیا۔

"امی ابا کو روک لو۔ ابا چلا گیا تو میرا علاج کون کروائے گا۔" امجد چیخا۔

"خود ہی دھکے کھا کر آجائے گا۔"

"ابا ابا مت جاؤ۔" آوازوں کی بازگشت پیچھے رہ گئی، ماجد الیاس آگے نکل گیا۔ ماجد الیاس نے اسٹور کے قریب فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ ماں کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے اس نے گھر سے مکمل طور پر رشتہ توڑ لیا۔ اسٹور کا ہو کر رہ گیا۔

اس کے اسٹور پر ہر قسم کے گاہک آتے تھے۔ سرکاری اسکول کی ایک بیوہ ہیڈ مسٹریس بھی سودا سلف لینے آتی تھی۔ اس سے ماجد الیاس کی بات چیت شروع ہو گئی پھر گھر آنا جانا ہو گیا۔ ماجد الیاس نے دوستوں کی موجودگی میں سادگی سے فردوس بیگم سے نکاح کر لیا۔ فردوس بیگم پڑھی لکھی سلجھی ہوئی خاتون تھی۔ وہ اچھی اور فرمانبردار بیوی ثابت ہوئی۔ ماجد الیاس کو گھر کا سکون ملا تو کبھی پلٹ کر واپس نہ گیا۔ وہ دوستوں سے کہتا۔ "اب پتا چلا ہے شادی کیا ہوتی ہے میں تو جنت میں رہتا ہوں۔"

دوسری طرف جہنم کے مکین غربت اور تنگدستی کا شکار تھے۔ امجد معذور، مجاہد بے روزگار تھا۔ صبا کے جہیز کا سامان سال بھر میں بک گیا اب تو بیچنے کے لیے بھی کچھ نہ بچا تھا۔ مجاہد نے ایک دوست کے ساتھ پراپرٹی کا کام شروع کر لیا۔ اب وہ گزارے لائق پیسا کمانے لگا مگر یہ پیسا میاں بیوی کے سیر سپاٹوں پر لگنے لگا۔ گھر میں بدستور تنگی تھی۔ ریحانہ بیگم اب پچھتانے لگی تھی۔ جس بہو کو بہت ارمانوں سے بیاہ کر لائی تھی جس کی وجہ سے اس نے شوہر کی پرواہ نہیں کی تھی جلد ہی اس بہو سے ریحانہ بیگم کی کھٹ پٹ شروع ہو گئی۔ پھوپی بھتیجی کی ایک ذات۔ یہ سیر تو وہ سوا سیر تھی۔ گھر کے حالات سے تنگ آکر درمیان والی بیٹی جس کا نام زارا تھا۔ ماجد الیاس کے گھر سوتیلی ماں کے پاس رہنے پہنچ گئی۔ مجاہد اسے چھوڑ گیا۔ فردوس بیگم نے زارا کو اپنی بیٹی کی طرح ٹریٹ کیا۔ وہ مہینے بھر رہ کر واپس چلی گئی۔ فردوس بیگم نے زارا کی شادی کے لیے امجد الیاس کو مشورہ دیا۔ "بیٹی کے فرض سے عزت کے ساتھ بری ہو جانا چاہیے۔" ماجد الیاس سمجھ گیا اور بھانجے کے ساتھ بیٹی کی نسبت طے کر دی۔ ریحانہ بیگم اس لیے خاموش ہو گئی کہ شادی کا خرچا امجد الیاس اٹھائے گا۔ زارا کی شادی کر دی گئی۔ امجد الیاس نے شادی کا سارا خرچا کیا لیکن

ٹریسا، مدر

1910-1997ء

عیسائی مبلغ جو سکوپجی (مقدونیا) میں پیدا ہوئیں۔ ان کا اصل نام اگنیس گونکھا بوجاکسیو (Agnes Gonxha Bejaxhiu) تھا۔ 18 سال کی عمر میں وہ راہبہ بن گئیں۔ بیس سال تک ملازمت کرنے کے بعد کلکتہ میں مفلوک الحال لوگوں کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے نہ صرف بھارت میں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی حادثات میں لوگوں کی جانیں بچانے کا کام کیا۔ انہیں ان کی خدمات کے صلے میں 1971ء میں پوپ جان ایوارڈ سے نوازا گیا۔ فلاح و بہبود کے کاموں کے سلسلے میں متعدد بار پاکستان کا دورہ کیا۔ پیرانہ سالی میں 1998ء میں انتقال کیا۔

مرسلہ: راحیلہ اشرف، کراچی

جلال بایار

(1884ء۔ 22 اگست 1986ء)

ترکی کے ایک سیاست دان اور تیسرے صدر، 1921ء سے 1937ء تک مختلف وزارتوں پر فائز رہے۔ 1923ء میں ترکی اور یونان کے مابین تبادلہ آبادی ہوا تو یہ اس کے نگران تھے۔ 1937ء میں وزیر اعظم بنے۔ 1938ء میں اتاترک کا انتقال ہوا تو استعفا دے دیا۔ 1946ء میں عدنان مینڈریس کے ساتھ مل کر ڈیموکریٹک پارٹی کی بنیاد رکھی۔ 1950ء کے انتخابات میں ان کی جماعت نے کامیابی حاصل کی تو عصمت انونو کی جگہ ترکی کے صدر منتخب ہوئے۔ مئی 1960ء میں جنرل جمال گورسل نے حکومت کا تختہ الٹ کر ڈیموکریٹک پارٹی کے تمام سرکردہ لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ عدنان مینڈریس اور ان کے دو رفقاء کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ جلال بایار کو بھی سزائے موت ہوئی مگر پیرانہ سالی کے باعث عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔ وہ جمہوریہ ترکیہ کے بانیوں میں سے تھے۔ استنبول میں انتقال ہوا۔

مرسلہ: نورین علی۔ کوئٹہ

ریحانہ بیگم اور مجاہد سے کلام نہ کیا۔ ریحانہ بیگم کی مالی مشکلات ختم نہ ہوسکی اب ریحانہ بیگم نے معذور بیٹے اور شوہر کی دوسری شادی کو جواز بنا کر امیر رشتہ داروں سے مدد مانگنا شروع کردی۔ اڑتی اڑتی خبریں ماجد الیاس تک بھی پہنچیں۔ اس نے رسوائی سے بچنے کے لیے امجد کو کریانہ کی دکان کھول دی کہ وہیل چیئر پر بیٹھ کر چلاتا رہے۔ چھ ماہ تک تو امجد نے دکان شرافت سے چلائی۔ گھر کا سودا اور دکان کا خرچا بھی نکالا پھر یار دوستوں کو بلانے لگا۔ آوارہ لڑکوں کو دکان پر بیٹھا دیکھ کر عورتوں نے آنا چھوڑ دیا۔ کمائی خراب ہونے لگی۔ ماجد الیاس کے سمجھانے پر امجد وقتی طور پر سنبھل گیا پھر اسے ایک آوارہ دوست کی وجہ سے شراب کی لت لگ گئی۔ اب دکان پر رات دس بجے کے بعد شراب کی محفل سجنے لگی۔ ساری رات پینے پلانے میں گزر جاتی۔ امجد مرزا غالب تو تھا نہیں کہ ساری رات شراب پی کے شعر کہتا اور اردو شاعری کا بے تاج بادشاہ بن جاتا۔ وہ بیچارہ تو معذوری کا غم شراب میں ڈبونا چاہتا تھا لیکن شراب میں اس کی دکان ڈوب گئی۔ سامان ختم ہوا تو ماجد الیاس نے مال ڈالنے سے صاف انکار کردیا۔ دکان چونکہ مکان کا حصہ تھی۔ بیٹھک میں بنائی گئی تھی۔ اس لیے امجد کے قبضے میں رہی۔ دوست سستی شراب لاتے۔ محفل جمتی اور رات گئے چلتی۔ اچانک ریحانہ بیگم کی ماں فوت ہوگئی۔ اب میکے میں پذیرائی بھی کم ہونے لگی۔ بھابیاں موڈ ہوتا تو منہ لگالیتیں۔ ریحانہ بیگم کو اس رویے کی عادت نہیں تھی وہ کلس کر رہ جاتی۔ مجاہد ایک بچی کا باپ بن گیا۔ زارا کے سسرال والوں سے جھگڑے شروع ہوگئے وہ بھی ماں کی طرح شوہر، پھوپی، دادی اور باپ کو کوستی رہتی۔ بھابیوں کے رویے سے بے زار ہوکر ریحانہ بیگم بھائیوں سے باپ کے مکان میں سے حصہ مانگنے لگی۔ سال بعد مکان بک گیا۔ ریحانہ بیگم کو حصہ مل گیا۔ بیس لاکھ کی رقم ریحانہ بیگم نے بینک میں رکھی اور مجاہد کو اے۔ ٹی۔ ایم کارڈ دے کر وقتاً فوقتاً پیسے نکلوانے لگی۔ مجاہد..... ماں کے پیسے نکلوا کر لاتا تو اپنے لیے بھی دل کھول کر بٹورتا۔ ریحانہ بیگم کو اے۔ ٹی۔ ایم کی رسید پڑھنا نہیں آتی تھی۔ اسے مجاہد کے کرتوتوں کا پتا چلا تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔ سال میں بیس لاکھ ختم ہوگئے۔ ریحانہ بیگم نے مجاہد کے لتے لیے۔ وہ ڈھیٹ بن کر گالیاں سنتا رہا۔ کئی دن تک ریحانہ بیگم مجاہد کو کوستی رہی۔ آخر کار امجد نے کہا۔ ”امی اس نے ابو کے پانچ لاکھ بھی تو نکالے تھے اپنی شادی کے لیے۔ اسے چوری کی عادت ہے۔“

”وہ میں نے نہیں امی نے چوری کیے تھے۔“ مجاہد تڑخ کر بولا۔

”بے غیرت ماں کو چور کہتا ہے۔ تیری شادی کے لیے نکالے تھے۔ اپنے سر پر سہرا نہیں سجانا تھا مجھے۔“ ریحانہ بیگم بولی۔ مکافات کے اس کھیل میں ریحانہ بیگم مسلسل ہار رہی تھی لیکن اسے ابھی تک احساس نہیں ہوسکا تھا کہ وہ کیا کررہی ہے۔ ایسے دگرگوں حالات میں بھی ریحانہ بیگم خاندان کی کوئی خوشی غمی نہ چھوڑتی۔ دور دراز شہروں میں جاتی سب سے چھوٹی بیٹی جس نے جوان ہوکر خوب رنگ روپ نکالا تھا اسے تیار کرکے ساتھ لے جاتی۔ کوئی رشتہ پوچھ لیتا تو میاں پر ڈال دیتی۔ جوان بیٹی کی شادی کی اسے چنداں کوئی فکر نہ تھی۔ فاریہ ہر وقت تیار ہوکر پھرتی رہتی۔ موبائل سے سیلفیاں بناتی رہتی۔ ٹک ٹاک پر ویڈیو بنا کر نیٹ پر ڈالتی جس پر ریحانہ بیگم نے اسے کبھی نہیں ٹوکا تھا۔ ایک دن اس کی ویڈیو ماجد الیاس کے سامنے آگئی۔ فاریہ کے ٹھمکے ماجد الیاس کی غیرت برداشت نہ کرسکی۔ اس نے ریحانہ بیگم کے سر پر پہنچ کر طوفان مچا دیا۔ ریحانہ بیگم کو تو نیٹ چلانا ہی نہیں آتا تھا اس کی بلا جانے ٹک ٹاک کیا ہے اس کے پاس تو نوکیا 3310 تھا۔ باپ کے ڈر سے فاریہ نے اکاؤنٹ ڈیلیٹ کردیا۔ ”اس کا رشتہ ڈھونڈ کر اپنے گھر کا کرو۔ اس سے پہلے کہ یہ کوئی چاند چڑھا دے۔“ ماجد الیاس نے ریحانہ بیگم سے کہا پھر بولا۔ ”تم سے پہلے کبھی کچھ ہوا ہے جو اب کوئی اُمید رکھوں۔ میں خود ہی کچھ کرتا ہوں۔“ ماجد الیاس یہ کہہ کر چلا گیا۔

امجد کی شراب نوشی کی لت نے گردوں پر اثر کرنا شروع کردیا اس کے گردے ڈائلیسز پر آگئے۔ مجاہد اسے ہفتے میں دو دفعہ سرکاری اسپتال لے جانے لگا۔ اسپتال سے واپسی پر ناتوانی اور کمزوری کے باعث امجد کی حالت خراب ہوتی تو وہ دہاڑیں مار مار کر روتا اور شراب کی ضد کرتا۔ اس کا رونا پیٹنا ریحانہ بیگم سے دیکھا نہ جاتا وہ خود جا کر اس کے لیے شراب لاتی اور اسے بوتل پکڑا دیتی۔ شراب پی کر وہ نشے میں چلا جاتا اور درد اسے محسوس نہ ہوتا۔ اسی دوران مجاہد کی بیوی چار بچوں کی ماں بن گئی۔ ساس بہو کی لڑائی ہاتھا پائی تک پہنچنے لگی تھی۔ زبانیں دونوں کی تیز دھار تلواریں تھیں۔ امجد پڑا گھر میں چلنے والے سارے ڈرامے دیکھتا رہتا لیکن وہ ایسا خاموش تماشائی تھا جس کی کوئی نہیں سنتا تھا۔ کیونکہ اس کی جیب خالی تھی فاریہ کی جس سہیلی نے اسے ٹک ٹاک کی راہ

رکھا ہوا تھا۔ فاریہ اس کے ساتھ مل کر دوبارہ ٹک ٹاک بنانے لگی۔ وہ چہرے کی بجائے پشت کر کے کھڑی ہوتی اور کبھی کیمرے کی طرف چہرہ کر کے کھڑی ہو جاتی۔ تاکہ پکڑی نہ جا سکے۔ فاریہ کی سہیلی رمل کی ٹک ٹاک کر لڑکوں سے دوستیاں تھیں۔ اس نے فاریہ کو بھی لڑکوں سے ملوادیا۔ فاریہ کی بے رنگ زندگی میں گویا بہار آگئی۔ آج تک کسی کے منہ سے اس نے اپنی تعریف نہیں سنی تھی۔ لڑکوں کی باتوں نے اسے آسمان پر چڑھادیا۔ رمل آوارہ اور شتر بے مہار لڑکی تھی۔ اس کے باپ کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ ماں کال گرل تھی۔ رمل نے لڑکوں کے ساتھ مل کر سازباز کی۔ فاریہ کے عوض لمبے نوٹ لے کر رمل نے فاریہ کو چارے کے طور پر پیش کردیا۔ فاریہ کو نشہ دے کر تین لڑکوں نے استعمال کیا جس کی رمل نے ویڈیو بنالی۔ فاریہ کو جب ہوش آیا تو اپنی لٹی ہوئی حالت کا علم ہوا۔ وہ خاموشی سے گھر آگئی۔ تین ماہ بعد اسے اپنے اُمید سے ہونے کا پتا چلا۔ اس نے رمل سے کہا تو رمل نے اپنی ایک واقف ڈاکٹر سے اس کا ابارشن کروادیا۔ اس واقعے کے بعد فاریہ کو چپ لگ گئی وہ خاموشی سے گھر میں بیٹھ گئی۔ ایک رشتہ کرنے والی کی توسط سے رشتہ آیا۔ مہمانوں کو دن گیارہ بجے کا ٹائم دیا گیا تھا۔ لڑکے کی ماں، خالہ، بہن اور رشتہ کرانے والی ٹوٹل چار عورتیں ریحانہ بیگم کے گھر آپہنچیں، جب فاریہ چائے لے کر آئی تو لڑکے کی خالہ نے اسے پہچان لیا اور شور مچادیا۔ لڑکے کی خالہ اسی پرائیویٹ کلینک میں نرس تھی جہاں رمل فاریہ کو ابارشن کے لیے لے کر گئی تھی۔ ”یہ ناجائز بچے کا ابارشن کروانے آئی تھی تمہاری بیٹی۔ اس گناہ کی پوٹ کو ہم اپنے گھر کی بہو نہیں بنائیں گے۔“ لڑکے کی نرس خالہ نے کہا۔

”بے شرم، بے غیرت لوگ ہو تم۔ ہم تو تمہیں خاندانی سمجھ کر آئے تھے۔ اپنی گندگی تم لوگ ہمارے سر منڈھنے لگے تھے۔ نہیں کرنا ہمیں ایسے گھٹیا لوگوں سے رشتہ۔“ لڑکے کی ماں کہہ کر چلی گئی۔ عورتوں نے بھی تقلید کی۔ ریحانہ بیگم غصے میں پاگل ہوگئی اس نے فاریہ کو مارنا شروع کردیا ساتھ مغلظات کی بارش کردی جب تھک گئی تو صوفے پر بیٹھ کر اونچی آواز میں رونے لگی۔ آج اسے احساس ہوا کہ ہر غلطی تو اس کی خود کی ہے۔ گھر کے ہر بگاڑ میں اس کا حصہ ہے۔ پھر لوگوں کی زبانوں کا خوف اسے ستانے لگا۔ وہ ہانپتی کانپتی اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی کمرے کا دروازہ بند کرکے اس نے کنڈی لگائی اور اپنے دوپٹے سے پھندا لگالیا۔ اس کا وزن زیادہ تھا پنکھے کی ہک زنگ آلود تھی۔ جب ریحانہ کا وزن پڑا تو پنکھا ریحانہ بیگم سمیت زمین بوس ہوگیا۔ پنکھے کا درمیانی حصہ ریحانہ بیگم کے چہرے پر لگا چہرہ... پچک گیا سر کھل گیا۔ دماغ کا بھیجا سر سے باہر نکل گیا۔ گرنے کی زور دار آواز سن کر امجد وہیل چیئر چلاتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ اور ماں کے کمرے کا دروازہ بجانے لگا۔ کوئی جواب نہ ملا تو مجاہد کی بیوی صبا ہمسائے سے دو جوان لڑکے بلا لائی ان دونوں نے زور لگا کر دھکے مار کر دروازہ توڑ دیا۔ کمرے کا منظر ایسا دلدوز اور عبرت ناک تھا کہ اندر نظر پڑتے ہی ہمسائے لڑکے لرز گئے۔ امجد غش کھا گیا۔ فاریہ ڈر گئی۔ صبا اور شازیہ حیران رہ گئیں ماجد الیاس کو خبر دی گئی وہ پہنچا ریحانہ بیگم کی حالت دیکھ کر وہ بھی پل بھر کے لیے ششدر رہ گیا پھر اس نے ایک چادر منگوا کر اس پر مجاہد اور بہوؤں کے ساتھ مل کر ریحانہ بیگم کا جسد خاکی ڈالا۔ ایک کپڑا لے کر سر باندھ دیا۔ اور فردوس کو فون کرکے بلالیا۔ فردوس نے میت نہلانے والی کے ساتھ مل کر سوکن کو غسل دیا۔ بہوؤں نے مدد کی۔ مغرب کے بعد ریحانہ بیگم کی تدفین کردی تاکہ پولیس کو خبر نہ ہوجائے۔

بارہ بجے مرنے والی ریحانہ بیگم کو عشاء سے پہلے قبر نصیب ہوگئی۔ اس کی ضد، اکڑ، نخوت، خوبصورتی اور تکبر پاش پاش ہوکر اسی کے ساتھ ابدی نیند سو گئے۔ گھر کا انتظام فردوس بیگم چلانے لگی۔ فردوس بیگم کے تدبر اور فراست سے گھر میں برکت اور خوشحالی آگئی۔ فاریہ کی سہیلی رمل نے فاریہ کو دوبارہ ٹک ٹاک کوئین بننے کا کہا اس کے انکار پر رمل نے نازیبا ویڈیو دکھا کر اسے بلیک میل کرنا شروع کردیا۔ فاریہ بدنامی کے ڈر سے رمل کے اشاروں پر چلنے لگی۔ فردوس بیگم نے کوشش کرکے فاریہ کا رشتہ بھی کردیا۔ لڑکا بحرین میں ملازمت کرتا تھا۔ سادگی سے شادی کردی گئی۔ فاریہ نے رمل کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ وہ شوہر کے ساتھ رخصت ہوکر بحرین آگئی۔ اس کا گھر بس گیا اور وہ رمل کے چنگل سے بھی آزاد ہوگئی۔ امجد کے گردے ناکارہ ہوگئے وہ بھی ماں کے پہلو میں جا سویا۔ اس کی بیوہ شازیہ اپنے میکے چلی گئی۔ گھر میں اب ماجد الیاس، فردوس، مجاہد، صبا اور مجاہد کے بچے رہ گئے۔ فردوس کے اچھے اخلاق کی وجہ سے صبا اس کی عزت کرنے لگی۔ ریحانہ بیگم کا بنایا مکان اس کی وفات کے بعد گھر بن گیا۔

++

عدالت

جناب مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!
واقعات ہر روز رونما ہوتے ہیں لیکن لوگ ان واقعات سے سبق نہیں سیکھتے۔ زارا اور محب کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ صاف صاف نشانیاں ہیں۔ ہر ایک کے لیے سبق ہے۔

سنبل
(کراچی)

زارا شرعی پردہ تو نہیں کرتی تھی مگر اسکارف کرتی تھی۔ اس کی بات چیت بھی لڑکوں سے نہیں تھی وہ ان سے فاصلہ رکھتی تھی۔ وہ بہت اچھی شاگرد تھی۔ اپنے پروفیسرز کی ہر دلعزیز شاگرد جس کی وہ برملا تعریف کرتے تھے۔ اپنے مضامین کی وہ پہلے سے ہی مختلف کتابوں سے تیاری کرتی تھی۔ اور پھر وہ پروفیسر سے لیکچرز کے مطابق Cross Questioning کرتی کچھ پروفیسرز محظوظ ہوتے اور کچھ چڑ جاتے، جھنجلا جاتے تھے۔ اس کے اسائنمنٹ کلاس میں سب سے اچھے ہوتے تھے۔ اس کی Presentation کے اس کے پروفیسر ہی نہیں اس کے کلاس فیلوز Class fellows بھی مداح تھے۔ غرض وہ کلاس کی سب سے بریلینٹ شاگرد تھی۔ اس کے اکثر Fellows اسے پسند کرتے تھے کیونکہ وہ اکثر ٹاپک کو سمجھنے میں ان سب کی مدد کردیتی تھی۔ اس میں لڑکے اور لڑکیوں کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ وہ لڑکوں کو بھی ایک فاصلے پر رہتے ہوئے پڑھائی میں مدد کردیا کرتی تھی۔ اس کے نوٹس تو ہر کسی کو آسانی سے مل جاتے تھے مگر پھر بھی وہ کلاس کی سب سے زیادہ نمبر لانے والی لڑکی تھی، گولڈ میڈل تو اس کا اس بار پکا تھا۔

مگر جبران کو اس سے چڑ تھی، خدا واسطے کا بیر تھا۔ وہ انٹرمیڈیٹ کلاس کا ٹاپر رہا تھا اور ہمیشہ اپنے اساتذہ کا سر چڑھا تھا اور ایسا نہیں تھا کہ اس حیثیت میں اب بھی کوئی فرق آیا تھا۔ زارا کی طرح وہ بھی اساتذہ کا پسندیدہ طالب علم تھا مگر زارا اس سے آگے تھی، اب وہ کلاس میں ٹاپ کرتی تھی۔ اس کا اور جبران کا ہمیشہ کانٹے کا مقابلہ رہتا تھا مگر وہ بہت سی چیزوں میں زارا کا مقابلہ نہ کرپاتا تھا، زارا تو ہرفن مولا تھی۔ وہ بہترین مقرر تھی۔ بیت بازی میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ تحریری مقابلے اور شاعری ہر میدان میں آگے تھی۔ اس کے آرٹیکلز مختلف اخبارات میں چھپتے تھے اور افسانے مختلف رسالوں میں۔ غرض کوئی میدان اس کی دسترس سے باہر نہیں تھا۔

جبران اکثر اس پر جملے کستا تھا مگر وہ طرح دے جاتی تھی اور کبھی کوئی کرارا جواب بھی دے دیتی تھی جو کہ جبران کو دنوں کے لیے آگ میں جھونک دیتا تھا۔ ایک بار وہ اپنی دوستوں کے ساتھ کینٹین میں بیٹھی ہوئی تھی کہ برابر والی جگہ پر جبران اور اس کے دوست آکر بیٹھ گئے۔ ان لوگوں کو بیٹھا دیکھ کر جبران کے دوست سرمد کو مذاق سوجھا اور اس نے جبران سے کہا۔

''یار! تجھے دکھ تو ہوتا ہوگا۔'' سرمد نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''کس بات کا؟'' جبران نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

''پہلی پوزیشن کے چھن جانے کا۔'' سرمد نے شرارت سے کہا۔

''وہ تو اب بھی واپس مل سکتی ہے بس اساتذہ کی چاپلوسی، ان کی للو پچو اور ان کے جوتے سیدھے کرنے پڑیں گے۔'' جبران نے نفرت سے زارا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جب بارہ سال یہی کیا ہے تو ان چار، چھ سالوں میں کرنے میں کیا حرج ہے۔'' زارا نے بڑے ٹھنڈے لہجے

UrduNovelsHub.com

ں کہا اور جبران کھول گیا۔
''شٹ اپ۔'' وہ پھنکارا۔
''Same to you''۔ زارا نے کہا اور جبران گویا مارنے کو اس کی جانب لپکا۔ مگر اسے اس کے دوستوں نے پکڑ لیا۔

اس بات کی شکایت کسی نے ڈپارٹمنٹ ہیڈ کو کر دی ر دونوں کی پیشی ہوئی۔

تمام بات سن کر مسز نزہت الیاس نے جو کہ پارٹمنٹ ہیڈ تھیں انہوں نے جبران سے کہا۔ ''آپ ارے اساتذہ پر Favouritism کا الزام لگا رہے یں بلکہ خوشامد پسند ہونے کا الزام لگا رہے ہیں۔'' جبران کو لینے کے دینے پڑ گئے۔

''نہیں میم! وہ سب مذاق تھا۔'' اس نے جلدی سے ہا۔

''اگر یہ مذاق تھا تو انتہائی بے ہودہ مذاق تھا۔ آپ ک معافی کی درخواست لکھیں اور اس پر اپنے تمام پروفیسرز کے دستخط کروا کر لائیں اور مجھے دیں۔'' جبران کو یہ سب کرنا اس میں جو شرمندگی اور خجالت ہوئی وہ الگ۔ اس پر دوستوں کے شوخ جملے۔ اس کی زارا سے نفرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

☆☆☆

زارا اور محب دو ہی بہن بھائی تھے۔ یہ لوگ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والدین دونوں ہی جاب کر کے ان کو پڑھا رہے تھے۔ انہوں نے ان دونوں کو بہت محبت کر کے پالا تھا۔ ان کی بہترین تربیت کی تھی وہ دونوں ٹیوشنز پڑھا کر اپنی تعلیم کے کافی اخراجات نکال لیتے تھے۔ محب ایک انجینئرنگ یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ دونوں بہن بھائی میں بہت محبت تھی۔ یہ دونوں ہمہ وقت ایک دوسرے کے لیے جان دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔

محب نے اپنے ٹیوشنز کے پیسوں سے ایک بی سی ڈالی تھی تاکہ وہ ایک سیکنڈ ہینڈ بائیک خرید سکے۔ یہ بات اس کے دوست معظم کو معلوم تھی۔ جس دن اس کی بی سی نکلی اس دن وہ بڑا خوش تھا اور کیوں نہ ہوتا اس کو شہر کے مختلف علاقوں میں ٹیوشن پڑھانے جانا ہوتا تھا اور وہ بھی بسوں سے لٹک کر اور پہلے شاید بھی بس کا سفر سستا پڑتا تھا اب تو ہوشربا مہنگائی نے علاوہ انسانی جان کے ہر چیز مہنگی کر دی تھی۔ وہ جلد از جلد

بائیک لینا چاہتا تھا۔ اس دن معظم اس کے پاس آیا اور اس سے وہ رقم بطور قرض مانگ لی۔ کسی اشد ضرورت کا کہہ کر محب دینا نہیں چاہتا تھا مگر اس کی تربیت بہت اچھے خطوط پر ہوئی تھی پھر بھی اس نے پوچھا۔

"تجھے پتا ہے یار! مجھے بائیک کی کتنی اشد ضرورت ہے میں نے اسی لیے یہ بی سی ڈالی تھی۔ پیسے تو لے لے مگر بتا دے کب تک واپس کرے گا۔" محب نے پوچھا۔

"بس جلد ہی ایک دو مہینے کے اندر۔ مجھے تیری مجبوری کا پتا ہے اگر اشد ضرورت نہ ہوتی تو میں کبھی بھی تجھ سے پیسے نہ مانگتا۔" معظم نے کہا اور یوں محب نے اسے اپنی محنت سے جمع کی ہوئی رقم اس کے حوالے کر دی۔

اور خود ہر اتوار بازار سے اپنے لیے بائیک دیکھنے پابندی سے جانے لگا مگر دو سال گزر چکے تھے ابھی تک وہ ایک دو مہینے نہیں آئے تھے۔ محب ہر مہینے تقاضہ کرتا اور معظم اسے ٹال دیتا تھا۔

☆☆☆

جبران کو زارا سے شدید نفرت تھی مگر اس نے کبھی بھی اس سے انتقام لینے کا نہیں سوچا تھا۔ زبانی منہ ماری خواہ کتنی ہی کر لیتا مگر اس واقعے نے اسے بہت زیادہ طیش دلا دیا تھا۔ وہیں اس کے دوستوں نے بھی اسے چڑھانا شروع کر دیا۔

"اس چھٹانک بھر کی لڑکی نے تیری پوزیشن تو چھینی ہی چھینی تھی مگر اب تو کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔ سارے پروفیسرز اور Fellows کے سامنے جو بے عزتی سہنی پڑی وہ الگ ہے۔" اس کے دوست شکیل نے کہا۔

"بے عزتی اسے اپنے کہے الفاظ ہی کی وجہ سے اٹھانا پڑی زارا کی وجہ سے نہیں۔" اس کے ایک معقول دوست راحم نے کہا۔

"اوہ! مولوی تو اپنا واعظ پھر کبھی کر لینا۔ الفاظ کہے تو زارا کو ہی تھے نہ بتاتی چیئرپرسن کو۔" شکیل نے چڑ کر کہا۔

"وہ لڑکی تھی یہ بار نے کے لیے اس کی جانب نہ بڑھتا تو بات اتنی نہ بڑھتی اور چیئرپرسن تک نہ پہنچتی۔" راحم نے پھر زارا کا دفاع کیا۔

"تجھے اتنا برا کیوں لگ رہا ہے تیری بہن لگتی ہے کیا؟" شکیل نے تپ کر کہا۔

"بالکل لگتی ہے وہ قابل فخر لڑکی ہے اس کا بھائی بننا میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔" راحم نے کہا اور وہ سب راحم کے پاس سے واک آؤٹ کر گئے۔ راحم نے ان سب کو دکھ سے دیکھا اسے پتا تھا کہ اب یہ سب زارا کے خلاف کوئی سازش تیار کریں گے مگر اسے نہیں پتا تھا کہ وہ جبران کو اس حد تک جانے کے لیے تیار کر لیں گے۔ راحم کے پاس سے اٹھ کر وہ لوگ الگ جا کر بیٹھ گئے اور وہاں جا کر جبران کو ان لوگوں نے اس حد تک بھڑکا دیا کہ انہوں نے زارا کے خلاف ایک سازش تیار کر لی جو کہ بہت خطرناک تھی۔

☆☆☆

آج پھر محب، معظم کے پاس آیا تھا۔

"یار۔ تم نے ایک دو مہینے کے وعدے پر پیسے لیے تھے۔ اب دو سال ہو گئے۔ اب تو واپس کر دو۔" محب نے تیزی سے کہا۔

"یار! میں تو ذلیل ہو کر رہ گیا ہوں تم سے پیسے لے کر بہت تھرڈ کلاس ہو تم۔ ہوں گے تو دے دوں گا۔" وہ روکھے پن سے بولا۔

محب نے اسے دکھ سے دیکھا، پیسے لیتے وقت معظم کے لہجے میں جو شہد تھا وہ ان دو سالوں میں زہر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ پیسے دینا چاہتا ہی نہیں تھا۔

معظم ایک بدطبیعت انسان تھا۔ اسے جب سے پتا چلا تھا کہ محب نے بی سی ڈالی ہوئی ہے تب ہی سے اس کی نظر اس کے اس پیسے پر تھی اور اسے کوئی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ اس نے ان پیسوں سے اپنے کمرے کی سیٹنگ میں کچھ تبدیلیاں کی تھیں اور باقی پیسے دوستوں اور عیاشی میں اڑا دیے تھے۔ اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا یہ پیسا واپس کرنے کا۔ جبکہ محب کو شدید ضرورت تھی بائیک کی مگر وہ مجبور تھا۔

☆☆☆

جبران اور اس کے دوست زارا کو سزا دینا چاہتے تھے اس جرم کی جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔

مرد کو عورت کے لیے ایک ہی سزا سمجھ آتی ہے۔ اسے پامال کر دینا تاکہ وہ خود اپنی ہی نظروں میں گر جائے۔ ایسا ہی سب کا پلان تھا۔ انہوں نے سوچا کہ زارا کو اغوا کر کے اسے دو چار دن پاس رکھ کر اس کی عزت کا جنازہ نکال لیں گے۔ اس کی تصاویر اور وڈیوز بنا کر اسے زبان بندی پر مجبور کریں گے اور بعد میں اس کی تصاویر اور وڈیوز لیک کر کے اسے خودکشی پر مجبور کریں گے۔

انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ کسی کو اغوا کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے اس لیے انہوں نے بہت پلاننگ کی تھی۔

انہیں پتا تھا زارا جان دے دے گی مگر زبردستی ان لوگوں کے

ساتھ جانے پر راضی نہ ہوگی اسی لیے انہوں نے کلوروفارم کا انتظام کیا۔ کلوروفارم اینستھیزیا (Anesthesia) کے کام آتا ہے جو کہ انسان کو سیکنڈز کے اندر بے ہوش کر دیتا ہے۔ اس کے استعمال میں خاص احتیاط کی جاتی ہے کیونکہ اس کی معمولی سی بھی زیادتی انسان کو تاعمر معذور کرسکتی ہے اور موت کے گھاٹ بھی اتار سکتی ہے۔ اس کے لیے خاص ماہر ہوتے ہیں جنہیں Anesthesiologist کہتے ہیں اور وہ مریض کی حالت کے مطابق کلوروفارم کی مقدار تجویز کرتا ہے۔

☆☆☆

اس روز زارا صبح کی گئی رات گئے تک واپس نہیں آئی۔ اس کے گھر والے اسے ڈھونڈتے رہے۔ محلے والے اور دوست احباب سب ان کے ہمراہ تھے۔ اس کی تمام دوستوں سے معلوم کیا گیا یونیورسٹی سے نکلنے کا وقت۔ تمام ہسپتالوں کے شعبہ حادثات دیکھے گئے پولیس میں رپورٹ بھی درج کروادی گئی مگر زارا کی کوئی خیر خبر نہیں مل سکی۔ وہ دن اور پوری رات ان لوگوں پر بڑی بھاری گزری۔ زارا کی ماں کا رو رو کر برا حال تھا۔ دوسری طرف جتنے منہ اتنی باتیں اکثریت دبی دبی سرگوشیوں میں زارا کے کسی کے ساتھ بھاگ جانے پر متفق تھے۔ دوسرے دن گیارہ بجے کے قریب پولیس نے ان باپ بیٹے کو پولیس اسٹیشن بلوایا اور ایک لاش کی شناخت کے لیے کہا وہ دونوں دھڑکتے دلوں اور لرزتے قدموں سے اسٹیشن پہنچے تو وہ لاش زارا کی ہی تھی۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا گیا۔ ان تینوں کی حالت بہت بری تھی لاش بالکل درست حالت میں تھی کسی ایکسیڈنٹ اور کسی زیادتی کا کوئی نشان بظاہر نہیں تھا تو کیا زارا واقعی گھر سے فرار ہوئی تھی۔ اب یہ ایک سوالیہ نشان تھا حالانکہ کوئی جلتے توے پر بیٹھ کر بھی یہ کہتا تو اس کے گھر والے اس بات سے قطعی انکاری تھے بہر حال اب انتظار پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا تھا۔ اس سے اصل بات کھلنی تھی۔

جب تک پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نہیں آئی زارا کے گھر والے سولی پر لٹکے رہے۔ لوگوں کی مشکوک نظروں اور دبی دبی سرگوشیوں کو برداشت کرتے رہے۔ جس دن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آئی اس دن ان تینوں نے تمام لوگوں کے سامنے جو گھر میں موجود تھے کھڑے ہو کر نماز شکرانہ ادا کی وہ تمام نظریں شرمندگی سے زمین میں گڑ گئیں۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق زارا کی موت ناک کے ذریعے کلوروفارم زیادہ Anhale کرنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ پولیس کے مطابق کسی نے زارا کو اغوا کرنے کے لیے کلوروفارم سنگھایا مگر وہ کون تھے Anesthesiologist جو کہ رومال رکھتے ہی ہٹا لیتے کیونکہ کسی کی بے ہوشی کے لیے بس اتنا ہی کلوروفارم کافی ہوتا ہے مگر انہوں نے مستقل رومال رکھا رہنے دیا جس سے زارا کی موت واقع ہوگئی۔ اگر وہ زندہ بھی رہتی تو بھی معذور تو ضرور ہو جاتی۔

ہماری پولیس دنیا کی ذہین ترین پولیس ہے یہ چاہیں تو لمحوں میں کیس حل کرلیں اگر نہ چاہیں تو......!

زارا کیس کی تفتیش میں پولیس نے اس کی یونی فیلوز اور دوستوں سے بات کی تو یہ بات صاف ہوگئی کہ اس کا کسی سے کوئی افیئر نہیں تھا اس کی فون ہسٹری سے بھی ایسا کوئی کلیو ہاتھ نہیں لگا۔ ہاں یہ ضرور پتا چل گیا کہ جبران نامی کسی لڑکے سے اس کی کچھ دن پہلے منہ ماری ہوئی تھی۔ جس کی شکایت کسی نے ڈپارٹمنٹ ہیڈ کو کردی تھی اور پھر اس بات پر جبران کو تمام پروفیسرز سے معافی بھی مانگنی پڑی تھی۔ اس سلسلے میں راحم نے بھی انہیں ان کے کسی خفیہ سازش میں ملوث ہونے کی اطلاع دی تھی۔ پولیس نے جبران کو اور اس کے کچھ دوستوں کو گرفتار کرلیا۔ اچھے اچھے بڑے بڑے پلان بنانے والوں کی اوقات یہ ہوتی ہے کہ وہ چھتر پڑنے پر الف سے لے کر ے تک ساری کہانی اگل دیتے ہیں۔ یہی اس کیس میں بھی ہوا۔ جبران اور اس کے دوستوں نے سب بتادیا کہ کس طرح انہوں نے زارا کو اغوا کرنے کی کوشش کی مگر کلوروفارم کی زیادتی سے اس کی موقع پر ہی موت واقع ہوگئی اور وہ اسے ایک سنسان جگہ پر ڈال کر فرار ہوگئے۔ جبران اور اس کے ساتھیوں کو جیل بھیج دیا گیا انہیں دفعہ 302 کے تحت چالان ہوئی اور اس کا کیس چلنے لگا۔

☆☆☆

دوسری جانب گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا کسی کو احساس نہیں تھا کہ انہوں نے اپنی جوان بیٹی کو کھویا تھا اکثریت کراچی سے باہر والوں کی تھی جو کہ دور سے آنے سے بچنے کے لیے چالیسویں تک کے لیے رک گئے تھے۔ ان سب کے لیے تین وقت کا کھانا۔ گھر میں تنگی ہونے لگی۔ تب محب ایک بار پھر معظم کے پاس گیا اور اس سے درخواست کرنے لگا کہ معظم اسے اس کے پیسے واپس کردے۔

"معظم بھائی! اب بہت بڑی مشکل آ پڑی ہے۔ تمہیں تو پتا ہے گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے اور پیسے کی کوئی سبیل نہیں ہے میرے پیسوں کا کہیں سے انتظام کردو۔" محب نے لجاجت سے کہا۔

"میرے پاس نہیں ہیں پیسے اور سنا ہے تمہاری بہن......" اس کی بات درمیان میں ہی تھی کہ محب نے اسے روک دیا۔

"معظم! میری بہن کے بارے میں بات نہیں کرو۔ میرے پیسے کا انتظام کرو۔" اس نے دوٹوک کہا شدت برداشت سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"میں کیا تمہاری بہن کے بارے میں تو سارا شہر ہی بات کر رہا ہے۔ سنا ہے کسی کے ساتھ بھاگ......" ابھی اس کی بات درمیان میں ہی تھی کہ محب نے "بس" کہتے ہوئے اس کا گریبان پکڑ لیا، معظم اس حملے کے لیے تیار تھا کہ اس نے جان کر محب کو اشتعال دلایا تھا۔ اس نے سائیڈ پر پڑا ہوا گلدان اٹھا کر محب کے سر پر دے مارا گل دان ماربل کا تھا محب لڑکھڑا کر پیچھے کانچ کی میز پر گرا جس کا کونا اس کے سر سے ٹکرایا اور اس کے سر سے بھل بھل خون بہنے لگا۔ معظم گھبرا گیا اس کے گھر کے افراد بھی شور اور دھماکے کی آواز پر تیزی سے بھاگتے ہوئے اس کے کمرے میں آئے جہاں معظم کے ہاتھ میں ماربل کا گلدان تھا۔ محب کے سر سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا اور وہ تیزی سے اپنے ہوش وحواس کھو رہا تھا۔ اس کی بھابی سب سے پہلے گھبرا گئی۔

"معظم! تم نے اسے مار ڈالا۔" وہ خوف زدہ آواز میں بولی۔

"نہیں بھابی! میرا ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا غیر ارادی طور پر فوری اشتعال کی وجہ سے اس نے میرا گریبان پکڑا تھا تو......" وہ گھبراہٹ میں بے ربط جملے بولنے لگا۔

"کیسا اشتعال۔ تم نے اس کی ضرورت کے پیسے اس سے دھوکے سے لے کر للّے تللّے میں اڑا دیے۔ اب اس کے گھر میں پریشانی ہے تو بھی اس کے پیسے دینے کے بجائے اس پر حملہ کر دیا بلکہ اس کی مظلوم بہن پر رکیک الزام لگانے کی کوشش کی جس پر اسے غصہ آیا تو تم اقدام قتل پر اتر آئے۔" امی تو صدمے میں چلی گئی تھیں بھابی غالباً ان کی باتیں سن چکی تھیں۔

"اب کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤ۔ ان کے گھر پہلے ہی مصیبت ٹوٹی ہے۔ اسے کچھ نہ ہو جائے۔" بھابی نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ اس دوران معظم کے بھائی صارم جھک کر محب کو دیکھنے لگے، پھر وہ گھبرا کر اس کے Vital Signs چیک کرنے لگے اور پھر انہوں نے بڑی ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ مر چکا ہے۔" اس کی بھابی، بہن اور ماں تینوں نے اپنے دوپٹے منہ پر رکھ کر اپنے اندر سے ابلنے والی چیخوں کو روکا۔

معظم کے ہاتھ سے گلدان گرا تھا۔ اب کیا ہوگا ایک بڑا سا سوالیہ نشان ان کے سامنے تھا۔

☆☆☆

بائل کا کلیہ

گیسوں کے حجم اور دباؤ کا تعلق ظاہر کرنے کا کلیہ جسے رابرٹ بائل نے 1662ء میں پیش کیا۔ اس کے مطابق اگر درجہ حرارت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو تو کسی گیس کے حجم میں تبدیلی دباؤ کے الٹ متناسب ہوتی ہے۔ یعنی درجہ حرارت ایک ہی رہے تو کسی گیس کے حجم اور دباؤ کے حاصل ضرب میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

مرسلہ: نعمان اصغر۔ جہلم

بائی والوز

لوتھڑے کی طرح کے آبی جانوروں کا نام جو دو سیپیوں کے درمیان میں رہتے ہیں۔ یہ سیپیاں آپس میں اس طرح جڑی ہوتی ہیں گویا ایک ہی خول ہو لیکن ضرورت کے وقت یہ جانور ان کو کھول اور بند کر سکتے ہیں۔ بند حالت میں بھی ہر سیپی میں ایک سوراخ ہوتا ہے جو لعاب سے بند اور کھل سکتا ہے۔ اسی ہوا سے یہ جانور سانس لیتا ہے اور اسی سوراخ کی وجہ سے اس کو بائی والو یعنی دو ڈھکنوں والا کہتے ہیں۔ دوہری سیپیوں والے بے شمار جانور ہیں جن میں موتیا جانور مشہور ہے۔ ان جانوروں کی سیپیاں اندر سے نہایت چمکدار اور شوخ رنگ کی ہوتی ہیں اور گراں قیمت پر بکتی ہیں۔ ان سے چاقوؤں کے دستے، بٹن اور دیگر اشیاء بنائی جاتی ہیں۔

مرسلہ: اریبہ شکیل۔ سیالکوٹ

محب اپنی امی سے کہہ کر نکلا تھا کہ وہ پیسوں کا انتظام کرنے جارہا ہے۔ انہیں پتا تھا کہ وہ معظم سے ہی اپنے پیسے مانگنے گیا ہوگا مگر صبح کا نکلا ہوا جب وہ رات تک واپس نہ آیا تو انہوں نے محب کے والد کو بتایا۔ انہوں نے معظم کو فون کیا مگر اس نے صاف انکار کردیا کہ محب تو اس کے پاس آیا ہی نہیں ہے۔ اب ان دونوں کو تشویش ہوئی انہوں نے محب کے موبائل پر کال کی تو بیل جارہی تھی مگر کال ریسیو نہیں ہورہی تھی۔ انہوں نے پھر پولیس میں رپورٹ کی اور موبائل کی لوکیشن سے ہی محب کی ڈیڈ باڈی ملی۔ رپورٹ میں پہلے ہی محب کے والدین نے معظم کا نام لیا کیونکہ اس کے ابو کو معظم کی آواز فون کرنے پر گھبرائی ہوئی لگی تھی اس لیے انہوں نے معظم کے گھر پر ریڈ کی اور تلاشی کے دوران کارپٹ پر لگے خون کے دھبوں جنہیں مٹانے کی کوشش کی گئی تھی سے معظم کو گرفتار کرنے کا ثبوت مل گیا۔ باہر لگے ایک CCTV کیمرے میں ان دونوں بھائیوں کو گاڑی میں محب کی لاش لے جاتے ہوئے بھی دیکھا گیا تھا مگر جب بڑے بھائی کو گرفتار کیا گیا تو بھابی پھٹ پڑی اور اس نے سارا کچا چٹھا کھول ڈالا مگر بہرحال جرم کے بعد کی معاونت کے سلسلے میں اسے بھی لے جایا گیا۔

دوسری طرف بیٹی کے بعد بیٹے کی بھی موت اور وہ بھی قتل۔ محب کے والد برداشت نہ کرسکے انہیں ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ جانبر نہ ہوسکے۔ دوسری جانب باپ اور بیٹے کا ایک ساتھ جنازہ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ مگر کچھ لوگ بڑے سخت دل بلکہ پتھر دل ہوتے ہیں کسی نے ایسے میں بھی شوشہ چھوڑا کہ "پتا نہیں اس عورت کے ایسے کون سے گناہ ہیں ایک ہفتے میں پورا گھر تباہ ہوگیا۔ یہ اکیلی بچی ہے۔"

ابھی ہفتے قبل ہی تو لاڈلی بیٹی کو سپرد زمین کیا گیا تھا اور اب محبوب شوہر اور لاڈلا بیٹا اور اس پر ایسے دل چیر دینے والے مکالمات وہ اپنا ذہنی توازن نہ برقرار رکھ سکیں اور پاگل ہوگئیں۔ ان کے قریبی رشتے داروں نے انہیں پاگل خانے بھیجا اور ان کے گھر پر قبضہ کرلیا اب ان کی بیٹی اور بیٹے کے مقدمات کی پیروی کرنے والا کوئی نہ بچا تو جبران اور معظم کے گھر والوں نے وکیلوں کو پیسے کھلائے ثبوت خریدے اور باعزت بری ہوگئے۔

☆☆☆

بظاہر لگتا ہے یہاں کہانی ختم ہوگئی، نہیں بلکہ ایک عدالت اوپر بھی لگتی ہے جہاں نہ وکیل ہوتے ہیں نہ گواہ۔ نہ ثبوت ہوتے ہیں نہ جج اور پھر بھی فیصلے کھرے ہوتے ہیں۔

صائب ہوتے ہیں کہتے ہیں قتل کرنا آسان ہوتا ہے اسے ہضم کرنا مشکل ہوتا ہے۔ جبران خود بھی ایک اچھی پڑھی لکھی، تہذیب یافتہ فیملی سے تھا اسے یونی میں سنگت خراب ملی کہنے کو تو اس کے گھر والوں نے اسے اس کیس سے بری کروالیا تھا مگر انہوں نے جبران کو معاف نہیں کیا تھا۔ اس وجہ سے وہ ڈرگز لینے لگا۔ ایسے ہی ایک دن ڈرگز لے کر یہ سارے دوست رات میں ہائی وے پر Over Speeding کے ساتھ شعبدے بازیاں بھی کررہے تھے۔ کوئی لیٹ کر بائیک چلا رہا تھا کوئی کھڑا ہوکر اور کوئی ہنڈل چھوڑ کر اسی میں جبران کی بائیک سامنے سے آتے ٹرک سے ٹکرا گئی۔ جسم کی ہڈیاں جو ٹوٹیں سو ٹوٹیں۔ اس کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی اور پورا چہرہ ایسا پھٹا کہ چہرے کی ہڈیاں نظر آنے لگیں۔ اس کی ہڈیوں کے کئی آپریشن ہوئے اور چہرے کی بھی کئی سرجری ہوئیں مگر نہ بگڑا ہوا چہرہ پہلے جیسا ہوسکا نہ آنکھ ٹھیک ہوئی۔ پیر میں لنگ آگیا اور بایاں ہاتھ بہت کم حرکت کے قابل بچا چہرہ تو اتنا مسخ ہوچکا تھا کہ لوگ اس سے ملتے ہوئے خوف کھانے لگے تھے۔ آج وہ نشان عبرت ہے۔

معظم تو پہلے ہی آپے سے باہر تھا۔ باہر آتے ہی اس نے بھابی کی زندگی عذاب بنادی کیونکہ بھابی نے اپنے شوہر کو بچانے کے لیے اس کے خلاف گواہی دی تھی مگر یہاں اس کا بھائی آڑے آیا اور بیوی بچے کو لے کر الگ ہوگیا۔ اب اس پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ وہ نشہ بھی کرنے لگا۔ ساتھ جوا بھی کھیلتا تھا اور ریڈ لائٹ ایریا بھی جانے لگا اب اس کی غنڈہ گردی بڑھنے لگی تھی جوے کے لیے اسے پیسے چاہیے ہوتے تھے تو وہ ڈکیتیاں ڈالنے لگا۔ موبائل اور بائیک چھیننے کا کام کرنے لگا اور چونکہ یہ کام بغیر کسی سرپرستی کے کررہا تھا اس لیے جلد ہی پولیس کی نظروں میں آگیا۔ پولیس نے اسے ٹریس کرنا شروع کردیا اور بالآخر وہ ایک ان کاؤنٹر میں مارا گیا۔ یوں جان کے بدلے میں خود بھی جان سے گیا۔

محب کی والدہ بس پاگل خانے میں سات آٹھ ماہ زندہ رہیں اور راہی عدم ہوئیں۔ ان کے گھر پر قبضہ کرنے والوں میں آپس میں لڑائی جھگڑے بڑھے تو گھر بکا اور سب ختم ہوگیا۔ یوں یہ کہانی اپنے اختتام کو پہنچی۔

++

urdunovels.com

ایک شام دو زمانے

محترم مدیر
السلام علیکم!
اس بار ایک ایسی سچ بیانی بھیج رہا ہوں جو خود میں منفرد ہے۔ یہ کوئی تخلیقی کہانی نہیں، صرف الفاظ کا پیرہن دے کر ابھارا ہے۔ آپ کو بھی لطف آئے گا کیونکہ اس میں ہم بھی ہیں اور آپ بھی یعنی جنریشن ایکس اور جنریشن زی آمنے سامنے ہیں۔ اُمید ہے قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

ارشاد العصر جعفری
(مظفرگڑھ)

شام آہستہ آہستہ صحن میں اتر رہی تھی۔ آسمان پر ہلکی سی سنہری روشنی باقی تھی، ہوا میں دن بھر کی گرمی کی تھکن گھلی ہوئی تھی۔ سلمان چارپائی پر نیم دراز تھا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا جو اب ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔ سامنے اس کا بیٹا حمزہ کرسی پر بیٹھا تھا، مگر اس کی نظریں موبائل کی اسکرین میں الجھی ہوئی تھیں۔

سلمان نے کچھ دیر اسے دیکھا، پھر آہستہ سے بولا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں ابو...... بس ایک ویڈیو ہے۔" حمزہ نے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔

سلمان ہلکا سا مسکرایا۔ اسے یاد آیا اس کے زمانے میں ایک ویڈیو دیکھنے کے لیے پورا محلہ اکٹھا ہو جاتا تھا۔ وی سی آر کرائے پر آتا تھا۔ فلم شروع ہونے سے پہلے ہی دل دھڑکنے لگتا تھا۔

"ہم جب تمہاری عمر کے تھے نا......" سلمان نے بات شروع کی پھر خود ہی رک گیا۔ وہ جانتا تھا یہ جملہ اکثر نوجوانوں کو بور کر دیتا ہے مگر آج نہ جانے کیوں اس کا دل چاہا کہ وہ کہے۔

"ہم جب تمہاری عمر کے تھے، تو شام ایسے ہی صحن میں گزرتی تھی۔ نہ موبائل تھا، نہ انٹرنیٹ۔ بس دوست ہوتے تھے، گلی ہوتی تھی اور آسمان۔"

حمزہ نے اسکرین سے نظریں ہٹا کر باپ کی طرف دیکھا۔ "پھر آپ لوگ کیا کرتے تھے؟"

سلمان کو اچھا لگا کہ سوال آیا۔ اس نے کپ رکھ دیا۔

"کرتے کیا تھے...... بس کھیلتے تھے۔ کرکٹ، گلی ڈنڈا، چھپن چھپائی اور کبھی کبھی بس یوں ہی چھت پر لیٹ کر ستارے گنتے رہتے تھے۔"

حمزہ ہلکا سا ہنسا۔ "ستارے گنتے تھے؟ واقعی؟"

"ہاں واقعی۔ اور ہمیں لگتا تھا کہ شاید ہم آخری نسل ہیں جو آسمان کو اس طرح دیکھ رہی ہے۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔ ہوا ذرا ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

سلمان نے بیٹے کو غور سے دیکھا۔ اس کے ہاتھ تیز تھے، انگلیاں اسکرین پر پھسلتی رہتی تھیں۔ وہ ایک ایسی دنیا میں رہتا تھا جو سلمان نے جوانی میں صرف فلموں میں دیکھی تھی۔

ہر چیز فوری۔ ہر جواب چند سیکنڈ میں۔

"ہم خط لکھتے تھے۔" سلمان نے آہستہ سے کہا۔

"کس کو؟"

"دوستوں کو۔ کبھی کبھی رشتہ داروں کو اور جب جواب آتا تھا نا...... تو لگتا تھا جیسے عید آ گئی ہو۔"

"کتنے دن بعد آتا تھا؟"

urdunovels.com

”کبھی ایک ہفتہ، کبھی دو۔“

حمزہ کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ”دو ہفتے؟ صرف جواب کے لیے؟“

سلمان نے سر ہلایا۔ ”ہاں۔ اور انہی دو ہفتوں میں ہم بار بار اپنا لکھا ہوا خط پڑھتے رہتے تھے کہ کہیں کچھ غلط تو نہیں لکھ دیا۔“

حمزہ اب موبائل ایک طرف رکھ چکا تھا۔ سلمان کو محسوس ہوا کہ وقت تھوڑا سا پیچھے ہٹ گیا ہے۔ نا مکمل طور پر، بس اتنا کہ دونوں ایک ہی جگہ کھڑے ہو سکیں۔

”آپ کو کبھی برا نہیں لگتا؟“ حمزہ نے اچانک پوچھا۔ ”کہ اب سب کچھ بدل گیا ہے؟“

یہ سوال سید ھا دل میں لگا۔ سلمان نے صحن کی دیوار پر برقی روشنی کو دیکھا۔ ”پتا ہے...... پہلے لگتا تھا کہ شاید برا لگے گا لیکن اب نہیں۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ میں نے دونوں زمانے دیکھے ہیں۔ اور سچ بتاؤں؟ دونوں اچھے ہیں۔ بس طریقہ مختلف ہے۔“

حمزہ خاموش رہا۔ سلمان نے بات جاری رکھی۔ ”ہم کم چیزوں میں خوش ہو جاتے تھے۔ تم زیادہ چیزوں کے عادی ہو۔ ہم انتظار کرنا جانتے تھے۔ تم فوراً پا لیتے ہو۔ ہم سو برسوں سنبھال کر رکھتے تھے۔ تم روز نئی بنا لیتے ہو۔“

”تو پھر ہمارا زمانہ آسان ہے؟“ حمزہ نے پوچھا۔

سلمان ہلکا سا ہنسا۔ ”آسان؟ نہیں۔ مختلف ہے۔ ہر زمانہ اپنے مسئلے لے کر آتا ہے۔ ہمیں کمی کا مسئلہ تھا، تمہیں زیادتی کا ہے۔“

”زیادتی کا؟“

”ہاں۔ معلومات کی، آ چیزوں کی، شور کی۔ کبھی کبھی زیادہ چیزیں بھی انسان کو تھکا دیتی ہیں۔“

حمزہ کچھ سوچنے لگا۔ سلمان نے محسوس کیا کہ وہ نصیحت نہیں کرنا چاہتا۔ وہ بس بتانا چاہتا ہے۔ کوئی فیصلہ سنانا نہیں۔ کوئی زمانہ بہتر یا بد تر ثابت نہیں کرنا۔

”ابو......“ حمزہ نے آہستہ سے کہا۔ ”اگر آپ کو موقع ملے تو آپ واپس اپنے زمانے میں جانا چاہیں گے؟“

سلمان نے فوراً جواب نہیں دیا۔ وہ واقعی سوچنے لگا۔

”نہیں۔“

”کیوں؟ آپ تو کہتے ہیں وہ اچھا تھا۔“

”اچھا تھا۔ لیکن وہ میرا وقت تھا۔ یہ تمہارا وقت ہے اور میں تمہارے وقت میں رہنا چاہتا ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے سلمان کو خود بھی حیرت ہوئی۔ شاید یہ سچ وہ پہلی بار لفظوں میں ڈھال رہا تھا۔

آسمان اب گہرا نیلا ہو چکا تھا۔ پہلا ستارہ نظر آیا۔ سلمان نے انگلی سے اشارہ کیا۔ ”دیکھو، وہ ستارہ۔“

حمزہ نے اوپر دیکھا۔ ”ہم نے بھی اسکول میں پڑھا ہے اس کے بارے میں۔“

’’ہم نے بھی پڑھا تھا۔ بس فرق یہ ہے کہ تم اس کے بارے میں فوراً گوگل کر سکتے ہو۔ ہم بس اسے دیکھتے رہتے تھے۔‘‘

حمزہ ہلکا سا مسکرایا۔ ’’چلیں آج گوگل نہیں کرتے۔ بس دیکھتے ہیں۔‘‘

یہ جملہ سلمان کے دل میں کہیں نرم سا اتر گیا۔ دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ نہ ماضی جیتا، نہ حال ہارا۔ بس ایک باپ اور ایک بیٹا ایک ہی آسمان کے نیچے بیٹھے تھے۔ دو زمانوں کے درمیان ایک خاموش پل کی طرح۔

سلمان نے دل میں سوچا: شاید یہی کافی ہے۔ نہ مکمل پرانا ہونا ضروری ہے، نہ مکمل جدید۔ بس ساتھ بیٹھنا ضروری ہے۔

شام مکمل رات میں بدل گئی اور وقت، اپنی رفتار سے، آگے بڑھتا رہا۔

اگلی شام بھی تقریباً ویسی ہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ آج حمزہ خود صحن میں پہلے آ کر بیٹھ گیا تھا۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا مگر اس کی نظریں اسکرین پر جمی نہیں تھیں۔

’’ابو، آپ نے کبھی سائیکل چلائی تھی؟‘‘

سلمان نے اخبار تہہ کرتے ہوئے اسے دیکھا۔ ’’کبھی؟ بیٹا، ہماری پوری جوانی سائیکل پر گزری ہے۔‘‘

حمزہ کی آنکھوں میں دلچسپی چمکی۔ ’’آپ کی اپنی تھی؟‘‘

سلمان ہنسا۔ ’’اپنی؟ نہیں۔ پہلے تو محلے والے بشیر کی تھی۔ ہم باری باری مانگتے تھے۔ مل جائے تو لگتا تھا دنیا مل گئی۔‘‘

وہ لمحہ جیسے واپس آ گیا۔ گرمیوں کی دوپہر۔ تپتی گلی۔ ننگے پاؤں دوڑتے لڑکے اور ایک ہلکی سی نیلی سائیکل جس کی گھنٹی اکثر کام نہیں کرتی تھی۔

’’پہلی بار جب چلائی نا......‘‘ سلمان نے آہستہ سے کہنا شروع کیا۔ ’’تو سیدھا نالی میں جا گری تھی۔‘‘

حمزہ زور سے ہنسا۔ ’’واقعی؟‘‘

’’ہاں۔ گھٹنے چھل گئے تھے۔ امی نے مرہم لگاتے ہوئے ڈانٹا بھی اور پیار بھی کیا مگر اگلے دن پھر مانگ کر لے آیا۔‘‘

’’ڈرے نہیں؟‘‘

’’بہت ڈرا تھا۔ لیکن اس وقت ڈر سے زیادہ خواہش بڑی تھی۔ سیکھنا تھا۔‘‘

حمزہ کرسی سے اٹھ کر چارپائی کے قریب آ بیٹھا۔ ’’پھر اپنی سائیکل لی؟‘‘

سلمان کے چہرے پر ہلکی سی روشنی آ گئی۔ ’’میٹرک کے بعد۔ ابو نے قسطوں پر لی تھی۔ سبز رنگ کی۔ میں نے دو دن تک اسے صحن میں کھڑا دیکھ کر ہی گزار دیے۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ میری ہے۔‘‘

’’آپ نے تصویر نہیں لی؟‘‘ حمزہ نے فوراً پوچھا۔

سلمان مسکرایا۔ ’’کیمرا کہاں تھا ہر وقت؟ تصویر لینے کے لیے کسی کے پاس کیمرا ہونا ضروری تھا اور فلم ضائع ہونے کا ڈر الگ۔‘‘

’’تو پھر یاد کیسے رکھی؟‘‘

سلمان نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ’’یہاں۔‘‘

چند لمحے خاموشی رہی۔ ’’آپ نے مجھے کبھی سائیکل چلانا نہیں سکھایا......‘‘ حمزہ نے ہلکے لہجے میں کہا۔

سلمان چونکا۔ ’’تم نے خود ہی سیکھ لی تھی۔ دوستوں کے ساتھ پارک میں۔‘‘

’’ہاں...... یوٹیوب دیکھ کر بھی سیکھا تھا کہ بیلنس کیسے رکھنا ہے۔‘‘

یہ سن کر سلمان کو عجیب سا احساس ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے کو پکڑ کر دوڑایا نہیں تھا۔ اس نے پیچھے سے سیٹ نہیں تھامی تھی۔ وقت بدل گیا تھا طریقہ بھی۔

’’برا تو نہیں لگا؟‘‘ سلمان نے آہستہ سے پوچھا۔

’’کیا؟‘‘

’’کہ میں نے نہیں سکھایا؟‘‘

حمزہ نے کندھے اچکائے۔ ’’نہیں۔ آپ ساتھ تھے نا۔ بس یہی کافی تھا۔‘‘

یہ جملہ سادہ تھا، مگر سلمان کے اندر کہیں گہرائی تک اتر گیا۔ اس نے سوچا ہم سمجھتے ہیں ہم ہر چیز سکھاتے ہیں۔ لیکن شاید نئی نسل خود سیکھنے آئی ہے۔ ہم صرف گواہ ہوتے ہیں۔

’’ابو......‘‘ حمزہ نے اچانک کہا۔ ’’اگر میں آپ کی وہ سبز سائیکل دیکھوں تو شاید ہنسوں۔ وہ آج کے حساب سے پرانی لگے گی۔‘‘

’’ہاں، لگے گی۔‘‘

’’لیکن آپ کے لیے وہ نئی تھی۔‘‘

’’بالکل نئی۔‘‘

حمزہ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ’’شاید ایسے ہی ہے نا؟ جو چیز ہمارے لیے پہلی ہو، وہی خاص ہوتی ہے۔ چاہے

urdunovels.com

بعد میں..... معمول آجائے گا۔"

سلمان نے بیٹے کو غور سے دیکھا۔ یہ لڑکا صرف اسکرین میں گم رہنے والا نہیں تھا۔ یہ سوچتا بھی تھا۔

"تمہاری پہلی بڑی خوشی کیا تھی؟" سلمان نے پوچھا۔

حمزہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ "میرا پہلا اسمارٹ فون۔ جب آپ نے دلایا تھا۔"

"اس میں کیا خاص تھا؟"

"یہ کہ وہ میرا تھا۔ کسی سے مانگ کر نہیں لیا اور مجھے لگا تھا اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔"

سلمان ہلکا سا ہنسا۔ "بالکل ویسا ہی جیسے مجھے سائیکل ملنے پر لگا تھا۔"

دونوں چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ زمانے بدل گئے تھے، مگر "پہلی چیز" کا احساس نہیں بدلا تھا۔

ہوا میں خنکی بڑھنے لگی تھی۔ گلی میں کہیں سے کسی بچے کی سائیکل کی گھنٹی کی آواز آئی۔ سلمان کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ "چلو، کل اتوار ہے۔ صبح پارک چلتے ہیں۔ تم اپنی سائیکل لے جانا۔ میں بھی کسی سے مانگ لوں گا۔ دیکھتے ہیں اب بھی بیلنس رہتا ہے یا نہیں۔"

حمزہ نے حیرت سے دیکھا۔ "آپ چلائیں گے؟"

"کیوں؟ بوڑھا لگتا ہوں؟"

حمزہ ہنس پڑا۔ "نہیں..... بس تھوڑا سا۔"

سلمان نے مصنوعی ناراضی دکھائی۔ "دیکھ لینا، ابھی بھی تم سے آگے نکل جاؤں گا۔"

حمزہ نے ہاتھ بڑھا کر ہلکا سا مصافحہ کیا۔ "چیلنج قبول ہے۔"

اس لمحے سلمان نے محسوس کیا وہ مکمل پرانا نہیں رہا، کیونکہ وہ اب بھی نئی صبح کے لیے تیار تھا۔ اور مکمل جدید بھی نہیں، کیونکہ اس کے اندر سبز سائیکل والا لڑکا ابھی زندہ تھا۔

شام رات میں بدل گئی۔ موبائل پھر حمزہ کے ہاتھ میں آ گیا، مگر اس بار اس کی اسکرین پر سائیکل کے ٹرکس نہیں، بلکہ پرانی سائیکلوں کی تصاویر تھیں۔

"ابو، ایسی تھی آپ کی سائیکل؟"

سلمان نے تصویر دیکھی۔ "ہاں..... تقریباً ایسی ہی۔ میری زیادہ خوبصورت تھی۔"

حمزہ مسکرایا۔ "ہر باپ کی پہلی سائیکل سب سے خوبصورت ہوتی ہے شاید۔"

سلمان نے دل میں سوچا شاید ہر نسل اپنی پہلی خوشی کو سب سے خوبصورت سمجھتی ہے اور شاید یہی وہ جگہ ہے جہاں زمانے ملتے ہیں۔

رات گہری ہو چکی تھی مگر آج دونوں کے درمیان ایک نیا پل بن چکا تھا نہ پرانا، نہ نیا بس مشترک۔

اس رات کھانے کے بعد بجلی چلی گئی۔ کمرے میں پنکھا رک گیا اور خاموشی پھیل گئی۔ باہر گلی میں بھی اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ سلمان صحن میں آ کر بیٹھ گیا۔ حمزہ بھی موبائل ہاتھ میں لیے باہر آ گیا، مگر انٹرنیٹ نہ ہونے کی وجہ سے اسکرین بے کار سی لگ رہی تھی۔

"نیٹ بھی چلا گیا....." اس نے بیزاری سے کہا۔

سلمان ہلکا سا مسکرایا۔ "ہمارے زمانے میں تو نیٹ ہمیشہ گیا ہی رہتا تھا۔"

حمزہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ "آپ لوگ بور نہیں ہوتے تھے؟"

"ہوتے تھے، پھر بور ہوتے ہوتے ہی کچھ نیا کر لیتے تھے۔"

چند لمحے دونوں خاموش رہے۔ اندھیرے میں آسمان زیادہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"ابو....." حمزہ نے آہستہ سے پوچھا۔ "آپ نے کبھی کسی کو خط لکھا تھا؟ مطلب..... خاص والا؟"

سلمان چونکا۔ "خاص والا؟"

حمزہ ہنسا۔ "یعنی..... کسی دوست کو یا....." وہ بات ادھوری چھوڑ گیا۔

سلمان نے گہری سانس لی۔ "ہاں۔ لکھا تھا۔"

"کس کو؟"

"ایک دوست کو۔" وہ مسکرایا۔ "کلاس فیلو تھی۔"

حمزہ کی دلچسپی فوراً جاگ گئی۔ "پھر؟"

سلمان نے آسمان کی طرف دیکھا، جیسے الفاظ وہاں سے چن رہا ہو۔ "ہماری کلاس میں وہ ہمیشہ اگلی قطار میں بیٹھتی تھی۔ بہت خاموش۔ ہم نے کبھی سیدھی بات نہیں کی۔ بس کتابیں بدل لیتے تھے، کبھی کاپی ادھار لے لیتے تھے۔"

"اور آپ نے خط لکھ دیا؟"

"ہاں..... ایک دن ہمت کی۔ تین صفحے بھر دیے۔"

"تین صفحے؟" حمزہ حیران ہوا۔ "کیا لکھا تھا اتنا؟"

سلمان ہلکا سا ہنسا۔ "زیادہ کچھ نہیں۔ بس یہ کہ جب وہ ہنستی ہے تو کلاس روشن لگتی ہے۔ اور یہ کہ اگر وہ ناراض ہو تو پورا دن اداس گزر جاتا ہے۔"

urdunovels.com

حمزہ چند لمحے خاموش رہا۔ ”بھیجا کیسے؟“

”ایک دوست کے ذریعے۔ بہت ڈر لگ رہا تھا۔“

”اور جواب؟“

سلمان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ ”چار دن بعد ملا۔ صرف آدھا صفحہ تھا۔“

”کیا لکھا تھا؟“

”بس یہ کہ ’خط ملا۔ پڑھ کر ہنسی بھی آئی اور ڈر بھی لگا۔ آئندہ احتیاط سے لکھنا۔‘“

حمزہ زور سے ہنس پڑا۔ ”یہ کیسا جواب تھا!“

”ہمیں تو وہ بھی خزانہ لگا تھا۔ میں نے وہ کاغذ سالوں سنبھال کر رکھا۔“

”اب ہے؟“

سلمان نے سر ہلایا۔ ”نہیں۔ ایک دن الماری صاف کرتے ہوئے کھو گیا۔ شاید امی نے ردی میں دے دیا ہو۔“

”آپ کو دکھ ہوا؟“

”بہت۔ لگا جیسے کوئی زمانہ ختم ہو گیا۔“

حمزہ موبائل کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولا۔ ”ہم تو روز میسج کرتے ہیں۔ سینکڑوں اسکرین شاٹ لے لیتے ہیں۔ کلاؤڈ میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔“

”پھر بھی کھو جاتے ہیں۔“ سلمان نے آہستہ سے کہا۔

”کیسے؟“

”جب لوگ بدل جاتے ہیں۔“

یہ جملہ ہوا میں معلق رہ گیا۔ حمزہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”آپ دوبارہ کبھی ملے اس سے؟“

”نہیں۔ کالج ختم ہوا، سب اپنی اپنی سمت چلے گئے۔“

”تو وہ خط ہی یاد ہے؟“

”ہاں۔ اور شاید یہی کافی ہے۔“

چند لمحے دونوں اندھیرے میں بیٹھے رہے۔ بجلی ابھی تک نہیں آئی تھی۔

”ابو، اگر اس وقت موبائل ہوتا تو؟“

سلمان نے سوچا۔ ”شاید میں اتنی ہمت نہ کرتا۔ کیونکہ میسج بھیجنا آسان ہوتا۔ خط لکھنے میں وقت لگتا ہے۔ ہر لفظ سوچ کر لکھتے تھے۔“

”ہم بھی سوچتے ہیں......“ حمزہ نے ہلکا سا دفاع کیا۔

”ہاں، مگر تمہارے پاس ’ڈیلیٹ‘ کا بٹن ہے۔ ... ے پاس نہیں تھا۔ جو لکھ دیا، وہ لکھ دیا۔“

حمزہ مسکرایا۔ ”آپ رومانٹک تھے نا؟“

سلمان نے ہنستے ہوئے سر جھکا لیا۔ ”ہر نوجوان ہوتا ہے۔ بس انداز بدل جاتے ہیں۔“

اسی وقت بجلی آ گئی۔ پنکھا چلنے لگا، لائٹ جل اٹھی۔ حمزہ کے موبائل پر فوراً نوٹیفیکیشنز آنے لگے۔ وہ اسکرین کی طرف دیکھنے لگا، پھر چند سیکنڈ بعد رک گیا۔ اس نے موبائل سائیڈ پر رکھ دیا۔

”ابو...... آپ نے کبھی سوچا کہ اگر وہ خط نہ لکھتے تو؟“

”شاید کچھ نہیں بدلتا۔ مگر میں یہ نہیں جان پاتا کہ میں کہہ سکتا ہوں۔“

”کیا؟“

”کہ مجھے کوئی اچھا لگتا ہے۔“

حمزہ آہستہ سے بولا۔ ”ہم کہتے ہیں۔ بس طریقہ بدل گیا ہے۔“

سلمان نے سر ہلایا۔ ”اور یہی تو فرق ہے۔ احساس وہی ہے۔ اظہار نیا ہے۔“

حمزہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ ”اگر میں کبھی کسی کو میسج لکھوں...... خاص والا...... تو آپ کو بتاؤں؟“

سلمان نے مسکرا کر کہا۔ ”ضرور۔ بس تین صفحے مت لکھ دینا۔“

دونوں ہنس پڑے۔ سلمان نے دل میں محسوس کیا کہ زمانہ بدل گیا ہے، مگر دل کی دھڑکن کا انداز نہیں بدلا۔ پہلے کاغذ پر سیاہی پھیلتی تھی، اب اسکرین پر الفاظ چمکتے ہیں۔ مگر ہچکچاہٹ، انتظار، خوشی وہ سب ویسے ہی ہیں۔

رات گہری ہو گئی تھی۔ حمزہ کمرے کی طرف بڑھ گیا، مگر جاتے جاتے مڑا اور بولا: ”ابو...... آپ نے اچھا کیا تھا۔ خط لکھ کر۔“

سلمان نے کچھ جواب نہ دیا۔ بس ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھا۔ شاید کچھ چیزیں واقعی نہیں بدلتیں۔ بس ان کا ذریعہ بدل جاتا ہے۔

اس شام سلمان کو اچانک پرانے دنوں کی شدید یاد آئی۔ وہ اٹھا اور الماری سے ایک پرانا صندوق نکال لایا۔ دھول صاف کی، کھولا تو اندر سے زرد ہو چکے ناولوں کی مخصوص خوشبو آئی۔

حمزہ نے دلچسپی سے دیکھا۔ ”یہ کیا ہے ابو؟“

”یہ میری جوانی ہے۔“ سلمان نے آہستہ سے کہا۔

UrduNovels.com

اس نے ایک ایک کر کے ناول نکالنا شروع کیے۔ عمران سیریز، کرنل فریدی، ابن صفی، مظہر کلیم کے جاسوسی ناول، سعادت حسن منٹو کے افسانے، مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے، اور دیوتا کی جلد۔

حمزہ نے ایک ناول اٹھا کر دیکھا۔ "یہ سب آپ نے پڑھا ہے؟"

سلمان مسکرایا۔ "صرف پڑھا نہیں، جیا ہے۔"

وہ صندوق کے پاس بیٹھ گیا اور بولا۔ "انیس سو ستر کی دہائی کے وہ دن...... دوپہر کی دھوپ اینٹوں کی دیواروں پر پڑتی تھی اور ہم کالج سے واپسی پر سیدھا گھر نہیں جاتے تھے۔ ہمارا پہلا پڑاؤ ہوتا تھا محلے کی وہ چھوٹی سی دکان جس کے باہر لکڑی کا بورڈ لٹکا تھا: "ناول کرایہ پر دستیاب ہیں۔""

حمزہ نے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کرایہ پر؟ یعنی آپ ناول خریدتے نہیں تھے؟"

"ہمارے پاس اتنے پیسے کہاں تھے؟ چار آنے روزانہ کرایہ ہوتا تھا۔ اگر ناول دیر سے واپس کرو تو جرمانہ لگتا۔"

"اور آپ لوگ پڑھتے تھے؟"

"ہم دوستوں میں مقابلہ ہوتا تھا کہ کون پہلے ختم کرے گا۔ رات کو چارپائی پر لیٹ کر ٹارچ کی روشنی میں پڑھتا...... امی کی آواز آتی۔ "سو جاؤ، آنکھیں خراب ہو جائیں گی!" مگر ہمیں عمران کی شوخی اور کرنل فریدی کی سنجیدگی سونے نہیں دیتی تھی۔"

سلمان کی آنکھوں میں چمک تھی۔ "ہم صفحات پلٹتے نہیں تھے...... ہم دنیا بدلتے تھے۔ ناول صرف کہانی نہیں ہوتے تھے۔ وہ ہماری تربیت تھے۔ ہمیں زبان دیتے تھے۔ ہمیں خواب دیتے تھے۔"

حمزہ خاموشی سے سن رہا تھا۔ اس نے ایک پرانا ناول اٹھایا۔ عمران سیریز کا ایک شمارہ۔ ورق زرد تھے، مگر سرورق پر عمران کی تصویر اب بھی واضح تھی۔

"ابو، اس میں اتنا خاص کیا تھا؟ کہانی تو اب بھی ہے۔ ہم ویب سیریز دیکھ لیتے ہیں، پوڈکاسٹ سن لیتے ہیں۔ سسپنس اب بھی ہے۔"

سلمان نے آہستہ سے کہا۔ "فرق ہے۔"

"کیا فرق؟"

"جب ہم عمران سیریز پڑھتے تھے تو عمران کی ذہانت ہمارے ذہن میں خود بنتی تھی۔ جب کرنل فریدی کسی مجرم کو گھورتا تھا تو اس کی آنکھوں کی سختی ہم خود محسوس کرتے تھے۔"

حمزہ نے جواب دیا۔ "لیکن ابو، اب ہمیں سب کچھ دکھا دیا جاتا ہے۔ امیجن کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔"

سلمان نے گہری سانس لی۔ "بس یہی تو مسئلہ ہے۔"

کمرے میں چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔

"ہم جب سعادت حسن منٹو پڑھتے تھے تو ہر افسانہ اندر کہیں چبھ جاتا تھا۔ جب مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے پڑھتے تھے تو بغیر گھر سے نکلے دنیا دیکھ لیتے تھے اور جب دیوتا شروع کیا تھا تو مہینوں اسی طلسم میں بھٹکتے رہے تھے۔"

حمزہ اب سنجیدہ تھا۔ "ابو...... کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ کھو چکے ہیں؟"

سلمان نے فوراً جواب نہیں دیا۔ اس نے بیٹے کی آنکھوں میں دیکھا۔ "نہیں۔ تم نے کچھ نہیں کھویا۔ تم نے بس کچھ چکھا نہیں۔"

حمزہ نے موبائل مکمل بند کر دیا۔ "تو چکھا دیں نا ابو۔ لیکن شرط ہے...... آپ مجھے لیکچر نہیں دیں گے۔"

سلمان مسکرا دیا۔ "اور تم پڑھتے ہوئے سو نہیں جاؤ گے۔"

ٹنگسٹن

740 واں عنصر، نقطہ پگھلاؤ 3410 سینٹی گریڈ، ایک خاکستری رنگ کی بہت سخت دھات۔ یہ ولفرامائٹ، شیلائٹ (Scheelite) اور ہوبرنائٹ معدنیات کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ اسے فولاد میں ملایا جاتا ہے تاکہ وہ بہت زیادہ مضبوط بن جائے۔ یہ کاٹنے والے اوزاروں اور بجلی کے قمقموں میں بھی استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے مرکبات رنگ و روغن اور چمڑا رنگنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اسے سب سے پہلے 1781ء میں سویڈن کے سائنس دان کارل شیلے نے شیلائٹ کے خام میں سے پہچانا تھا۔ اسے 1783ء میں ہسپانوی کیمیا دان ڈیل ہوریا (1833-1755) اور اس کے بھائی یوہان جوز (1796-1754ء) نے علیحدہ کیا تھا۔

مرسلہ: زاہد خان، ٹیکسلا

"ہو بیل۔"

سلمان نے پرانے صندوق سے ایک ناول نکالا، عمران سیریز عنوان تھا ڈاکٹر بلیک۔ ورق زرد تھے مگر کہانی زندہ تھی۔ اس نے پہلا جملہ بلند آواز میں پڑھنا شروع کیا اور پہلی بار، اس کمرے میں اسکرین کی روشنی کے بجائے الفاظ کی روشنی پھیل گئی۔

سلمان نے جب پہلا باب ختم کیا تو اس نے نظر اٹھا کر حمزہ کو دیکھا۔ "کیسا لگا؟"

حمزہ خاموش تھا وہ سوچ رہا تھا یہ خاموشی بے دلی کی نہیں تھی غور کی تھی۔

"ابو......" وہ آہستہ سے بولا۔ "آپ لوگ واقعی اتنا تصور کرتے تھے؟ یعنی کردار آپ کے ذہن میں بنتے تھے؟"

سلمان مسکرایا۔ "ہم صرف پڑھتے نہیں تھے...... ہم تخلیق کرتے تھے۔"

حمزہ نے کچھ کہنا چاہا مگر رک گیا۔ پھر اچانک بولا۔ "اگر میں بھی تخلیق کر رہا ہوں تو؟"

سلمان چونکا۔ "کیا مطلب؟"

حمزہ نے موبائل اٹھایا، چند لمحے اسکرین پر انگلیاں چلائیں، پھر موبائل سلمان کے سامنے رکھ دیا۔ اسکرین پر ایک آن لائن پلیٹ فارم کھلا تھا۔ اوپر عنوان لکھا تھا: "سایہ کوڈ۔" نیچے مصنف کا نام حمزہ سلمان۔

سلمان نے پڑھنا شروع کیا۔ پہلا جملہ ہی سسپنس سے بھرا تھا۔ "جب شہر کی تمام اسکرینیں ایک ساتھ سیاہ ہو گئیں تو لوگوں کو پہلی بار اپنی خاموشی کی آواز سنائی دی......"

سلمان کے ہاتھ ہلکے سے کانپے۔ "یہ تم نے لکھا ہے؟"

حمزہ نے نظریں جھکا لیں۔ "ہاں...... چھ ماہ سے لکھ رہا ہوں۔ آن لائن پوسٹ کرتا ہوں۔ لوگ کمنٹس بھی دیتے ہیں۔"

سلمان کو جیسے کسی نے آئینہ دکھا دیا ہو۔ وہ جو سمجھ رہا تھا کہ نئی نسل مطالعے سے دور ہو چکی ہے...... اصل میں وہ صرف نئے انداز میں لکھ اور پڑھ رہی تھی۔

"تم نے بتایا کیوں نہیں؟" سلمان کی آواز میں شکوہ نہیں تھا، حیرت تھی۔

"آپ ہمیشہ کہتے تھے نا کہ اصلی ادب وہ ہوتا ہے جو کتاب کی صورت میں ہو۔ مجھے لگا آپ اسے سنجیدہ نہیں لیں گے۔"

یہ جملہ سلمان کے دل میں اتر گیا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر سلمان نے آہستہ سے کہا۔ "کہانی...... میڈیم سے بڑی ہوتی ہے۔"

حمزہ نے چونک کر دیکھا۔ سلمان نے مسکرا کر موبائل واپس کیا۔ "لیکن ایک شرط ہے۔"

"کیا؟"

"اگلا باب مجھے سنا کر لکھو گے اور میں تمہیں ایک ایسا پلاٹ دوں گا جس میں وہ سسپنس ہوگا جو ہم عمران سیریز پڑھ کر محسوس کرتے تھے۔"

حمزہ کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ "ڈیل، ابو۔"

سلمان نے محسوس کیا نسل بدلی ہے، خواب نہیں۔ ذریعہ بدلا ہے، تخلیق نہیں۔ کمرے میں اب دو زمانے آمنے سامنے نہیں تھے۔ ایک ہی میز پر ساتھ بیٹھے تھے۔

اگلے چند دن گھر میں ایک نیا معمول بن گیا تھا۔ سلمان رات کو حمزہ کا لکھا ہوا باب سنتا، کبھی خاموش رہتا، کبھی ہلکی سی اصلاح کرتا۔ حمزہ تیزی سے ٹائپ کرتا، اس کی انگلیاں جیسے کسی پوشیدہ دھن پر چل رہی ہوں۔

ایک شام حمزہ اچانک کمرے میں داخل ہوا۔ "ابو!" آواز میں گھبراہٹ اور خوشی ملی ہوئی تھی۔ سلمان نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"میری کہانی...... ٹرینڈ کر رہی ہے!"

سلمان نے عینک درست کی۔ "کیا مطلب؟"

حمزہ نے موبائل اس کے سامنے رکھا۔ "دیکھیں لاکھوں ویوز...... سینکڑوں کمنٹس۔ لوگ اگلے باب کا انتظار کر رہے ہیں۔"

سلمان نے اسکرین پر نظریں جمائیں۔ لفظ وہی تھے جو کل اس نے سنے تھے مگر اب ان کے نیچے درجنوں تبصرے تھے: "کیا زبردست سسپنس ہے!"، "اگلا باب کب آئے گا؟"، "ایسا پلاٹ پہلے نہیں پڑھا!"

سلمان کے ذہن میں اچانک وہ زمانہ ابھرا جب وہ عمران سیریز کا نیا ناول ہاتھ میں لے کر بیتاب ہو جاتا تھا۔ جب دیوتا کا اگلا حصہ ملنے تک دن گننے پڑتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا وہ دکان کے باہر انتظار کرتا تھا، یہاں لوگ اسکرین کے سامنے انتظار کر رہے تھے۔

"ابو......" حمزہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "ایک پبلشنگ پلیٹ فارم نے میسج بھیجا ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر ریڈرشپ ایسے ہی بڑھتی رہی تو وہ ای بک ڈیل دینا چاہتے

urdunovels.com

ہیں۔"

سلمان نے گہری سانس لی۔ یہ وہ لمحہ تھا جہاں وہ دو میں سے ایک راستہ اختیار کرسکتا تھا یا تو وہ اپنے ماضی کی دیوار کھڑی کر دیتا، یا حال کے دروازے کھول دیتا۔ اس نے موبائل واپس کرتے ہوئے کہا۔ "مبارک ہو۔"

حمزہ نے حیرت سے دیکھا۔ "آپ ناراض نہیں ہیں؟"

سلمان ہلکا سا مسکرایا۔ "بیٹا، ہم بھی کبھی اگلے باب کے لیے بے چین رہتے تھے۔ بس ہمارا انتظار کاغذ پر تھا، تمہارا ڈیجیٹل ہے۔ بے چینی وہی ہے۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔ "لیکن ایک بات یاد رکھنا۔" سلمان نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "وائرل ہونا کامیابی نہیں۔ کہانی کا سچا رہنا کامیابی ہے۔ کہانی صرف چونکانے کے لیے نہ ہو، سوچنے پر مجبور کرنے کے لیے ہو۔"

حمزہ نے سر ہلایا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں۔"

اسی رات سلمان نے پہلی بار خود موبائل ہاتھ میں لے کر بیٹے کی کہانی دوبارہ پڑھی۔ بطور نقاد نہیں، بطور قاری اور اسے محسوس ہوا...... کہانی زندہ ہے۔ بس لباس بدل چکا ہے۔

کچھ دن بعد ایک اور شام تھی۔ باہر ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ سلمان نے پرانا کیسٹ پلیئر نکالا تھا جو برسوں سے بند پڑا تھا۔

حمزہ نے حیرت سے دیکھا۔ "یہ کیا ہے ابو؟"

"کیسٹ پلیئر۔" سلمان نے اسے صاف کیا۔ "ہمارے زمانے میں گانے اسی میں سنتے تھے۔"

حمزہ قریب آیا۔ "یہ کیسے چلتا ہے؟"

سلمان نے اسے سمجھایا۔ "اس میں یہ کیسٹ ڈالتے ہیں پھر یہ بٹن دباتے ہیں اور اگر ریل الجھ جائے تو پنسل ڈال کر سیدھا کرنا پڑتا تھا۔"

حمزہ ہنسا۔ "اتنا مشکل؟"

"مشکل میں ہی مزہ تھا۔" سلمان نے کیسٹ پلیئر آن کیا۔ نصرت فتح علی خان کی آواز کمرے میں گونجی۔

دونوں خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ حمزہ کی آنکھیں بند تھیں۔ جب گانا ختم ہوا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ "یہ آواز...... دل میں اتر گئی۔"

سلمان مسکرایا۔ "ہم نصرت فتح علی خان کو سنتے تھے تو کمرا وجد میں آ جاتا تھا۔ عابدہ پروین کی آواز جیسے روح کے اندر اترتی تھی۔ پھر غلام علی، مہدی حسن، نور جہاں ہر ایک کی

انطاکیہ (Antioch)

جنوبی ترکی میں صوبہ ہاتے (Hatay) کا ایک شہر مقام۔ اس کی بنیاد 300ق م میں سکندر اعظم کے ایک جرنیل سیلوکس نے رکھی اور عرصہ دراز تک شام کے سلجوقی بادشاہوں کا دارالحکومت رہا۔ قدیم زمانے میں یہ شہر ہندوستان اور یونان کی تجارت اور یونانی تہذیب کا اہم مرکز تھا اور اپنی شان و شوکت کے لحاظ سے اسے ملکۂ مشرق کہا جاتا تھا۔ رومن عہد حکومت میں یہ شہر عیسائیت کا مرکز بنا رہا اور اس زمانے میں یہاں عیسائیوں کی تین بڑی مجلسیں منعقد ہوئیں۔ 526ء میں زلزلے میں تباہ ہوا تو اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ 637ء میں اسے عربوں نے فتح کیا۔ 1268ء میں مصر کے سلجوقیوں کے زوال کے ساتھ انطاکیہ کا زوال آنا شروع ہو گیا۔ 1516ء میں اس پر عثمانی ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔ 1919ء میں فرانسیسی فوجوں نے قبضہ کرلیا اور شام کے ساتھ فرانسیسی انتداب میں شامل کر دیا گیا۔ 1939ء میں ترکوں کو واپس دے دیا گیا۔ یہ شہر متواتر زلزلوں کے باعث تباہ ہوتا رہا۔ 1872ء میں جو زلزلہ آیا وہ بہت تباہ کن تھا۔ 1935ء میں قدیم انطاکیہ کی کھدائی شروع ہوئی جس میں بڑی نادر اشیاء نکلیں۔ تمباکو، غلہ، روئی اور ریشم کی تجارت کے لیے مشہور ہے۔

مرسلہ: زرین مصطفی۔ ایبٹ آباد

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

اردو، پنجابی، شاعر، افسانہ نگار، نقاد اور محقق۔ وہ فیصل آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ 1976ء میں ایم اے اردو، 1978ء میں ایم اے پنجابی کے امتحانات پاس کیے اور 1986ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ ابتداء میں اکادمی ادبیات پاکستان اور پھر مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد میں ملازمت اختیار کرلی۔ اس کے ساتھ ساتھ لکھنے لکھانے کا شغل بھی جاری رکھا۔ تصانیف میں اجو کی کہانی (چھ کہانیوں کا مجموعہ)، پنجابی ڈراما پر کہاں۔ بہت مشہور ہے۔ اجو کی کہانی بی اے کے نصاب میں شامل ہے۔ پر کہاں پر انہیں پاکستان رائٹرز گلڈ انعام ملا۔ روزنامہ نوائے وقت میں گاہے گاہے کالم بھی لکھتے ہیں۔

مرسلہ: آمنہ بخاری۔ ملتان

اپنی دنیا تھی۔"

"اور فلمیں؟" حمزہ نے پوچھا۔

سلمان کی آنکھوں میں شرارت آ گئی۔ "کالج کے دنوں میں ہم گھر بتائے بغیر سینما چلے جاتے تھے۔"

حمزہ چونکا۔ "ابو!"

"ہاں بھئی! ٹکٹ سستی ہوتی تھی۔ بالکنی کا الگ مزہ۔ پنکھا چل رہا ہے، اسکرین پر ہیرو انٹری لے رہا ہے...... اور ہم سیٹیاں بجا رہے ہوتے تھے۔"

"دادی کو پتا چل جاتا تو؟"

"تو ایک ہفتہ گھر سے نکلنا بند!"

دونوں زور سے ہنس پڑے۔

سلمان نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ "اور ٹی وی ڈرامے...... ایک قسط ہفتے میں آتی تھی۔ پورا ہفتہ انتظار رہتا تھا۔"

حمزہ نے موبائل اٹھایا۔ "یہ سب یوٹیوب پر ہوں گے شاید۔"

سلمان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ہمارے وقت میں یوٹیوب نہیں تھا۔ اگر قسط مس ہو گئی تو بس مس ہو گئی۔"

"ری کیپ نہیں؟"

"نہیں۔ اگلے ہفتے خود اندازہ لگاتے تھے کہ کیا ہوا ہوگا۔"

کمرے میں ایک نرم سی خاموشی اتر آئی۔ حمزہ نے آہستہ سے کہا۔ "ابو...... آپ لوگوں کے پاس چیزیں کم تھیں، مگر انتظار زیادہ تھا۔"

سلمان نے اس کی طرف دیکھا۔ "اور تم لوگوں کے پاس سب کچھ فوراً ہے، مگر شاید انتظار نہیں۔"

حمزہ نے سر ہلایا۔ "شاید اس لیے ہم جلدی بور بھی ہو جاتے ہیں۔"

سلمان نے مسکرا کر کہا۔ "اصل لطف انتظار میں تھا۔ چاہے ناول ہو، ڈراما ہو یا گانا۔"

حمزہ نے اچانک کہا۔ "ابو، ایک کام کرتے ہیں۔ اس ہفتے ہم ایک پرانا ڈراما ساتھ دیکھتے ہیں، قسط پر قسط۔ اور میں آپ کو اپنی پلے لسٹ سناؤں گا۔"

سلمان نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ "ڈیل۔"

اور یوں، کیسٹ اور اسٹریمنگ...... سینما اور نیٹ فلکس...... انتظار اور انسٹنٹ کلک...... ایک ہی صوفے پر آ بیٹھے۔

شام اتر آئی تھی۔

پرانے گانوں کی بات چل رہی تھی کہ اچانک حمزہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ابو، سچ بتائیں...... کیا آپ نے بھی امتحان چھوڑ کر فلم دیکھی ہے؟"

سلمان نے پہلے تو سنجیدگی اختیار کی، پھر ہنسی روک نہ سکا۔ "ایک بار......"

"اوہ! اسٹوری ٹائم!" حمزہ نے موبائل سائیڈ پر رکھ دیا۔

سلمان کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ "فرسٹ ایئر کے پیپر چل رہے تھے۔ اگلے دن اہم پرچہ تھا۔ اسی دوران شہر کے سینما میں شاہد اور رانی کی فلم 'ثریا بھوپالی' لگی ہوئی تھی۔ ریڈیو پر اس کے گانے کانوں میں رس گھولتے تھے۔"

حمزہ نے فوراً کہا۔ "اور آپ چلے گئے؟"

"دوستوں نے بہت اکسایا۔ کہا: بس میٹنی شو دیکھ کر آ جاتے ہیں، شام تک پڑھ لیں گے۔"

"کلاسک بہانہ!" حمزہ ہنسا۔

"ہم چلے گئے۔ دل دھڑک رہا تھا، مگر فلم شروع ہوئی تو سب بھول گئے۔ گانے، کہانی، ہیرو کی انٹری...... اس وقت لگا دنیا کی سب سے اہم چیز یہی ہے۔"

"اور پھر؟"

سلمان کے چہرے پر ہلکی سی سنجیدگی آ گئی۔ "گھر پہنچا تو ابو دروازے پر کھڑے تھے۔ کسی جاننے والے نے سینما میں دیکھ لیا تھا۔"

حمزہ نے آنکھیں پھیلا دیں۔ "پھر تو......؟"

"پھر وہی ہوا جو اس زمانے میں ہوتا تھا۔ خوب ڈانٹ پڑی۔ مار بھی پڑی۔"

کمرے میں لمحہ بھر خاموشی چھا گئی۔ حمزہ نے آہستہ سے پوچھا۔ "اتنی سی بات پر؟"

سلمان نے دھیرے سے کہا۔ "اس وقت والدین سمجھتے تھے کہ سختی ہی سیدھا رکھتی ہے۔ محبت تھی...... مگر اظہار کا انداز سخت تھا۔"

"آپ کو برا لگا تھا؟"

سلمان نے چند لمحے سوچا۔ "ہاں، لگا تھا مگر اس مار سے زیادہ شرمندگی نے تکلیف دی تھی کیونکہ میں نے خود کو دھوکا دیا تھا پیپر کے دن فلم دیکھ کر۔"

حمزہ گہری سوچ میں چلا گیا۔ "ابو، اب تو والدین اتنا

نہیں مارتے۔"
"زمانہ بدل گیا ہے۔ اب بات چیت زیادہ ہے، ہاتھ کم اٹھتے ہیں اور یہ بہتر ہے۔"
حمزہ نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اگر میں پیپر چھوڑ کر فلم دیکھنے چلا جاؤں تو؟"
سلمان نے آنکھوں میں شرارت لاتے ہوئے کہا۔
"مار تو نہیں پڑے گی...... مگر موبائل ضبط ہو جائے گا۔"
دونوں ہنس پڑے۔ سلمان نے سنجیدگی سے اضافہ کیا۔ "بیٹا، بات مار کی نہیں تھی۔ بات ذمہ داری کی تھی۔ ہم غلطی کرتے تھے تو سزا ملتی تھی۔ آج تم سے بات کی جاتی ہے۔ شاید یہی ترقی ہے۔"
حمزہ نے سر ہلایا۔ "لیکن ابو...... آپ کی اس فلم والی ہمت اچھی تھی۔"
"ہمت نہیں تھی، بے وقوفی تھی۔"
کمرے میں پھر ہنسی گونج اٹھی۔ مگر سلمان کے دل میں ایک نرم سا احساس تھا۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ سختی کم ہوئی ہے مگر احترام، ذمہ داری اور محبت باقی رہے تو نسلیں ایک دوسرے کو سمجھ سکتی ہیں۔
ایک دن سلمان نے حمزہ سے کہا۔ "چلو، تمہیں ایک جگہ لے کر چلتا ہوں۔"
وہ دونوں پرانی گلی میں پہنچے۔ وہی گلی...... وہی موڑ...... مگر اب وہاں کتابوں کی وہ چھوٹی سی دکان نہیں تھی جہاں سے وہ کرائے پر ناول لایا کرتا تھا۔
حمزہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ "یہاں کیا ہے ابو؟"
سلمان نے خالی جگہ کو دیکھا۔ "یہاں وہ دکان تھی جہاں سے میں ناول کرائے پر لاتا تھا۔"
دکان کی جگہ اب ایک موبائل ریپئرنگ دکان تھی۔ باہر نوجوانوں کا ہجوم تھا۔ کانوں میں ایئر بڈز، ہاتھ میں اسمارٹ فون۔
سلمان نے ایک لڑکے سے پوچھا۔ "بیٹا، عمران سیریز پڑھی ہے کبھی؟"
لڑکے نے حیرت سے دیکھا۔ "وہ کیا ہوتا ہے؟ گیم ہے کیا؟"
سلمان کے اندر کچھ ٹوٹا، مگر اس بار اس نے اس ٹوٹنے کو مختلف انداز میں لیا۔
وہ حمزہ کی طرف مڑا۔ "تم جانتے ہو میں نے سوچا تھا کہ کتابیں مر گئیں، مگر شاید وہ صرف تبدیل ہو گئی ہیں۔"
حمزہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
سلمان نے بات جاری رکھی۔ "آج کی نسل ذہین ہے۔ ٹیکنالوجی جانتی ہے۔ دنیا ان کی انگلیوں پر ہے مگر شاید کتاب کی خوشبو سے ناواقف ہے۔ وہ اسکرول کرتی ہے...... ہم ورق پلٹتے تھے۔ وہ شارٹ ویڈیو دیکھتی ہے...... ہم چار سو صفحات پڑھتے تھے۔"
"تو پھر؟" حمزہ نے پوچھا۔
"تو پھر شاید ہمیں شکایت نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں پل بننا چاہیے۔ اگر آج کا نوجوان موبائل پر ہے تو کیوں نہ عمران سیریز کا ذکر ہم پوڈکاسٹ میں کریں؟ کیوں نہ منٹو کے افسانے آڈیو بک میں سنائیں؟ کیوں نہ تارڑ کے سفرنامے وی لاگ میں ڈھال دیں؟"
حمزہ نے حیرت سے دیکھا۔ "ابو، آپ تو وی لاگ کی بات کر رہے ہیں؟"
سلمان مسکرایا۔ "زمانہ بدلا ہے بیٹا مگر کہانیاں نہیں بدلتیں۔ کہانی آج بھی زندہ ہے۔ صرف میڈیم بدل گیا ہے۔"
وہ واپس گھر آئے تو سلمان نے پرانا صندوق کھولا۔ اس نے ایک ایک ناول نکالا اور حمزہ کو دینے لگا۔
"یہ لو، یہ عمران سیریز ہے۔ یہ کرنل فریدی۔ یہ دیوتا۔ تم انہیں پڑھو اور جو تم نے سیکھا، اسے اپنی کہانیوں میں ڈھالو۔"
حمزہ نے ناول سنبھالے۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ "ابو، یہ سب میں پڑھوں گا اور ہاں...... میں ان پر ایک ویب سیریز بھی لکھ سکتا ہوں۔"
سلمان نے فخر سے دیکھا۔ "یہی تو میں کہہ رہا تھا۔ کہانی زندہ ہے۔ بس لباس بدل رہا ہے۔"
اس رات بارش ہو رہی تھی۔ کھڑکی کے باہر پانی کی بوندیں جیسے دو مختلف لہروں کی طرح ٹکرا کر ایک ہو رہی تھیں۔
سلمان صوفے پر بیٹھا تھا اور حمزہ لیپ ٹاپ سامنے رکھے کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔
"کیا لکھ رہے ہو؟" سلمان نے پوچھا۔
"آج کی قسط کا اختتام...... لیکن آپ سنیں گے تو بتاؤں گا۔"
سلمان قریب آ کر بیٹھ گیا۔ حمزہ نے پڑھنا شروع کیا:
"بوڑھا آدمی اپنے بیٹے کو بتاتا ہے کہ کبھی ایک زمانہ تھا جب لوگ کہانی کا انتظار کرتے تھے اور نوجوان جواب دیتا ہے کہ اب لوگ کہانی کو خود بنا لیتے ہیں......"

urdunovels.com

سلمان خاموشی سے سنتا رہا۔

"یہ میں اور آپ ہیں نا؟" سلمان نے مسکرا کر کہا۔

حمزہ نے نظریں ملائیں۔ "ہاں...... مگر انجام مختلف ہوگا۔"

"کیسا؟"

"آخر میں دونوں مل کر ایک کہانی لکھیں گے آدھی ہاتھ سے، آدھی کی بورڈ سے۔"

سلمان کے دل میں ہلکی سی نمی اتر آئی۔

"ہم دو دریا ہیں نا ابو؟" حمزہ نے کہا۔ "آپ کا زمانہ اور میرا زمانہ۔"

سلمان نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بارش کی دو دھاریں ایک نالی میں مل کر ایک ہی بہاؤ بن چکی تھیں۔

"دریا جب ملتے ہیں تو اپنا رنگ نہیں کھوتے۔" سلمان نے آہستہ سے کہا۔ "بس وسعت بڑھ جاتی ہے۔"

اسی لمحے سلمان نے پرانے صندوق سے ایک زرد ورق نکالا وہی پرانا ناول۔ اور حمزہ نے لیپ ٹاپ پر نئی فائل کھولی۔ ورق اور اسکرین ایک میز پر ساتھ رکھے تھے۔

یہی سنگم تھا۔

چند ماہ بعد......

حمزہ کی آن لائن کہانی ای بک بن چکی تھی۔ پیش لفظ کس نے لکھا تھا؟ سلمان نے۔

پیش لفظ میں لکھا تھا:

"میں اس نسل سے ہوں جس نے عمران سیریز کے صفحات پلٹے، دیوتا کے حصے تلاش کیے، ٹی وی پر الفا براوو چارلی کی قسط کا انتظار کیا، اور سینما میں چھپ کر فلمیں دیکھیں۔ میرا بیٹا اس نسل سے ہے جو اسکرین پر لکھتی ہے، فوراً شائع کرتی ہے، اور دنیا سے براہِ راست مکالمہ کرتی ہے۔ ہم مختلف نہیں، ہم تسلسل ہیں۔"

کتاب کی لانچ پر سلمان اور حمزہ ایک ساتھ کھڑے تھے۔ ایک صحافی نے سوال کیا: "آپ کو نہیں لگتا نئی نسل پرانی روایات سے دور ہوگئی ہے؟"

سلمان نے مسکرا کر جواب دیا۔ "روایات دریا کی طرح ہوتی ہیں۔ اگر بہنا چھوڑ دیں تو تالاب بن جاتی ہیں۔ میری نسل نے بہاؤ شروع کیا تھا۔ ان کی نسل نے اسے رفتار دی ہے۔"

گھر واپس آکر دونوں صوفے پر بیٹھے۔ ٹی وی پر پرانا ڈراما چل رہا تھا۔ لیپ ٹاپ پر نئی کہانی کا خاکہ کھلا تھا۔

سلمان نے آہستہ سے کہا۔ "دیکھا؟ مار سے زیادہ بات اثر کرتی ہے۔ سختی سے زیادہ اعتماد۔"

حمزہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "اور انتظار سے زیادہ مزہ اشتراک میں ہے۔"

کھڑکی کے باہر شام اتر رہی تھی، بالکل ویسی ہی شام جیسی کہانی کے آغاز میں تھی مگر اب دو زمانے متوازی نہیں تھے۔ وہ ایک ہی دریا بن چکے تھے۔

سلمان نے سوچا شاید یہی کافی ہے۔ نہ مکمل پرانا ہونا ضروری ہے، نہ مکمل جدید۔ بس ساتھ بیٹھنا ضروری ہے۔

اور وہ ساتھ تھے۔

شام مکمل رات میں بدل گئی اور وقت اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔

مگر اب اس رفتار میں دو نسلیں ایک ساتھ تھیں۔

سلمان کے ہاتھ میں اب بھی وہی پرانا ناول تھا اور حمزہ کی انگلیاں اب بھی کی بورڈ پر تھیں مگر فرق صرف اتنا تھا کہ اب وہ ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔

کمرے کی روشنی میں دونوں بیٹھے تھے۔ باپ کہانی سنا رہا تھا، بیٹا اسے نئے انداز میں لکھ رہا تھا اور اس طرح، ورق اور اسکرین، ماضی اور حال، پرانا اور نیا سب ایک ہو گئے تھے۔

کیونکہ آخر میں، کہانی ہی اہم ہوتی ہے۔
اور کہانیاں کبھی نہیں مرتیں۔
بس ان کا رنگ بدلتا ہے۔
ان کا لبادہ بدلتا ہے۔
ان کا انداز بدلتا ہے۔
مگر کہانی زندہ رہتی ہے۔
جیسے یہ کہانی
ایک باپ اور بیٹے کی۔
دو نسلوں کی۔
دو زمانوں کی۔
اور شاید اسی لیے۔
ہر شام ایک نئی شام ہوتی ہے۔
ہر زمانہ اپنے ساتھ کچھ نیا لاتا ہے۔
مگر جب دو زمانے ملتے ہیں۔
تو ایک نیا زمانہ بنتا ہے۔
اور وہی اصل کہانی ہے۔

urdunovels.com